

شہرِ دل

زمزم پبلشرز



پیش لفظ

”شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے“
 ”تمام تر لازوال، بے مثال تعریفوں کے لائق ہے وہ پاک ذات جو تمام جہانوں کی خالق و مالک ہے۔“
 پھول ہی پھول ہیں تاحد نظر
 آتش، آسمانی، گلابی، کاسنی، چمپی، ارغوانی
 کتنے مشتاق ہاتھوں نے
 کتنی یاسمیں، یاسمیں انگلیوں نے
 اس طرح سے سجایا سنوارا انہیں
 اور پھر اہل نظر اور تسمین چشم نگاراں ملی
 یہ نہ سوچا کسی نے کہ شاخ نے گل سے ٹوٹ کر
 حسن کے اس سفر میں
 کس طرح کی اذیت اٹھائی
 ہم کہ جو لکھنے والے ہیں نوکِ قلم سے
 فکر کے پھول مہکا رہے ہیں
 اپنی سوچوں کی تابندگی سے عارضِ وقت چکا رہے ہیں
 ایک وقت ایسا بھی آ رہا ہے جبکہ دیوان اپنے
 آبنوس اور مرمر کے شلفوں میں
 پتھر کی مانند جج جائیں گے
 یاسمیں، یاسمیں، انگلیاں شعر کے لمس سے بے خبر
 ان کی ترتیب دیں گی
 کتنی زگی زگی آنکھیں
 حسن ترتیب کی داد دیں گی
 اس حقیقت سے نا آشنا
 حسن تخلیق کے اس سفر میں
 ہم نے کیسی اذیت اٹھائی ہے روز و شب

مسلل روکتی ہوں اس کو شہرِ دل میں آنے سے
 مگر وہ کوہ کن رکتا نہیں دیوار ڈھانے سے

بھلا کیا دکھ کے آنگن میں سلگتی لڑکیاں جاتیں
 کہاں چھپتے ہیں آنسو آنکھوں میں منہ چھپانے سے

تجھے تنہا محبت کا یہ دریا پار کرنا ہے
 ندامت ہوگی اس کے حوصلوں کو آزمانے سے

ابھی تو عشق میں آنکھیں بھی ہیں دل سلامت ہے
 زمین بانجھ ہوتی ہے کبھی فصلیں جلانے سے

تجھے بھی ضبطِ غم کے شوق نے پتھر بنا ڈالا
 تجھے اے دل بہت روکا تھا رسم و راہ نبھانے سے

تیرگی کی بدگماں دہلیز پر
خورشید کی صورت اُترنا تھا
ابھی تو میری تحریروں کو
تازہ روشنی بن کر نکھرنا تھا
مگر میں کیا کروں کہ موسم جاں کو
ہنرمندی کے لمحے کم میسر تھے۔

تفنگی کا یہ عالم ہے، مجھے میری کچھ فرینڈز نے جنونی رائٹر کا ٹائٹل بھی دیا ہے، جو شاید اتنا غلط بھی نہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ میرے لئے دُعا کیجئے گا کہ خدا میرے قلم کو باوقار نکھار بخشے، آمین! کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں میری کتابوں کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے بعد ادارہ علم و عرفان پبلشرز نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

اُم مریم

☆☆☆

ڈیر قارئین!

آپ کی خدمت میں اپنی ایک اور کاوش ”عہدِ دل“ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ اُمید کرتی ہوں اپنے رب کریم سے کہ پہلے کی طرح یہاں بھی میری تحریر کو پذیرائی، چاہت اور پسندیدگی سے نوازے گا، اور کسی مصنف کو اس سے بڑھ کر اور کچھ چاہئے بھی نہیں ہوتا کہ اس کی تحریر کو یہ احساس مل جائے۔ اور الحمد للہ الحمد للہ ”تیری چاہ میں تیری راہ میں“ کے بعد ”میرے ساحر سے کہو“ کی بے پناہ پذیرائی یہ مجھ تک آپ کے احساسات پہنچتے رہے ہیں۔ الحمد للہ آپ میری کوئی تحریر معیار کے لحاظ سے پہلی سے کمتر نہیں پائیں گے۔

”شہرِ دل“ کے بارے میں صرف یہ کہوں گی کہ اس میں آپ کی دلچسپی اس لئے بھی بڑھے گی کہ یہ ناول کسی ڈائجسٹ میں شائع کرائے بغیر بک کی صورت شائع ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو محبت کو کھونے سے خائف ہے۔ یہ تحریر بھی محبت کے خاص اہم اور حساس موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ایسی کیفیات کے بیچ جب میرا دل اس احساس کے ساتھ ملول تھا کہ دُنیا سے محبت اٹھتی جا رہی ہے جو کہ نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں محبت کا زمین سے اٹھنا، رب کی رحمت کا اٹھنا ہے۔ محبت رب کی رحمت کا ہی ایک خوب صورت روپ ہے۔ کسی بھی رنگ میں ہو، کسی بھی انداز کے ساتھ، یہ ہمیشہ خاص، پیاری اور اہم ہوتی ہے۔ اس لئے اسے خود سے چھڑنے مت دیں۔ بس یہی میرا پیغام ہے۔

مجھے لکھتے ہوئے پانچ سال ہونے والے ہیں اور ان پانچ سالوں میں، میں نے بے تحاشہ اور بہت لکھا ہے مگر تفنگی کا عالم یہ ہے کہ جیسے ابھی کچھ بھی نہیں لکھا۔

بقول شاعر۔

بہت کچھ اور لکھنے کی تمنائیں تھی

مگر میں کیا کروں کہ موسم جاں کو

ہنرمندی کے لمحے کم میسر تھے

ابھی میں نے قلم پکڑا تھا ہاتھوں میں

ابھی تو پیاس بھی قریطاس کی بجھنے نہ پائی تھی

ابھی لفظوں کو میرے آئینہ پوشاک ہو کر

ہوا ایک کھانے میں مشغول ہو گئی تھی۔

پاپا کی سمت آنے کی بجائے گاڑی سے نکل کر سیدھے اپنے بیڈروم میں چلے گئے تھے۔ یہ کوئی ایسی چونکا دینے والی بات تو نہیں تھی۔ کم از کم اس کے لئے مگر ماضی پریشان ہوئی تھیں جیسی اپنا چائے مانگ چھوڑ کر خود بھی ان کے پیچھے چلی گئی تھیں۔

”مجھے لگتا ہے کوئی پرابلم ہے.....؟“

فضہ نے اٹھ کر اس کے سر سے ہیڈ سیٹ اتار کر رکھتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ ایمان نے غلطی سے اسے دیکھا اور نفرت سے سر جھٹک دیا تھا۔

”تم پاکستانی عوام ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا کرو۔ ہر بات میں تشویش، ہر بات میں گھبراہٹ.....؟“ وہ فطرتاً بے نیاز تھی اور کچھ بے حس بھی۔ یہ دوسرا خالصتاً فضا کا خیال تھا۔ فضا کے ساتھ ماما بھی کچھ دنوں سے پاپا کو پریشان محسوس کر رہی تھیں مگر ماما کے کریدنے پر بھی انہوں نے کچھ بتا کر نہیں دیا تھا، سوائے اس کے کہ آفیشل پرابلم ہے۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے بہت پریشان تھے اور اپنا اضطراب ظاہر کرنے سے گریزاں تھے۔ مگر یہ بھی صحیح تھا کہ ان کی پریشانی ان کی ہر ادا سے پھلتی تھی۔ وہ راتوں کو سوچیں پال رہے تھے۔ ناشتہ کھانا معمول سے نہیں ہو کر رہ گیا تھا۔ کم کم اپنی سوچوں میں کھوئے ہوئے۔ کوئی ان سے بات کرتا تو وہ بڑبڑاتے۔ غرض وہ پریشان تھے اور پریشانی کی نوعیت بہت سنگین تھی۔ یہ اندازہ ان کو کھنے والا باسانی لگا سکتا تھا۔

”میں دیکھوں اندر جا کے.....؟ شاید پاپا کی طبیعت ٹھیک نہ ہو.....؟“

فضہ کی بے چینی عروج پہ جا پہنچی۔ ایمان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

”ماما کے آنے کا تو انتظار کرو۔ صبر تو تم میں ہے ہی نہیں۔“

وہ اطمینان سے کہا بوں سے انصاف کر رہی تھی۔ فضا گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔ مگر جب خاصی دیر تک ماما بھی باہر نہیں آئیں تو فضا کا ضبط جواب دینے لگا۔ وہ اٹھی تھی اور آہستگی سے چلتی اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ ایمان کی پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ ایمان کو اس کی اس بے اعتنائی پر غصہ سا آیا تھا مگر کاندھے اچکا کر وہ اپنے گود میں رکھے سیل فون کی سمت متوجہ ہو گئی جس پر اس کی فریڈ نیہاں کا منبج آ رہا تھا۔ یہاں اس سے کل کالج آنے یا نہ آنے کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ وہ اسے جواب لکھنے بیٹھ گئی۔

”میں نہیں آؤں گی تم بھی مت جانا۔“

”کیوں.....؟ کل تم ڈولی چڑھ رہی ہو کیا.....؟ آرام سے چلی آؤ ورنہ اغواء کروالوں گی۔“

یہاں نے اگلے ہی لمحے پھر لٹاؤ بھرا منبج بھیج دیا۔ وہ پڑھ کر مسکرانے لگی۔

”بے چین روح ہو تم.....! بہر حال ڈولی نہ بھی چڑھنا ہو، میں نہیں آ رہی۔ ہمیں ایگزیم کی تیاری کے لئے کہا گیا ہے، پھر کالج جا کے جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے.....؟“

”اور گھر پہ میوزک سن کر، موویز دیکھ کر مردوں سے شرط باندھ کر سو کر تم جتنی پڑھائی کر رہی ہو۔ مجھے سب پتا ہے۔“

یہاں نے اسے کال کر لی تھی اور اب برس رہی تھی۔ وہ جوابا ہنسنے لگی۔

شہر دل

ہوا تھی تھی ضرور لیکن

وہ شام جیسے سک رہی تھی

کہ زرد پتوں کو آندھیوں نے

عجیب قصہ سنا دیا تھا

کہ جس کو سن کے تمام بچے

سک رہے تھے، بلک رہے تھے

جانے کس سانچے کے غم میں

شجر جڑوں سے اکھڑ رہے تھے

بہت تلاشا تھا ہم نے تم کو

ہر ایک وادی، ہر ایک رستہ

کہیں سے تیری خبر نہ آئی

تو یہ کہہ کے ہم نے دل کو ٹالا

ہوا تھی گی تو دیکھ لیں گے

ہم اس کے رستے کو ڈھونڈ لیں گے

مگر ہماری یہ خوش خیالی

جو ہم کو برباد کر گئی تھی

ہوا تھی تھی ضرور لیکن

بڑی ہی مدت گزر گئی تھی

سر سبز لان میں موجود درختوں کے پار سورج دھیرے دھیرے غروب ہو رہا تھا۔ ایک اور دن تمام تر مصروفیات الجھنوں سمیت پردہ مغرب میں ڈھلنے جا رہا تھا۔ اس کے اندر بھی رخصت ہوتی اسی شام میں ویرانی پنچے گاڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ کل شام جب وہ لان میں کین کی کرسی پر بیٹھی ہیڈ سٹ کانوں پر چڑھا کر میوزک انجوائے کر رہی تھی، پاپا کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے سرسری سے نگاہ ڈالی اور فضا کا بیک کیا

”تمہیں تو پتا ہے تھوڑا بہت پڑھ کر بھی ٹاپ کر لیتی ہوں، تمہاری طرح کوڑھ مغز نہیں ہوں۔“

”ہکومت.....! مجھے اشعر سے ملنا ہے۔ بس تم آرہی ہو۔“

نیہاں کے لہجے میں دھونس بھری تڑی تھی وہ چلبلا اٹھی۔

پھر تو ہرگز نہیں آؤں گی۔ سخت زہر لگتا ہے مجھے تمہارا وہ مائیکل جیکسن.....؟“

اسے سوکھا سڑا، ہالس سا اشعر، ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، مگر نیہاں اس سے زیادہ اس کی شاعری پر رتج

گئی تھی۔ اشعر کا دعویٰ تھا وہ آنے والے وقتوں میں بہت بڑا شاعر بننے والا ہے۔

”ہکو اس مت کرو.....! خبردار جو اسے کچھ کہا ہو تو.....؟“

نیہاں حسب توقع بھڑک اٹھی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی اسے چڑا کر ایمان کو ہمیشہ ہی بہت لطف آیا

کرنا تھا۔

”اگر تمہاری یہ فضول گوئی ختم ہوگئی ہو تو میری بھی سن لو.....!“

فضہ تقریباً پچھلے پانچ منٹ سے اس کے سامنے کھڑی گویا اس کی توجہ کی منتظر تھی۔ بالآخر تلخی سے

سہلجی۔ ایمان نے ایک نگاہ غلط انداز سے ڈالی اور گفتگو کو سمیٹنے کی غرض سے بولی تھی۔

”او کے نیہاں.....! میں چلوں گی تمہارے ساتھ کل کالج، کیا یاد کرو گی.....؟ کس سخی سے پالا پڑا ہے۔“

انداز احسان جتلانے والا تھا۔ نیہاں کھی کھی کرنے لگی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے کل کالج جانے کی.....؟“

فضہ نے اسے سیل فون ٹیبل پر رکھتے دیکھ کر کسی قدر تلخی سے کہا تو ایمان نے چونک کر اس کی صورت

دیکھی جہاں خفگی کے ساتھ تلخی و پریشانی کا عکس بھی بہت واضح تھا۔

”غصہ کس بات پہ آ رہا ہے.....؟ ماما نے ڈانٹ تو نہیں دیا.....؟ میں نے منع بھی کیا تھا۔ انتہائی غیر

معقول حرکت کی مرتکب ہوئی ہو، میاں بیوی کی پرسنل گفتگو کو سننے کی کوشش میں.....؟“

وہ اس غیر سنجیدگی سمیت مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے شرارتی انداز میں کہہ رہی تھی۔ فضہ نے بہت

جھلاہٹ آمیز نظروں اسے گھورا تھا۔

”فارگا ڈسک.....! ایمان.....! کبھی تو سنجیدہ بھی ہو جایا کرو۔“

اس نے جیسے ماتھا پیٹ لیا تھا۔ ایمان نے منہ بنا لیا۔

”کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے آخر.....؟ کچھ بتاؤ بھی.....؟“

”پہاڑ تو واقعی ہی ٹوٹا ہے۔ اب جو بیتے گی وہ مجھ پر، اکیلی پہ نہیں بیتے گی۔ ماما کا موڈ سخت آف ہے۔“

”تم سسپنس پھیلا نا موقوف کرو اور مجھے اصل بات بتاؤ.....!“

ایمان نے اب کی مرتبہ اسے ٹوک دیا تھا۔ فضہ نے ایک ملول قسم کی سانس بھری پھر آہستگی سے بولتی تھی۔

”پاپا کو برلن میں کسی پریشانی کا سامنا ہے۔ زیادہ تفصیلی مسائل تو شیئر نہیں کئے ہم سے، بس یہ کہہ

رہے ہیں، ہم لوگ ماما سمیت گاؤں چلے جائیں اور کچھ عرصہ وہیں رہیں۔“

”واٹ.....؟ گاؤں کیوں.....؟“

وہ زور سے چیختی تھی۔

”پتہ نہیں.....! مجھے جتنا معلوم ہو سکا، تمہیں بتا دیا ہے۔ ماما بہت آپ سیٹ ہیں۔ مجھے تو پاپا نے بلا کر

اپنی پبلنگ وغیرہ کرنے کا کہا ہے، کل ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“

فضہ بتا رہی تھی اور ایمان کے اندر بھونچال سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”ایسی کون سی قیامت آگئی ہے آخر کہ ہم یہاں نہیں رہ سکتے.....؟ تاؤ جی کے گھر کیوں رہیں ہم

آخر.....؟ امپا سبل.....! میں خود پاپا سے بات کرتی ہوں۔“

وہ تن فٹن کرتی اٹھ گئی تھی۔ مگر پاپا سے بات کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ صورت سے ہی

اتنے پریشان لگ رہے تھے کہ وہ کچھ اور الجھ گئی تھی۔ مختلف سوال پوچھ ڈالے جن کے آدھے اُدھورے غیر مطمئن

جواب ملے تھے۔ وہ ڈہنی غلطان کا شکار ہونے لگی۔

”آپ جانتے ہیں پاپا.....! میرے لئے وہاں رہنا کس قدر دُشوار ہوگا.....؟“

وہ اداس سی ہونے لگی تھی۔

”آئی نو بیٹا.....! مگر میں کوشش کروں گا حالات جلدی سنبھال سکوں۔ پھر میں آپ کو واپس بلا لوں گا۔“

انہوں نے اپنی بے حد جیتی بٹی کو ایک ایسی تسلی دی جس پر انہیں خود بھی یقین نہیں تھا۔

”میری اسٹڈی بہت متاثر ہوگی۔ میں وہاں پڑھ نہیں پاؤں گی۔ تاؤ جی کے گھر کا ماحول بہت اُن

کنفریبل ہے۔“

اس کے پاس لا تعداد جواز تھے۔

”بیٹا.....! ابھی آپ کالج سے فری ہو۔ ایگزیم کے دنوں میں آپ کو شہر بلا لوں گا۔“

انہوں نے پھر اسے ڈھارس دی تھی۔

”اپنے پاپا کی مجبوری کا خیال کرو بیٹا.....! پاپا آل ریڈی بہت آپ سیٹ ہیں۔ پلیز.....!“

انہوں نے جتنی ہمت سے یہ بات کہی تھی، پھر بھی وہ ان سے سخت خفا ہوگئی تھی۔ رات بھی اس نے

کھانا نہیں کھایا تھا اور اب ناشتہ کرنے کو بھی نیچے اتر کر نہیں آئی۔ حالانکہ پاپا نے ملازمہ کو بھیجا تھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

اس نے زروٹھے پن سے کہہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا پاپا ہمیشہ کی طرح اسے منانے آئیں گے مگر ایسا

نہیں ہوا۔ اس کی خفگی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

نازنین اور ارتضیٰ شاہ کی محبت کی شادی تھی۔ ارتضیٰ شاہ گاؤں کا سادہ مزاج سالڑکا تھا جسے اپنی اسی

سادگی کی بنا پر اپنی بے پناہ وجاہت اور خوب صورتی تک کا بھی احساس نہیں تھا مگر نازنین کو اس کی یہی خوب روئی

بھاگتی تھی۔ ارتضیٰ کی سمت پہلا قدم اسی نے بڑھایا تھا اور پھر یہ فاصلے منٹے چلے گئے تھے دونوں کی تعلیم مکمل ہوئی

تو محبت اس انتہا پہ جا پہنچی تھی جہاں جدائی کا تصور بہت جان لیوا ہوا کرتا ہے۔ نازنین کسی بھی قیمت پہ ارتضیٰ کو

کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ بہت زیادہ امیر نہیں تھے، مگر کھاتے پیتے لوگوں میں شمار

”تم اپنے پیرنس کو بھیجوناں میرے گھر.....!“

نازنین کے اصرار پر ارتضیٰ نے جھجکتے ہوئے اماں پہ اپنی پسند ظاہر کی تھی۔ اور اماں جو اپنی بھانجی کے لئے سوچے بیٹھی تھیں، اتنا گھبرائیں کہ رونے بیٹھ گئیں۔ ایسے میں بھابھو آگے بڑھیں تھیں ان کی مدد کو۔ بھابھو جو اماں کی بھانجی اور ناہید کی بڑی بہن تھیں۔

”پریشان مت ہو اماں.....! اماں کو میں سمجھا لوں گی۔ ارتضیٰ پڑھ لکھ گیا ہے، اسے لڑکی بھی اس کے مطابق کی ہے گی۔“

”یہ کیا بات ہوئی.....؟ میں نے تو ناہید.....“

”اماں.....! ہمیں اپنے بچوں کی خوشی کا خیال رکھنا چاہئے۔ ناہید کے لئے بھی رتب سوہنا کوئی بہتر فیصلہ ہی کرے گا۔ وہ معاملہ جو گھمبیر ہو سکتا تھا، بھابھو کی نرم طبیعت اور معاملہ فہمی کی بنا پر چٹکیوں میں حل ہو گیا۔“

”بہت شکریہ بھابھو.....! میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

ارتضیٰ واقعی بہت مشکور ہو گئے تھے۔ بھابھو گود میں کھیلنے ولید کو کاندھے سے لگا کر تھپکتے ہوتے ہنس پڑیں۔

”کملے.....! شکریہ تو غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ ہم تو تیرے اپنے ہیں۔“

اور انہوں نے یہ بات محض کہی نہیں تھی، نبھا کے بھی دکھا دی تھی۔ ارتضیٰ کو اکثر ایسا لگتا، جیسے بھابھو مصطفیٰ بھائی سے بھی زیادہ ان سب سے محبت کرتی ہیں۔ مصطفیٰ بھائی تو سارا دن کھیتوں پہ گزارتے تھے۔ بھابھو بی اماں اور ابے کے ساتھ پیار کرتی اور جس طرح کا ان کا سلوک تھا دونوں ہی بہو کی تعریفوں میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ ارتضیٰ کی شادی پہ اماں ابے اور بھائی کے ساتھ بھابھو نے بھی دل کھول کر ارمان نکالے تھے مگر نازنین چند دن کے بعد ہی اُکٹا گئی تھیں۔ ارتضیٰ سے واپس شہر جانے کا مطالبہ کر دیا تھا۔

”چلیں گے بابا.....! ابھی کچھ دن تو یہاں رہو۔ سب کیا سوچیں گے.....؟“

ارتضیٰ کے سمجھانے پہ وہ ہتھ سے اکھڑنے لگی تھیں۔

”کیا سوچیں گے.....؟ سب کو پتا ہے میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

”مگر کچھ دن تو.....“

”کچھ دن بھی نہیں.....! دیکھو کتنی گرد ہے یہاں۔ مجھے الرجی ہے گرد سے۔ اسکن دیکھو میری، چند

دنوں میں کیسی رف ہو گئی ہے۔ ارتضیٰ.....! میں تمہاری بھابھو کی طرح گاؤں کی عورت نہیں ہوں جو تین بچوں کے ساتھ جانوروں اور گھر کی بھی دیکھ بھال کر لیتی ہے۔“

نازنین کے لہجے میں حقارت کے ساتھ ساتھ تضحیک بھی در آئی تھی۔

ارتضیٰ کو بھابھو کے لئے اس کا یہ لہجہ پسند نہیں آیا تھا اور شادی کے محض پانچویں روز ان کی پہلی لڑائی ہو گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں اس وقت بیگ تیار کر کے نازنین جانے کو تیار ہو گئی تھیں۔

”یہ کیا کر رہی ہو نازو.....! پاگل ہو گئی ہو کیا.....؟“

ارتضیٰ صورت حال کو بگڑتے دیکھ کر بوکھلا گئے تھے۔

”تمہیں مجھ سے زیادہ اپنی بھانجی کا خیال ہے۔ رہو اس کے کھونٹے سے لگ کر۔“ انہوں نے پھنکار کر کہا تھا۔ ارتضیٰ اس کی بلند آواز پہ بوکھلا گئے اور اٹھ کر کمرے کی واحد کھلی کھڑکی بند کی۔

”آہستہ تو بولو.....! وہ اتنی اچھی ہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ انہی کی وجہ سے ہماری شادی.....“

”کیوں آہستہ بولو.....؟ میں تمہاری طرح نہ بزدل ہوں نہ کسی سے ڈرتی ہوں۔ اور ان کا احسان

ہوگا کوئی، تو وہ تم پر ہوگا، سمجھے.....؟ میں بالکل لحاظ نہیں کروں گی۔“

وہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں پھنکار پھنکار کر بولیں۔ جس سے یہ ہوا تھا کہ ابے کے ساتھ اماں اور بھابھو نے بھی بہت کچھ سن لیا تھا۔ مگر کسی نے بھی ارتضیٰ سے کچھ نہ کہا۔ اماں نے بہت سبھاؤ سے بات کی تھی اور خوش دلی سے انہیں شہر میں جانے کی اجازت دے کر رخصت کر رہا تھا۔

ارتضیٰ کے دل پہ بوجھ تھا۔ شہر میں انہوں نے کاروبار شروع کیا تو پیسے کی ضرورت پیش آئی تھی کہ جس فیکٹری میں وہ منیجر تھے، اس کے اوپر کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا فیکٹری کو اونے پونے بیچ کر خود انگلینڈ ہانا پناہ رہا تھا۔ ارتضیٰ چاہتے تھے۔ یہ فیکٹری وہی خرید لیں۔ انہوں نے مصطفیٰ بھائی سے بات کی تو انہوں نے اپنے باپ بائیں ہاتھ سے دیا۔ ملاوہ بہت لم تھا۔ بینک سے لون لے کر بھی پوری نہیں پڑ رہی تھی۔

تب مصطفیٰ بھائی نے زمینوں سے ان کا حصہ انہیں دے دیا تھا جسے بیچ کر انہوں نے فیکٹری خرید لی تھی۔ پھر تو گزرتے دنوں کے ساتھ ان کے حالات بدلتے چلے گئے تھے اور اسی حساب سے نازنین کا خرچہ بھی۔ خود تو وہ گاؤں جاتی ہی نہیں تھیں، ارتضیٰ شروع شروع میں دونوں بچیوں کے ساتھ چکر لگا آتے۔

اماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ ابابکھی کبھار ایک آدھ دن کو آجاتے مگر نازنین کا رویہ ایسا تھا کہ ابابا، مصطفیٰ بھائی اور بھابھو نے بھی آنا بہت کم کر دیا تھا۔ اگر مصطفیٰ بھائی آتے بھی تو ارتضیٰ سے آفس میں ہی مل کر پتلے باتے۔

وقت پچھ اور آ کے سرک گیا۔ بچے بڑے ہو گئے تھے۔ ارتضیٰ اپنی بے تحاشا مصروفیت کے باعث گاؤں کے لئے وقت ہی نہ نکال پاتے۔ مصطفیٰ بھائی موسم کا پھل اور سبزیاں وغیرہ باقاعدگی سے بھجوایا کرتے تو ماتھ میں خالص دیسی گھی، مکئی کا آٹا، ساگ وغیرہ بھی ہوتا۔ نازنین ہر مرتبہ اس سوغات کو پا کر ناک منہ ضرور پٹاں لیا کرتیں۔

”سو بار منع کیا ہے، مت بھیجا کریں۔ مگر عجیب ڈھیٹ لوگ ہیں، باز ہی نہیں آتے۔“

”ماما.....! کسی کی محبت کو ایسے بے زنی اور نخوت سے نہیں ٹھکراتے۔ مجھے تو یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔“

فضہ جی جان سے ساری چیزوں کو سنیت کر رکھتے ہوتے کہا کرتی اور ماما کا موڈ سخت آف ہو جاتا کہ ان کی اس بیٹی کا مزاج اور عادتیں بالکل اپنے باپ جیسی تھیں، جیسی تڑپ ان کے اندر تھی اپنے رشتوں کی، ویسی ہی قدر فضا کے دل میں تھی۔

”تو اب کی بار تمہارے تاؤ لے کر آئیں تو کہہ دینا، اتنا ہی دے کر جایا کریں جتنا تم دونوں باپ بیٹی

کھا سکو۔ میں اور امی تو منہ بھی نہیں لگاتیں ان فضول چیزوں کو۔“

وہ رعونت سے کہتیں اور فضا منہ ہی منہ میں استغفر اللہ پڑھنے لگتی۔ اسے اکثر خوف آتا ماما کے غرور سے۔
”آپ کو کیا پتا یہ ساری چیزیں بھی کم پڑ جاتی ہیں۔ میری ساری فرینڈز کو ساگ، کمی کی روٹی، مکھن، گھی اور گنے وغیرہ کتنے پسند ہیں۔ مانگ کر لیتی ہیں مجھ سے۔ میرا تو کئی بارجی چاہا کہ تاؤ جی سے اور زیادہ کی فرمائش کروں۔“

وہ شوخی سے آنکھیں نچا کر بولتی تو ماما اسے گھورتیں ہوئیں اٹھ جاتیں۔

اور اب جبکہ ارتضیٰ نے یہ مژدہ سنا تھا کہ انہیں وہاں جا کے رہنا ہے تو انہیں لگ رہا تھا ان کی انامدی طرح سے بخرو ہوئی ہے۔ ان کا ارتضیٰ سے بڑا زور دار جھگڑا ہوا تھا مگر وہ اپنی ضد اور موقف سے نہیں ہٹتے۔ ہار انہیں ہی ماننا پڑی تھی اور اس ہار نے انہیں بہت شکستہ کر ڈالا تھا۔

☆☆☆

تمہیں مجھ سے گلہ کیا ہے.....؟

اچانک بے رخی اتنی

بتاؤ تو ہوا کیا ہے

مناؤں کس طرح تم کو.....؟

مجھے اتنا تو بتلا دو

اگر اب ہو سکے تم سے

تو یہ احسان فرما دو

میری منزل محبت ہے

مجھے منزل پہ پہنچا دو

تمہاری آنکھ میں آنسو

مجھے اچھے نہیں لگتے

تمہارے نرم ہونٹوں پر

گلے اچھے نہیں لگتے

تمہارے مسکرانے سے

میرا دل مسکراتا ہے

تمہارے روٹھ جانے سے

میرا دل روٹھ جاتا ہے

فضا نے گنگٹاتے ہوئے اس کے گلے میں اپنے دونوں بازو محال کر دیئے تھے جنہیں اگلے ہی لمحے اس نے بہت زور سے جھٹک دیا اور آنسوؤں سے جل تھل آنکھوں میں شکایتیں لئے اسے دیکھا۔

”بات مت کر مجھ سے، تم تو بہت خوش ہو گی۔“

”اف..... اتنی بدگمانی.....؟“

فضہ کراہی۔

”یہ لپکتے جھپکتے پیکنگ کرنا، یہ سولہ سنگھار کر کے تیار ہونا، کس سمت اشارہ کر رہا ہے.....؟“

وہ پھولے ہوئے منہ کے ساتھ بولی اور فضا نے کاندھے اچکا دیئے۔

”میں قسمت اور حالات پہ شامی ہونے کی بجائے ایڈجسٹمنٹ اور راضی بارضا رہنے پہ یقین رکھتی ہوں۔“

کہتے ہیں ناں اللہ کے ہر کام میں ہمارے لئے مصلحت ہو ا کرتی ہے، پھر بھی دیکھو ناں اس سارے

ایڈونچر میں کتنی تھل کا احساس ہے۔ گاؤں جانا، وہاں رہنا اور سنا ہے تاؤ جی کے تین تین بیٹے بھی ہیں۔ ہو

سکتا ہے پینڈم بھی ہوں اور پڑھے لکھے بھی۔ بالکل کہانیوں، ناٹلز، فلموں کی طرح۔“

فضہ کی خباثت اور شرارت عروج پہ تھی۔ ایمان نے اس کی بڑائی کا لحاظ رکھے بغیر تاک کر اسے کشن

کھینچ مارا تھا۔

”کتنے ہی پینڈم اور پڑھے لکھے ہوں، مگر میرا سینڈرڈ اتنا نہیں گرا ہے، بہر حال.....!“

اس کے لہجے میں تکبر کے ساتھ ساتھ بے اعتنائی اور اپنی ذات کا دُعا بھی تھا۔ فضا ٹھنڈا سانس بھر کے

ناوش ہو رہی۔

”ہاں مجھے ہی بتا دو، میں تمہاری پیکنگ کر دیتی ہوں۔ ویسے پاپا کا خصوصی آرڈر ہے کہ ڈھنگ کے

پڑے۔ ہی وہاں پہن کر جائیں۔“

اسے آمادہ نہ دیکھ کر فضا کو ہی اٹھٹا پڑا، مگر ساتھ ہی گویا حد بھی لگا دی۔ ایمان نے چونک کر اسے

دیکھا۔ پیشانی پہ ناگواری کی بہت واضح شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔

”کیا مطلب ہے ان کا اس بات سے.....؟“

وہ کس قدر بھڑک کر بولی تھی۔ فضا جو اس کی وارڈ روپ کھولے کھڑی تھی، اس کے کپڑے دیکھتے

”۔ ہولی ٹی۔“

”بھئی.....! سیدی سے بات ہے۔ پاپا نے وہاں تمام غیر اخلاقی لباس پہننے سے منع کیا ہے۔ صرف

شلوار قمیص ہی لے جا سکو گی۔“

فضہ کی وضاحت پہ ایمان نے ہونٹوں کو باہم بھیجنے لیا۔ اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے دوپٹوں والے سوٹ

لگاتی فضا کو سلگتی نظروں سے گھورنے لگی۔

”تم رہنے دو، میں یہ کام خود کر لیتی ہوں۔“

اس نے درشتی سے ٹوک دیا۔

”ہائیں.....؟ اتنی جلدی ہار مان لی.....؟ کہیں کوئی خیال تاؤ جی کے کسی پینڈم بیٹے کا تو نہیں.....؟“

فضہ کے شوخ لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔ ایمان کا چہرہ ایک دم غصے کی سرفی سے دھک اٹھا۔

”اب اگر تم نے یہ فضول بات دوبارہ کی تو میں سچ سچ تمہارا سر پھاڑ بیٹھوں گی۔“

وہ بولی نہیں، دھاڑی تھی۔ فضا خائف سی ہو گئی۔

”اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو.....؟ اگر سچ سچ تمہارے دل نے تمہیں دعا دے دیا ہے تو یہ طظنہ دھرا رہ

وہ اب کی مرتبہ کسی قدر سنجیدگی سے گویا ہوئی تھی۔ مگر ایمان کا دماغ گھوم گیا تھا۔ منہ سے کچھ کہے بغیر اس نے فضا کا ہاتھ پکڑ کر باہر دھکیلا تھا اور زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا تھا۔ فضا کی ہنسی کی آواز اس کا دماغ سلگاتی رہی تھی۔

☆☆☆

اسے کہنا گلے ان ہی سے ہوتے ہیں
جو دل کے پاس ہوتے ہیں
شکایت ان سے ہوتی ہے
جو بے حد خاص ہوتے ہیں
میرا تجھ سے گلہ کرنا
تمہیں یوں ہی دلاسا دینا خفا کرنا
تیری تائید کے بدلے جفا کرنا
محبت کی علامت ہے
یہ الفت کی علامت ہے
محبت میں کبھی ہرگز اسے دل پہ نہیں لینا
اسے کہنا محبت کی توقع ان سے ہوتی ہے
کہ جن سے اسے ہوتی ہے
گلے ان سے ہی ہوتے ہیں
جو دل کے پاس ہوتے ہیں

ٹرین کی چھکا چھک، بچوں کا شور، مسافروں کی دھکم پیل، پھیری والوں کی پاٹ دار آواز۔ کچھ بھی تو اس کے گیان دھان کو نہیں توڑ سکتی تھیں۔ وہ بے حد خفا، بے حد رنجی ہوئی سی بیٹھی تھی کہ ٹرین ہونے والے اس سفر نے اس کی خفگی، شکایت اور افسردگی کو کتنا بڑھا دیا تھا۔

”کیا پاپا ایک دم اتنے تلاش ہو گئے ہیں کہ ہمیں گاڑی میں گاؤں نہیں پہنچا سکتے؟“

اس کے لاتعداد شکوؤں میں ایک اور شکوے کا اضافہ ہوا تھا۔ کھڑکی کے باہر کھیر کر وہ آنسو بھی بہا چکی تھی اور اس کے یہی آنسو یقیناً کتاب پڑھتی فضا کی زیرک نگاہ کی زد میں آئے۔ کہ وہ اسے سنانے کو یہ نظم زیر لب پڑھنے لگی تھی۔

اس کی مدھم آواز پہ ٹرین کی دھم بھی غالب آجاتی، کبھی کبھار ٹرین کی دھم بھی طلب انسان اس کے دکاندار کی۔ ایمان بھی کون سا سنتا چاہتی تھی۔ منہ پھیرے رہی۔ فضا نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر گرم سینڈوچ اور سموسوں کی

خوشبو بہت سرعت سے ڈبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ فضا نے پلیٹ نکال کر سینڈوچ اور سموسوں کے ساتھ کچپ کی بوتل بھی نکال لی، ساتھ میں پیپسی کے ٹن چیک۔ اس نے اس قسم کی صورت حال میں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ گویا انہیں لچ پیش کیا تھا۔

ایمان نے تو زورٹھے پن سے انکار کر دیا، البتہ ماما موڈ کی خرابی کے باوجود کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں کہ رات کے بعد صبح بھی وہ اس ٹینشن میں ڈھنگ سے کچھ کھا نہیں سکی تھیں۔ مگر کب تک.....؟ پیٹ کی طلب تو اپنی جگہ تھی۔

”تم بھی کھا لو ناں.....! کب تک یہ احتجاج منانے کا ارادہ ہے.....؟“

فضا نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے اپنی بہت دیکھتے بچوں کو سمو سے دیتے ہوئے نرمی و حلاوت سے اسے بھی سمجھایا تھا۔ مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔

”ایمی.....! پلیز، کھا لو ناں.....! مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے تمہارے بغیر۔“

فضا نے گویا منت کی تھی۔ اس نے کان نہیں دھرا۔ فضا نے پلیٹ رکھی اور اس کے گرد اپنا بازو مائل کر دیا۔

”اب تک فغا ہو گی.....؟ تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

”مر لینے دو مجھے بھوکے.....!“

اس کی جانب سے سلگتا ہوا جواب موصول ہوا تھا، وہ بھی بھرائی ہوئی آواز میں۔

”اچھا بس.....! ایسی خوف ناک باتیں مت کرو۔ ہم کون سا ہمیشہ کے لئے جارہے ہیں.....؟ دُعا

کی قسمی صبح میں نے، جو بھی مسائل ہیں، خدا انہیں جلدی سے سلجھا دے۔ ہم پھر اپنے گھر واپس آجائیں گے۔“

فضا نے نرمی و حلاوت سمیت سمجھایا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو برسنے لگے۔ فضا کا اپنا دل

ہمارا نے اگا۔ وہ جانتی تھی ایمان بہت جذباتی ہے۔ وہ کبھی گاؤں نہیں گئی تھی۔ گاؤں سے اسے ماما کی طرح

ہی چڑھتی۔ مگر اب پتا نہیں یہ ان کی آزمائش تھی یا پھر ماما کے ہی تکبر کی سزا کہ جنہیں کبھی کسی قابل نہیں جانا تھا،

حالات نے انہی کے در پہ لا چٹا تھا.....؟

فضا نے ادھر ادھر کی باتوں کے دوران اسے ایک سموسہ اور سینڈوچ کھلا دیئے۔

”چائے پیو گی.....؟“

پیپسی کے ٹن کی سیل توڑ کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

ایمان کو بے اختیار ہی اس پہ ٹوٹ کر پیار آ گیا۔ کیسے وہ ماں کی طرح سے اس کا خیال رکھ رہی تھی۔ گو کہ اس کا

جی نہیں چاہ رہا تھا مگر محض اس کی خاطر اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ اور واقعی فضا بہت مطمئن انداز

میں چائے گلوں میں نکالنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

☆☆☆

پتا نہیں سفر اتنا طویل تھا ہی نہیں جو اتنی جلدی منزل بھی آگئی تھی۔ کھانے پینے کے بعد اس پہ سستی سی

طاری ہوئی تو وہ وہیں ماما کی گود میں سر رکھے سو گئی تھی۔ دوبارہ آنکھ فضا کے جگانے پہ کھلی تھی۔

”اٹھو بھی.....! اسٹیشن آگیا ہے۔ اُترو.....! فناف کرو.....! یہاں گاڑی زیادہ دیر رکتی نہیں ہے۔“
فضہ عجلت بھرے انداز میں سامان سمیٹ رہی تھی۔ ماما بھی اٹھ کر اپنا بیگ اٹھانے لگیں۔ ایمان نے سخت اکتاہٹ بھرے انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھا۔ غیر مصروف سا اسٹیشن تھا، جس کی عمارت بھی خستہ اور بوسیدہ تھی۔ اکا دکا کھوکھے تھے جن میں ایک پان سگریٹ کا، تو دوسرا نان پکڑوں والا۔ تیسرے پہ غالباً پھل بچے ہوئے تھے۔ چند ایک اونگھتے ہوئے مسافر بھی سبکی پنچوں پہ بیٹھے تھے۔ البتہ ٹرین کے اندر ایک ہنگامہ پاتا تھا۔ سامان گھسیٹتے اُترنے والوں نے سر پہ اٹھایا ہوا تھا جن میں ایک فضہ کا دھان پان سا وجود بھی شامل تھا اور اسی کوشش میں اس کی ایزدی کے نیچے کسی خاتون کا پیر آگیا۔ پھر تو پنجابی لب و لہجہ میں آہ وبکا اور گالیوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ فضہ کی معذرت اسی طوفان میں گھٹ کر اپنی حیثیت کھو بیٹھی۔

”پتا نہیں یہ شہر کے لوگ تو پنڈ والوں کو کیڑے مکوڑے سمجھ لیتے ہیں۔ حد ہے بھی.....!“
خاتون کی لعنت و ملامت ابھی تھی نہیں تھی کہ ایک اسٹوڈنٹ نے اپنا پف جھٹکتے ہوئے لقمہ دیا تھا۔ فضہ کی خجالت کچھ اور بڑھ گئی۔ ایمان بے زاری سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔
”تمہارے پاپا تو کہہ رہے تھے ہمیں اسٹیشن پہ کوئی لینے آئے گا۔ فون کر کے بتا دیا ہے۔ پتا نہیں کوئی پہنچا بھی ہے کہ نہیں.....؟“

ماما کی اپنی الجھن تھی۔

”السلام علیکم.....! میں عاقب حسن ہوں۔ مصطفیٰ شاہ کا بیٹا۔“

ایک مہذب گھمبیر آواز پہ ان کی گردنیں یگانگی انداز میں مڑی تھیں۔ سفید کھدر کی شلوار، گرے ٹرٹا، بلیک لیڈر کی چپل۔ وہ ایک دراز قد کا اچھا خاصا خوب رو سالڑ کا تھا۔

”وعلیکم السلام.....! کیسے ہو.....؟“

ماما نے گویا مروتا ہی شوہر کے بھیجے کا احوال دریافت کیا تھا۔ جبکہ ایمان اس کا سر تا پا جائزہ لیتے ہیں مصروف رہی۔

”الحمد للہ.....! آپ لوگوں کو سفر میں کسی قسم کی پریشانی تو نہیں ہوئی.....؟“

وہ جھک کر ان کے بیگ اٹھا رہا تھا۔ ایمان کے چہرے پہ تسخر پھیل گیا۔

”اگر ہوئی بھی ہو تو کیا کریں گے آپ.....؟“

ماما کے لہجے میں کاٹ دار طنز تھا، جہاں فضہ بے طرح گھبرائی تھی، وہاں عاقب حسن نے بہرہ کرا سے گویا پہلی مرتبہ گھور کر دیکھا تھا اور اس کے معصوم سے چہرے پہ موجود بچکانہ سی فحش کو محسوس کر داری سے مسکرا دیا۔

”ریلوے پولیس میں میرا کوئی عہدہ تو نہیں ہے، مگر یہ کی خاطر میں کسی سے بھی پنکا لے سکتا ہوں۔ اس کے فریش لہجے میں خفیہ سی شرارت تھی۔ یقیناً وہ پکڑا۔“
تات میں ہی بے تکلف ہونے والوں سے ہوگا۔

”میری خاطر کیوں.....؟“

وہ خواہ مخواہ چڑی۔

”بھئی.....! آپ میری کزن ہیں۔ آپ کی خاطر بھی اگر کوئی ایکشن نہ لوں تو فائدہ میرے اتنے جوان ہونے کا.....؟“

جواباً وہ دانت نکال کر بولا۔ فضہ ہنس پڑی۔ جبکہ ایمان کا موڈ کچھ اور خراب ہو گیا تھا۔ وہ سامان اٹھائے ٹرین سے اُتر آئے۔ عاقب نے اتنا سامان اٹھا رکھا تھا کہ ایمان کو اسے دیکھ کر الجھن ہونے لگی۔

”ماما.....! قلی کر لیں بھئی.....! مجھے لگ رہا ہے جیسے کسی گھوڑے پہ سامان لدا ہو۔“

ایمان کی ہنسی نکل گئی۔ فضہ نے اسے گھورا۔ اس کا خیال تھا عاقب نے لازماً ماسنڈ کیا ہوگا۔ مگر اسے مسکراتے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔

”سوری.....! یہ ایکی تھوڑا مذاق کی عادی ہے۔ آپ نے ماسنڈ تو نہیں کیا.....؟“

فضہ کو ہر کسی کی فکر رہا کرتی تھی۔ ایمان اپنے بیگ سے چیونگم نکال کر لاپرواہی سے منہ میں ڈال رہی تھی۔

”نہیں بھئی.....! ہم اتنے تنگ ذہن اور تنگ دل نہیں ہیں کہ ایسی باتوں سے ماسنڈ کر جائیں۔ یہ تو ہماری نفسی سی بہن ہیں۔“

ماتپ نے اس شائستگی سے کہا تو پہلی بار ایمان کو تھوڑی سی ہمت نے گھیرا تھا۔ ایسی ہی باتوں کے دوران وہ لوگ اسٹیشن کی عمارت سے نکل آئے۔ سامنے ایک ہی پکی سڑک تھی جس کے دونوں اطراف کھیت تھے۔ سرد ہواؤں نے ان کا استقبال کیا تھا۔ ایمان کا خیال تھا وہ انہیں ٹانگے میں لے کر جائے گا۔ مگر اسے ایک سائینڈ پلکزی سفید کرولا کی طرف بڑھتے دیکھ کر اسے بے اختیار سکون کا احساس ہوا۔

فضہ اس سے تاؤ جی، تائی ماں، دادا کے علاوہ ولید اور عاشر کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔ عاقب انہیں سب کے متعلق تفصیل سے بتاتا رہا۔

”دادا بیمار نہ بنے لگے ہیں۔ اب تو یقیناً ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اس نے اپنی بات کے اختتام پہ قدرے شرارت سے ان کی سمت دیکھا۔

”اب کیسے.....؟“

فضہ نے دلچسپی سے اس کی بات کو آگے بڑھایا۔ وہ ڈیگی میں سامان رکھ کر انہیں پچھلی سیٹوں پہ بٹھانے لے۔ بعد خود ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا تھا۔

ان کی شدید خواہشوں میں سے ایک خواہش اپنی پوتیوں کے ساتھ وقت گزارنے کی بھی رہی ہے ناں.....! جب سے آپ کی آمد سے باخبر ہوئے ہیں، آدھی بیماری تب سے ہی رخصت ہو گئی ہے۔“

وہ ہنس کر وضاحت کر رہا تھا۔ ایمان نے ٹھنڈا سانس بھر لیا۔

”جانے کس کس کی خواہشوں اور دعاؤں نے آج ہمیں اس موڑ پہ لاکھڑا کیا ہے.....؟“

وہ نئے سرے سے گھٹنے لگی۔ جبکہ فضہ یقیناً خوش ہو گئی تھی جہی اس کی باپچیں کھلی جا رہی تھیں۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور کھڑکی کی طرف رخ پھیر لیا۔

کھیت کھلیان پیچھے رہ گئے تھے۔ اب باغات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ امروہ، مالٹوں اور سیب کے

وسیع باغات تھے، جن کی تازہ مہک فضا میں پھیل ہوتی تھی۔

”یہ گاڑی تمہاری اپنی ہے.....؟“

ماما کی چپ ٹوٹی تھی اور انہوں نے پہلی بار کوئی سوال کیا تھا اور فضلہ کے خیال میں انتہائی نامعقول۔
”نہیں چچی جان.....! یہ میرے دوست کی گاڑی ہے۔ آپ لوگوں کی سہولت کے لیے اس سے لایا ہوں۔ ہم پچھلے سال گاڑی لینا چاہ رہے تھے مگر ابانے منع کر دیا۔ ہمارا ٹریکٹر بہت پرانا ہو گیا تھا۔ ابا چاہتے تھے گاڑی کی بجائے نیا ٹریکٹر لے لیا جائے، اس چلانے کے لئے۔“

وہ پھر تفصیل سن رہا تھا۔ ایمان کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی.....؟ وہ بے زاری سے باہر جھانکتی رہی۔ گاڑی اب نیوب ویل کے پاس سے گزر رہی تھی۔ ایک گدھا گاڑی جس پہ لکڑی کے کریٹ تھے، ان کی گاڑی کے آگے آگئی تھی۔ عاقب نے رفتار ہلکی کر دی۔ نیوب ویل کا پانی سرعت سے نالوں سے ہوتا فصلوں کو سیراب کرتا جا رہا تھا۔

”تو کیا تم لوگ بھی بھائی مصطفیٰ کے ساتھ کھیتوں پہ کام کرتے ہو.....؟“

ماما پتا نہیں سارا انٹرویو ابھی لینا چاہ رہی تھیں۔ فضلہ نے عاقب حسن کے بیک ویو پر سے دکھائی دیتے چہرے پہ سادہ سی مسکان اُترتے دیکھی تھی۔

”جی.....! میں تو شہر میں جاب کرتا ہوں۔ میرے پاس تو بہت کم وقت ہوتا ہے کہ ان کا ہاتھ بنا سکوں۔ البتہ ولید اور اشعر چونکہ ابھی پڑھ رہے ہیں، تو وہ ضرور یہ کام دیکھ لیتے ہیں۔ یوں مل جل کے کام ہو ہی رہا ہے۔ شکر ہے اللہ کا.....!“

فضلہ نے بالخصوص محسوس کیا کہ اس کے لہجے و انداز میں ایک مخصوص قسم کی اکساری اور سادگی تھی۔

”افوہ.....! اس کا مطلب، آج پھر آپ کو ہماری وجہ سے آف کرنا پڑا ہوگا.....؟“

فضلہ کو انجانی سی خفت نے گھیر لیا اور وہ اپنے فطری سادہ سے انداز میں ہنس پڑا۔

”ارے.....! تکلیف کیسی.....؟ میرے لئے تو یہ ہی بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ لوگوں نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ یہاں کچھ وقت گزارنے کے لئے آئے ہیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔“

گوکہ عاقب کا انداز ہر گز بھی بہلانے والا نہیں تھا، اس کے باوجود ایمان کے دل میں ایک تیر سا پیوست ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر خود کو اسی یاسیت کے حصار میں گھرتے محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

وہاں سب نے ان کا بہت پڑتپاک استقبال کیا تھا۔ اتنی سردی کے باوجود تائی ماں نے ان کے لئے کولڈ ڈرنکس کا اہتمام کر رکھا تھا کہ گاؤں میں مہمان کو بوتل پلانا اس کی بہترین ضیافت کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

”ارے.....! نیک بخت.....! چائے بنائی ہوئی۔ بچیاں ٹھنڈے آئی ہیں اور تم پانی پلا رہی ہو.....؟“

تاؤ جی کے ٹوکے پہ تائی ماں ہنس پڑی تھیں۔

”چائے بھی بناتی ہوں۔ انڈے اُٹلنے کو رکھے ہیں، کیک پیسٹریاں اور بسکٹ نمکو تو میں نے صبح ہی دلی

سے منکوا لئے تھے۔ شہر سے لایا ہے۔ پیو پیو پتر.....! تو اڑا اپنا گھر ہے۔“

تائی ماں، تاؤ جی کو مطمئن کرنے کے بعد محبت بھرے انداز میں فضلہ اور ایمان کے سروں پہ ہاتھ پھیر کر لگاؤ سے بولیں۔ ان کی نگاہوں میں اتنا دالہانہ پن تھا، لہجے میں اتنی محبت کہ ایمان تو حیران رہ گئی تھی۔ ان کے چلنے پھرنے، بولنے، ہنسنے کے انداز سے ایک سرخوشی سی چھلکتی تھی۔

”یہ تائی ماں کے ہاتھ کون سا خزانہ لگ گیا ہے بھی.....! اتنی خوش لگتی ہے۔“

اس نے فضلہ کے کان میں گھس کر تبصرہ کیا وہ جواباً اسے گھور کر رہ گئی۔

”شرم کرو.....! پچاری خوش ہو رہی ہیں، سادہ لوح ہیں، خواہ مخواہ شک مت کرو۔“

فضلہ کے گھر کئے پہ اس نے جواباً دانت نکالے تھے اور راز داری سے بولی تھی۔

”مجھے تو کوئی گڑ بگڑتی ہے۔“

”کیسی گڑ بڑا.....؟“

فضلہ ٹھکی۔ اس نے کاندھے اُچکا دیئے۔

”نی المال تو کلمہ نہیں کہہ سکتی۔ مگر کوئی پس آئینہ حقیقت ضرور چھپی ہے۔“

اس نے ہنس مہلایا۔ فضلہ نے سر جھٹک دیا۔

”بہ ہو گا دیکھا جائے گا۔“

”آہ.....! کاش میں بھی ایسی ہی بے حس، لا پرواہ ہوتی۔“

اسے حقیقتاً فضلہ کے سکون نے شک میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

☆☆☆

وہ لہانے لے انتظار میں نہیں بیٹھی تھی۔ چائے پی اور وہیں سیدھی سیدھی لیٹ کر بے خبر ہو گئی۔ تھکان اس میں اچھل پھل رہا۔ اس کی نیند خراب نہ ہو، اسی لئے سب وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئے تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع پہ سب سے پہلے حرا آیا (تاؤ جی کی بیابھائی) ان سے ملنے چلی آئی تھیں۔ طلوس، سادگی، محبت، اپنائیت میں وہ بھی تائی ماں کا ہی عکس تھیں۔ ایسے ملیں گویا ہمیشہ سے میل ملاپ رہا ہو۔ لگتا ہی نہ تھا وہ پہلی بار مل رہی ہیں۔

”بھئی.....! ایمان کہاں ہے.....؟ اسے دیکھنے کا تو بھی بہت ہی شوق ہے۔“

انہوں نے فوراً اس کی کمی کو محسوس کر لیا تھا۔

”وہ اندر سو رہی ہے۔ تھوڑا نازک مزاج ہے، تھک گئی ہے۔“

فضلہ ہنس کر بتا رہی تھی پھر جیسے کسی خیال کے تحت چونک کر گویا ہوئی تھی۔

”آپ ہمارے نام بھی جانتی ہیں۔ جبکہ ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔“

حرا آپنی اس کی بات پہ محظوظ ہوتی تھیں۔ پھر نرمی سے جواباً بولیں۔

”چاچو اکثر تم دونوں کا ذکر کرتے رہتے تھے جب بھی آتے، بلکہ دو سال پہلے جب وہ آخری بار ہم سے ملنے آئے، تب تم سب لوگوں کی تصویریں بھی لے کر آئے تھے، جواب بھی ہم نے بہت سنبھال کر رکھی ہیں۔“

اس نے بات بنانا چاہی کہ جتنی بھی بے مروت سہی، مگر بہر حال وہ ان پیارے لوگوں کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”لے.....! ابھی تو نے کھایا ہی کیا ہے.....؟ اتنے چڑی کا پیٹ بھرنے جتنے تو نے اپنی پلیٹ میں چاول نکالے، وہ بھی یوں ہی پڑے ہیں۔ کھاپتر.....! کھا، آرام سے۔“

تاؤ جی نے خود اس کی پلیٹ بھری۔ کباب، دہی بھلے، سلا، سالن، منٹوں میں اس کے آگے اتنی ساری چیزیں پیش کر دی گئیں۔ محض تاؤ جی کا دھیان خود سے ہٹانے کی خاطر وہ کباب ٹھونسنے لگی اور پھر سب سے پہلے وہی دسترخوان سے اٹھی تھی۔

”آپ کی دلچسپی کس چیز میں ہے.....؟“

کچھ دیر بعد ہی اشعر اٹھ کر اس کے پیچھے آ گیا۔ وہ جو باہر برآمدے میں کھڑی گہری ہوتی رات اور آسمان پہ اُٹتے بادلوں کو خاموش کھڑی دیکھ رہی تھی، ذرا سا چونکی اور پھر تنگی سے سر جھٹک رہا۔

”کچھ نہیں.....!“

اس کے انداز میں محسوس کیا جانے والا نخوت تھا۔ مگر اشعر نے پھر بھی کوئی تاثر نہیں دیا۔

”کچھ نہیں.....؟ یہ تو ممکن نہیں ہے۔“

پھر اس کے گھورنے پہ خفیف سا مسکراتے ہوئے گویا وضاحت دیتے ہوئے بولا تھا۔

”دیکھئے ناں.....! ہر انسان کو کسی نہ کسی چیز میں دلچسپی ہوتی ہے۔ جیسے مجھے کھیلوں میں، عاقب بھائی کو کتا بوں میں، جبکہ ولی بھائی کو کمپیوٹر میں، اور ہماری آپا کو اپنے شوہر اور بچوں میں۔ اماں کو گھر داری میں، ابا کو اپنے کھیتوں اور فیصلوں میں۔“

اس نے تماشا گھورنے پہ دانت کھوستے ہوئے بے تکلفی سے کہا تھا۔

”بھئی.....! میں آپ کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ ویسے اس وقت آپ کو یہاں کھڑے دیکھ کر پتا ہے مجھے کیا خیال آیا تھا.....؟“

وہ بڑی راز داری سے بولا۔ ایمان نے کسی قسم کا اشتیاق اور دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ تب بھی وہ اس ٹون میں بولتا رہا تھا۔ جیسے آسمان پہ تنہا اُداس چاند۔

”آپ ہمیشہ ہی اتنی خاموش رہتی ہیں.....؟ یہاں آنا اچھا نہیں لگا.....؟“

وہ پھر بے تکان سوال کر رہا تھا۔ ایمان نے اُچاٹ نظریں اس پہ جمائیں اور زوٹھے پن سے بولی تھی۔

”دوسری بات زیادہ صحیح ہے.....!“

اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اس کے پیچھے دروازے پر زکے کھڑے ولید حسن کی پیشانی پہ اس کے جواب نے ناگواری کے احساس کو یلکھت دوگنا کر دیا تھا۔

”اشعر.....!“

انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے کسی قدر بلند آواز سے پکارا دونوں میں چونک کر مڑے تھے۔

”اپنے کمرے میں جاؤ.....! کبھی اسٹڈی پہ از خود بھی توجہ دے لیا کرو۔“

وہ برہمی سے کہہ کر لمبے ڈگ بھرتا صحن اور ڈیوڑھی کو عبور کرتا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ایمان لو اس کا رویہ بہت شدت سے محسوس ہوا تھا۔ ایک تو ہین آمیز سا احساس اسے چھو کر گزر گیا۔

”چلتا ہوں.....! لگتا ہے بھائی کا مزاج آج گرم ہے۔ ویسے اگر آپ کو میری کمپنی کی ضرورت ہو تو میں دل و جان سے حاضر ہو جاؤں گا۔“

وہ کھٹکھٹاتا ہوا کہہ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ ایمان وہیں کھڑی ہوئی ہونٹ چباتی رہی۔ ولید کے کھورنے پہ عذر کرتی رہی تھی۔ گھر کے دیگر افراد کی طرح اس نے نہ تو اسے اہمیت دی تھی نہ ہی اس پر خصوصی توجہ۔ اس نے جانا تھا جیسے وہ اسے خصوصی طور پر نظر انداز کرتا رہا ہو۔

”مگر کیوں.....؟“

ایمان کی نازک طبع پہ ناگوار سا بوجھ پڑ گیا۔

”کیوں کر رہا ہے وہ میرے ساتھ ایسا.....؟ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ بہت قابل ہے.....؟“

اس نے تنفر سے سوچا اور اگلے ہی لمحے وہ ٹھٹک گئی تھی۔

”کہیں اسے ہمارا یہاں آنا برا تو نہیں لگا.....؟ یقیناً یہی بات ہے.....!“

اس نے اپنی سوچ پہ خود ہی تصدیق کی مہر بھی ثبت کر ڈالی۔ اس خیال کا پختہ ہونا تھا کہ اس پل گویا اس نے ولید سے ایک سر باندھ لیا تھا جو آنے والے وقتوں میں شدید تلخی کا باعث بن جاتا۔

☆☆☆

”ہائے.....! اینگری گرل.....!“

انہیں رہائش کے لئے بالائی حصہ دیا گیا تھا جس میں دو کمرے تھے۔ آگے برآمدہ، جسے یقیناً موسموں کی شدتوں سے محفوظ رکھنے کی غرض سے بھاری چتیں لٹکائی گئی تھیں۔ چھوٹا سا کچن بھی تھا، واش روم کی سہولت بھی موجود تھی، چھت پختہ تھی، دونوں کمروں کے بیچ دروازہ تھا جسے بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ ایک ہی کمرے میں فضا نے سب کے سونے کا انتظام کر لیا تھا۔ دو سنگل نواری پٹنگ موجود تھے۔ تائی ماں اپنا پٹنگ وہاں بچھوٹا چاہ رہی تھیں، مگر فضا نے منع کر دیا اور دوسرے کمرے میں بچھا میٹرز اٹھا کر اپنے سونے کا انتظام کر لیا۔

یہ ان کی آمد سے قبل یقیناً تینوں لڑکوں کے کمرے تھے۔ ایک اسٹڈی کے طور پہ استعمال ہوتا تھا، دوسرے میں سویا جاتا۔ فضا نے ساری سیٹنگ ویسے ہی رہنے دی۔

پہلی رات تو ایمان کو سرے سے نیند نہیں آتی تھی۔ کرڈیں بدل بدل کر جب جسم اکڑ گیا تھا، اٹھ کر خاموشی سے ٹیبل پر آگئی۔ ٹیبل کا یہ دروازہ بیرونی گلی میں کھلتا تھا جس کے سامنے وسیع رقبہ پر پھیلے ہوئے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ اس کے آگے نہر بہتی تھی۔ ایمان کو یہاں سے نظارہ کرنا بہت بھایا تھا، جیسی وہ اکثر وہاں آکھڑی ہوتی تھی۔

اس وقت بھی وہیں کھڑی تھی جب اشعر کی آواز پہ گردن موڑ کر سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر سے اپنے سابقہ شغل میں مصروف ہوگی۔

وہ بڑھ کر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

”یہاں ہے ہی کیا ایسا قابل ذکر دیکھنے کو؟“

اس کا لہجہ یہاں آکر ایک مخصوص تنگی اور تسخر کا شکار ہو رہا تھا۔

”لگتا ہے آپ کو ہمارا گاؤں بالکل پسند نہیں آیا؟“

”مجھے تم بھی پسند نہیں آئے، صرف گاؤں کی بات مت کرو۔“

اس کا موڈ بے حد خراب تھا اور جب وہ اُداس ہوتی یا مزاج برہم ہوتا تب وہ یوں ہی بے حس ہی نہیں سفاک بھی ہو جایا کرتی تھی۔ یہ فضا کا خیال تھا اور کسی قدر درست تھا۔

اشعر کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ مگر وہ بہت سرعت سے خود کو سنبھال چکا تھا۔

”دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے ہمارا گاؤں ابھی آپ نے دیکھا نہیں ہے۔ آئیے ناں.....! میں آپ کو گاؤں دکھا کر لاؤں۔“

”مجھے نہیں دیکھنا۔“

اس نے اسی نخوت سے صاف انکار کر دیا۔

”میں کالج سے آتے ہوئے فرائی فٹ لایا ہوں۔ فضا آپ نے اب تک پلیٹوں میں نکال لی ہوگی۔ میں آپ کو بلانے آیا تھا۔ دیکھئے.....! باتوں میں بالکل بھول گیا۔“

وہ ماتھے پہ ہاتھ مار کر کہہ رہا تھا۔

”مجھے نہیں کھانا۔“

”لیکن آپ کو تو بہت پسند ہے۔“

وہ کسی قدر اچنبھے سے بولا۔

”تمہیں الہام ہوا ہے کہ مجھے پسند ہے؟“

وہ جھلانے لگی۔ اب کی مرتبہ اشعر کے چہرے پہ خوب صورت سی مکان بکھر گئی تھی۔

”جن لوگوں سے ہمیں محبت ہو، جن کی ذات سے دلچسپی ہو، ان کی پسند اور ناپسند کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا اتنا مشکل کام تو نہیں ہے؟“

”کیا مطلب ہے تمہاری اس بات سے؟“

وہ بڑے جارحانہ انداز میں اسے گھور کر ڈانٹنے کے انداز میں بولیں تو اشعر ڈرنے کی ادا کاری کرتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

”بے فکر رہیں.....! میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ قسم سے.....!“

”گڈ.....! ورنہ میں ابھی تمہارا چوکھٹا سنیک کے رکھ دیتی۔“

وہ مسکراہٹ دبا کر بولی تو وہ اس کا موڈ بدلا ہوا پا کر بے ساختہ ریلیکس ہوا تھا۔

”مجھے بہت ہمدردی ہو رہی ہے اس بیچارے سے جس کا مستقبل آپ کے ساتھ تاریک ہونے والا ہے۔“

وہ شرارتا بولا اور پھر زور سے ہنستا ہوا نیچے بھاگ گیا۔

”آجائیں.....! اگر فرائی فٹ کھانا ہے تو.....؟“

وہ سڑھیاں اُترتے ہوئے ہانک لگا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر ایمان بھی اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

☆☆☆

آنکھن میں خوشگوار سا شور تھا۔ فضا، عاقب اور اشعر محلے کے دیگر بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے اور وہ اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی سے کسی قدر خشکی سے فضا کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پیاری جنم جنم کی پیاسی نہیں ہے۔

آپا اگلے دن چلی گئی۔ ہمیں جاتے ہوئے اپنی دعوت دے کر گئیں تھیں اپنے ہاں آنے کی۔ تب سے ان کی جگہ فضا نے سنبھال لی تھی۔ کبھی آنا گوندھ رہی ہے، کبھی سبزی بنا رہی ہے، کبھی چائے بنا کر سب کو پیش کر رہی ہے، کبھی گھر کی صفائی میں لگن۔ تائی ماں اسے روکتی رہ جاتیں، وہ اُلٹا خفا ہونے لگتی۔

”کیا یہ ہمارا گھر نہیں ہے تائی اماں.....؟“

”نہ کیوں نہیں پتر.....؟ پر تو مہمان ہے ناں.....! اچھا نہیں لگتا۔ پھر کہاں عادت ہوگی تجھے ان.....! لی“

وہ بوکھلائی جاتیں۔

”ماما سے پوچھیں ذرا، سارا گھر میں نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔ بہت گھڑلڑکی ہوں۔“

وہ خود ہی اپنی تعریفوں میں رطلب اللسان ہو جاتی تو تائی ماں ہنس کر اسے پیار سے لپٹا لیتیں۔

”اچھی دھی رانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں پتر.....! خدا تیرا نصیب بہت سوہنا کرے، آمین.....!“

وہ اس کی بلائیں لیتی دُعاؤں سے نوازنے لگتی اور فضا کا خون بڑھ جاتا۔ مگر بظاہر شرارت سے کہتی۔

”تو تائی ماں.....! کیا ایسی اچھی دھی نہیں ہے.....؟“

”ناں پتر.....! وہ بھی بہت سوہنی ہے، بہت پیاری ہے۔“

”وہ تو گھر کا ایک کام بھی نہیں کرتی ناں.....! اس لئے.....!“

جواباً وہ دانت نکال کر وضاحت دیتی اور ایسی کاموں کا موڈ بگڑ جاتا۔

”میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے خواہ مخواہ خود کو گھسانے کا۔“

”مجھے تو ہے.....!“

فضا کے اطمینان میں ذرا جو فرق آتا ہو۔

”کیوں کرتی ہو یہ سارا کچھ.....؟“

وہ لڑنے کو تیار ہو جایا کرتی۔

”ہم یہاں رہتے ہیں، یہاں سے کھاتے ہیں، اگر اتنا سا کام کر دیتی ہوں تو کوئی احسان نہیں

کرتی۔“

فضا کا انداز نارمل ہوتا، اور وہ بھڑک اٹھتی۔

”ہم یہاں کام کرنے نہیں آئے۔ یہ کام ہمارے شایان شان بھی نہیں۔“

”غور اللہ کو پسند نہیں ہے ایسی.....!“

فضہ نے سمجھایا تھا اور وہ ہونٹ بھینچ کر اس کے پاس سے اٹھ کر ماما کا سر کھانے لگی تھی۔

”کیوں کر رہی ہے وہ یہ کام.....؟ منع کریں اسے، اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہم نوکر تھوڑا ہی

ہیں.....؟“

”میں نے منع کیا تھا، وہ نہیں مانتی۔“

ماما نے آہستگی سے بتایا تو اس کی تشویش بڑھ گئی۔

”مجھے لگ رہا ہے وہ عاقب میں انوالو ہو رہی ہے.....؟“

اس کے لہجے میں ٹھکر تھا، ناگواری تھی۔ ماما نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ڈونٹ وری.....! ہم اس کی شادی تو کرنے سے رہے.....؟ مجھے اپنی بیٹیوں کو گاؤں میں نہیں

جھونکنا۔ وہ محض فراغت سے بچنے کو کام کرتی ہے۔ کچھ اس کی عادت بھی ہمدردانہ ہے۔“

ماما نے اپنے ساتھ اسے بھی تسلی دی تھی۔ وہ مطمئن نہیں بھی ہوتی، تب بھی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

وہ نیچے ایک بار پھر جھانکنے لگی تھی۔ وہ خیالوں سے چونک کر متوجہ ہوئی۔ اشعر نے عاقب کو آؤٹ کر دیا تھا۔

اب فضہ کی باری تھی اور اسے کھیلنا نہیں آرہا تھا۔

”افوہ.....! بیٹ پڑیں اور چھکے ماریں۔ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے بھلا.....؟“

اشعر اس کی ہچکچاہٹ کو پا کر اپنے مشوروں سے نواز رہا تھا۔ عاقب نے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں

بیٹ تھمایا اور اسے شائٹ لگانا سمجھانے لگا۔ گوکہ دونوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا، پھر دونوں ہی سلجھے ہوئے

مزاج کے حامل تھے۔ عاقب نے خواہ مخواہ فضہ کے قریب ہونے اور اسے چھونے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس کے

باوجود وہ بے حد مضطرب ہو گئی اور کھڑکی سے ہٹ کر صحن عبور کیا اور سرڑھیاں پھلانگتی نیچے اتر آئی۔

”لائیں، فضہ کی باری میں لیتی ہوں۔ بس ذرا اپنی خیر منائیں.....!“

اس نے نزدیک آتے ہی عاقب کے ہاتھ سے بیٹ چھین لیا۔ تینوں نے ہی خوشگواری میں مبتلا ہو کر

اسے دیکھا تھا۔

”تمہارا اعتماد بتاتا ہے کہ تمہیں کھیلنا آتا ہے۔“

عاقب نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

”شیور.....! میں اپنی کالج ٹیم کی کیپٹن رہ چکی ہوں۔“

”رہ چکی ہوں.....؟ کیا مطلب.....؟“

عاقب کے استفسار پر اس نے کاندھے اچکا دیئے۔

”دل اکتا گیا تھا، اس لئے چھوڑ دیا۔“

عاقب اسے بال کرانے لگا۔ اور واقعی اس نے انہیں گھا کے رکھ دیا۔ ہر بال پہ شائٹ مار کے۔ یہاں

تک کہ اس کے زور دار شائٹ پہ گیند گم ہوگی۔

”شکر ہے خدایا.....! خس کم جہاں پاک.....! اسی طرح جان چھٹ سکتی تھی ہماری۔“

اشعر نے آواز بلند کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”دیکھا میرا کمال.....!“

ہم نے تو آپ کا جمال بھی دیکھا، کیا خوب ہے.....!

”جان بہاراں.....!“

سمیں بدن.....!

غنچہ دہن.....!

اے جان من.....!“

اشعر نے دانت نکلے ہوتے کہا اور ایمان نے اسے دھپ سے بیٹ ہی دے مارا تھا۔

”شرم کرو.....! کل مجھے بہن کہہ رہے تھے۔“

”ابھی بھی بہن ہی ہیں۔ کیا بہنوں کی خوب صورتی کی تعریف نہیں کی جاسکتی.....؟“

وہ جس ناگ پے بیٹ لگا تھا، اسے اٹھا کر ناپتے ہوئے کراہ کر بولا۔ ایمان نے سرکواثبات میں جنبش

دی اور بیٹ اس کے سامنے پٹخ دیا۔

”کل کالج سے آتے ہوئے پالز لے کر آنا۔ ہم ہر روز کرکٹ کھیلیں گے۔“

”ہائیں.....؟ اتنے خطرناک عزائم.....؟ یہ غضب مت کیجئے.....!“

وہ بلبلاتا تھا۔ وہ لطف اندوز ہوتی بنے گئی۔

”تم کل پالز لارہے ہو.....! سمجھے.....؟“

اس کے انداز میں تحکم تھا۔ اشعر نے منہ لٹکا لیا۔

”لیکن صرف پالز نہیں لاؤں گا۔ ساتھ میں پلیئر بھی لاؤں گا جو ہماری ٹیم کی نمائندگی کرے گا۔“

”لے آنا.....! میں کوئی ڈرتی ہوں۔“

وہ بالوں کو سمیٹ کر کچر میں جکڑ رہی تھی۔ انداز میں بے نیازی، اعتماد اور نخوت تھی جو بلاشبہ اس پہ

جتی بھی بہت تھی۔

”ان سے ڈر جائیں گی۔“

اشعر کے لہجے میں زعم در آیا وہ مسکراہٹ دبانے لگی۔

”اتنا خوف ناک ہے دیکھنے میں.....؟“

اشعر کہہ گیا۔ پھر چڑ کر بولا تھا۔

”دیکھنے میں تو پرنس ہے اور کھیل شاندار، دو منٹ میں آپ کو آؤٹ کر دیں گے۔“

”ہماری کرکٹ ٹیم میں ایسا ٹیلنٹ تو بہر حال نہیں ہے، خوب صورت اور پر فارمنس، نونو.....!“

وہ سر جھٹک رہی تھی۔

”میں دلی بھائی کی بات کر رہا ہوں۔ بائی فیس تو جانتی ہیں، کل کھیل بھی دیکھ لیجئے۔“

اس نے آخری سیزھی پتھم کر زور سے آواز دی تھی۔ صحن میں لگے واش بیسن کے آگے کھڑے منہ ہاتھ دھوتے ولید نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ آف وائٹ جینز پہ براؤن خوب صورت سی شال لئے وہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھی، مگر اپنے اندر ایسی مقناطیسی کشش رکھتی تھی کہ وہ کئی ٹائیپے پلکیں نہیں جھپک سکا۔

”جی جناب.....! حکم.....!“

اشعر عین اس کے پیچھے آکر زور سے بولا تو وہ اپنی جگہ اُچھل پڑی اور گرنے سے بچنے کو بے اختیار گرل کو تھام لیا۔

”بدتمیز.....! میں تمہیں ادھر ڈھونڈ رہی تھی۔“

وہ اس کی سمت مڑتے ہی خفا ہونے لگی۔

”میم.....! ہم اوپر تھے۔“

اشعر نے مسکرا کر وضاحت دی۔

”مجھے کالنگ کارڈ چاہئے، کالج سے آتے ہوئے لا دینا۔“

”کون سا کنکشن ہے آپ کے پاس.....؟“

وہ اس کے بڑھائے نوٹ کو انور کرتے ہوئے ایک سائیڈ سے ہو کر سڑھیاں اتر گیا۔

”زدنگ.....! مگر اس کے گنٹل اکثر غائب ہو جاتے ہیں۔“

وہ تھلا کر کسی قدر جھنجھلا کر کہہ رہی تھی۔

”آپ جاز کی کسٹمر بن جائیں ناں.....! بہترین ہے۔“

”جانتی ہوں۔ سم تھی بھی میرے پاس، پتا نہیں اب بیگ میں ساتھ رکھ کر لائی ہوں کہ نہیں.....؟“

ایکسوں گی۔“

وہ اپنی دانست اسے جتا رہی تھی۔

”اور یہ پیسے تو لے لو.....!“

وہ اسے جاتے دیکھ کر پکاری۔

”فکر نہ کریں، اتنا سا کام کر کے میں غریب نہیں ہو جاؤں گا۔ ویسے اگر ضروری کال کرنی ہے تو میرا

سیل فون لے لیں۔“

ایمان ایک دم خاموش ہو گئی۔ اسے شاید اشعر کو یہ کام نہیں کہنا چاہئے تھا۔ اسے ایک دم خیال آیا تھا۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا.....؟ آئندہ اس نے احتیاط لازم کر لی۔ وہ بہت انا پرست تھی۔ اسے کسی پہ بار بننا اچھا

نہیں لگتا تھا۔

”کیا ہوا.....؟ خاموش کیوں ہو گئیں.....؟“

وہ پلٹ کر واپس آیا تھا۔ وہ اپنا جاکٹا تار سے لٹکا تو لیہ اُتار کر منہ صاف کرتا اپنے کمرے کی

بڑھ گیا اور گویا تب ہی پچھلی بار کی نگاہوں پر آیا۔

”تھنگ.....!“

وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ ایمان نے مکھی اڑائی تھی۔

”کوئی ایسے بھی خاص نہیں.....! مل چکی ہوں میں۔“

اس نے نخوت سے کہا۔ اشعر جانے کیوں ذومعنی انداز میں مسکرایا تھا۔ ایمان نے اس کی یہ مسکان دیکھی نہیں ورنہ اس کے ہاتھ سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی۔

☆☆☆

اس طرح نہیں کرتے رابطہ تو رکھتے ہیں

تھوڑا ملنے جلنے کا سلسلہ تو رکھتے ہیں

منزلیں بلند ہوں تو مشکلیں تو آتی ہیں

مشکلوں سے لڑنے کا حوصلہ تو رکھتے ہیں

جو تمہارے اپنے ہوں تم سے پیار کرتے ہوں

ان کا حال کیسا ہے کچھ پتا تو رکھتے ہیں

دوستی کے رشتے کو توڑتے نہیں ایسے

روٹھے دوستوں سے بھی واسطہ تو رکھتے ہیں

چھوڑ جانے والے لوٹ کے بھی آتے ہیں

لوٹ کے وہ آنے کا راستہ تو رکھتے ہیں

اس صبح اُنھ کر اپنا سیل فون چیک کیا تقریباً پاپا کے نمبر سے لاتعداد مسز کالز تھیں اور پھر یہ میسج جن میں اپنے تئیں انہوں نے اس کی خفگی کو محسوس کر کے گویا اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

وہ بے اختیار مسکرا دی۔ وہ ان سے خفا تو نہیں تھی البتہ رات کو جلدی ضرور سو گئی تھی۔ اس وقت ان کو کال کرنے کو نمبر ملایا تو کریڈٹ ختم تھا۔ وہ بے چین سی ہو کر بستر سے نکل آئی۔

ماما سر تک کبل تانے ہنوز سو رہی تھیں۔ البتہ فضلہ کا بستر خالی تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہوگی.....؟ اشعر، ولید اور عاقب کے ساتھ ساتھ تاؤ جی کا ناشتبہ بنانے میں مصروف۔

وہ چاروں صبح کو تھوڑے وقفے سے نکلا کرتے تھے۔ اس نے کلتے ہوئے اُنھ کو اپنے ہینڈ بیگ سے کالنگ کارڈ ڈھونڈنا شروع کیا۔ ناکامی کی صورت میں جھلاہٹ بھرے انداز میں بیگ کو بستر پہ الٹ دیا۔ اس

وقت اسے شاک لگا تھا جب اس کی باقی تمام چیزوں میں اسے ایک بھی کالنگ کارڈ نہیں ملا تھا۔ حالانکہ اس کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ اضافی کارڈ اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔ یہاں سے بھی بات کرنی تھی، کارڈ کی اشد ضرورت

تھی۔ وہ پانچ سو کال نوٹ مٹی میں دبائے شال گھسیٹ کر اوڑھتی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ برآمدے کے آگے سے چٹ اٹھاتے ہی شدید دھند نے اس کا استقبال کیا۔ اتنی شدید دھند تھی کہ محض چند فٹ سے آگے کا منظر نظر نہیں

آ رہا تھا۔ وہ گرم بستر سے ایک دم اُنھ کر باہر آ گئی تھی۔ وجود میں کپکپی سی چھوٹ گئی۔ مگر وہ پرواہ کئے بغیر سڑھیاں پھلاکتی نیچے آ گئی تھی۔

”اشعر.....! اشعر.....!“

”ہرگز بھی نہیں.....! تم جب چاہو، جو مرضی چیز استعمال کر سکتی ہو۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں.....!“
عاقب نے اس کا گال تھپک کر کہا تو وہ ایک دم مسکرا دی تھی۔

”تھینک یو.....! سوچ.....!“

اگر اس فقرے میں بھائی کا اضافہ کر لیتے تو مجھے اور بھی اچھا لگتا۔ دیکھ لو اب میری شرافت پہ شبہ نہ آتا۔ ایک بے حد حسین لڑکی کو خود سے بہن بنانے کو تیار ہوں۔“
وہ ہلکے ہلکے انداز میں ہنس کر کہہ رہا تھا۔ ایمان بھی زور سے ہنس پڑتی تھی۔

☆☆☆

اشعر کے انتظار سے اکتا کر وہ نیچے چلی آئی۔ وہ آج معمول سے زیادہ لیٹ ہو چکا تھا۔ فضا کچن میں مالی ماں کے ساتھ بیٹھیں چاول صاف کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے جھانکا اور دلچسپی لئے بغیر آگے بڑھ گئی۔ ولید کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے اسے کمپیوٹر کا خیال آیا تھا۔ بنا کچھ سوچے سمجھے اس کے لمرے میں گھس گئی۔ کمرہ سادگی و نفاست کا مظہر تھا۔ وہ عاقب اور اشعر کے کمرے میں جا چکی تھی مگر دونوں ہی ہمیشہ پھیلائے کے عادی تھے۔ چائے کے خالی مگ فرش پر لڑھک رہے ہوتے، کتابیں بے ترتیب، بستر کی ہادر آدمی سے زیادہ فرش پر لٹکی ہوئی، مگر اس کا کمرہ بے ترتیب نہیں تھا۔ فضا میں اس کی مخصوص مہک کا احساس قائم تھا۔ یوں جیسے وہ ابھی ابھی وہاں سے نکلا ہو۔

وہ سرسری سا جائزہ لے کر لیپ ٹاپ کے آگے آ بیٹھی۔ کچھ دیر تک یہاں سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ آن لائن نہیں تھی۔ اس نے گہرا سانس کھینچ کر لیپ ٹاپ بند کر دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کی نگاہ بک شیلف پہ جا پڑی تھی۔ وہ بے اختیار بک شیلف کے نزدیک آئی۔ تمام بڑے مصنفوں کی کتابوں کا بہترین ذخیرہ موجود تھا۔ وہ ایک ایک کر کے کتابیں دیکھتی چلی گئی۔
”مجھے تم یاد آتے ہو“

فرحت عباس شاہ کی بک گو کہ وہ پہلے بھی پڑھ چکی تھی مگر پھر سے پڑھنے کا بھی اپنا لطف تھا۔ اس نے ہال ٹال لی۔ پھر مزید کچھ کتابیں منتخب کرنا چاہ رہی تھی کہ نگاہ سیاہ مخملیں جلد کی ڈائری پہ آ کر ٹھم گئی۔ اس نے کچھ لمحوں کے عالم میں ڈائری اٹھالی تھی۔ پہلا صفحہ ہی توجہ حاصل کر گیا تھا۔

میرے بے خبر تجھے کیا خبر

میری زندگی کا ہر ایک پل

تیری آرزو، تیری جستجو

میری جیت تو، میری ہارتو

میرے بے خبر، تجھے کیا خبر

تیری ذات ہی، وہ نصاب ہے

نت پڑھنا میرا خواب ہے

دو میرے لئے سراب ہے

وہ چوکی اور سنبھل گئی اور پھر جیسے کسی خیال کے آتے ہی واپسی سرسریاں چڑھنے کا ارادہ ترک کر کے اشعر کی سمت آگئی۔

”سنو.....! تمہارے یہ بھائی کچھ پراؤڈ نہیں ہیں.....؟“

اس نے انگلی سے ولید کے کمرے کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”کچھ.....؟ بہت زیادہ پراؤڈ ہیں۔ دراصل ان کو لڑکیوں نے ان کی خوب صورتی کی وجہ سے بہت سرچڑھایا ہوا ہے۔ خود کو کچھ سمجھنے لگے ہیں۔“

وہ اس کی سمت جھک کر راز دارانہ انداز میں کہتا کچن میں آگیا جہاں مٹی کے تیل کے چولہے پہ فضا چائے بنا رہی تھی جبکہ تائی ماں مکھن کے خستہ خستہ پراٹھے۔ کچن کی حدت آمیز فضا میں دیسی گھی کے پراٹھوں اور آلیٹ کی بہت اشتہا انگیز مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر انہوں نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کو پیرھی پیش کی مگر اس کا دھیان اشعر کی سمت تھا جس کی بات نے اسے طیش میں مبتلا کرنے میں ایک پل لگایا تھا۔
”اتنے بھی خوبصورت نہیں ہیں۔ دماغ خراب ہے لڑکیوں کا.....؟“

”کیا ہو گیا ہے بھئی.....! یہ ہماری گڑیا کو صبح صبح اٹھتے ہی غصہ کیوں آنے لگا.....؟“

اسی پل عاقب اندر آیا تھا۔ بلیک پیٹ، وائنٹ شرٹ، مہرون سویٹر میں سلیقے سے بال بنائے وہ بہت صوربرسا نظر آ رہا تھا۔

”یہ..... ولید حسن.....؟“

”کک..... کچھ نہیں.....! ہم تو بس یوں ہی.....!“

اشعر نے بوکھلا کر اس کی بات کاٹی مگر عاقب کے گھبرانے پہ منہ لٹکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ہاں ایسی.....! تم بتاؤ.....! کیا ہوا ہے.....؟“

عاقب کے انداز میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔

”کچھ نہیں.....! میں یوں ہی چھپڑ رہا تھا انہیں کہ ولی بھائی کا دماغ لڑکیوں نے ان کے حسن و جمال کی وجہ سے آسمان پہ پہنچا دیا ہے۔“

اشعر نے کان کھجا کر وضاحت پیش کی تو عاقب نے اس کے سر پہ ایک چیت لگائی تھی۔
”نان سنس.....!“

عاقب نے پہلے اشعر کو ڈانٹا تھا، پھر ایمان کے سامنے ولید کی حمایت میں بولا تھا۔

”وہ بالکل پراؤڈ نہیں ہے سوئی.....! ہاں.....! البتہ تھوڑا لیا دیا انداز ہے۔ جلدی فریک نہیں ہوتا۔ مگر جب کسی سے دوستی کچی کرتا ہے ناں.....! تو پھر اسے آخری دم تک نبھاتا ہے۔“

”جی.....! وہ مجھے ان کا کمپیوٹر یوز کرنا تھا ناں.....! انہیں برا تو نہیں لگے گا.....؟“

ایمان نے اپنے مطلب کی بات کی۔

”یہ تو ولی بھائی ہی بتا سکتے ہیں ناں.....!“

اشعر کی زبان پر پھر خراش ہوئی تھی، مگر عاقب کی گھوری پہ منہ بند کر کے بیٹھ گیا۔

میرے بے خبر، میری بات سن
میری پلکوں سے میرے خواب چن
میری چاہتیں اور عنایتیں
تیرے نام تھیں تیرے نام ہیں
میرے دل کی ساری دھڑکنیں
بنا تیرے مجھ پر محال ہیں
میرے بے خبر
میرے بے خبر

اس کے چہرے پہ بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”گویا ”مسٹر چپ شاہ“ بھی محبت کے مریض نکلے؟“

اس کا تجسس بے تحاشا بڑھ گیا۔ ڈائری میں یقیناً اس لڑکی کا بھی ذکر ہوگا اسے دیکھنا چاہتے؟
ابھی وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ دروازہ کھول کر ولید حسن ماکانہ انداز کی مخصوص بے تکلفی سمیت اندر
چلا آیا۔ اسے سامنے پا کر وہ ایک دم ٹھنکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اپنی پرسنل ڈائری کی موجودگی نے یکا یک اس
کے چہرے اور آنکھوں سے حیرت کو اچک کر غم و غصہ اور تلخی میں بدل دیا۔
”کیا کر رہی ہیں آپ یہاں؟“

وہ اس کے سر پہ پہنچ کر غرایا تھا۔ ایمان ایک دم سے شپٹا سی گئی۔ بہر حال وہ ایک غیر اخلاقی حرکت کی
مرتب ہوئی تھی اور ان کے ہاتھوں پکڑی بھی جا چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا اعتماد ایک دم سے زائل ہو گیا تھا۔
ڈائری عجلت میں واپس رکھنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ کچھ بدحواس ہو کر
اٹھانے کو جھکی مگر اگلا لمحہ اسے ششدر کر دینے کو کافی ثابت ہوا تھا۔ ڈائری کی جلد سے چند تصویریں پھیل کر
کارپٹ پہ بکھر گئی تھیں۔ تینوں کی تینوں تصویریں ایمان کی اپنی تصویریں تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے غیر یقینی
کے عالم میں اپنی تصویریں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

”یہ..... یہ میری تصویریں.....؟“

وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ حیرانی کی جگہ غم و غصے نے لے لی تھی۔ دوسری جانب ولید حسن کا چہرہ بھی
بے تحاشا سرخ تھا۔ اس سرخی کی وجہ وہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ البتہ ناگواری کا احساس برقی رو بن کر پورے
بدن میں سرایت کرتا چلا گیا تھا۔

”آپ کیا سمجھ رہی ہیں یہ تصویریں میں نے آپ کے دیدار کی خاطر ڈائری میں محفوظ کی ہوئی ہوں
کی.....؟ محترمہ.....! کسی خوش فہمی کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل پرسوں تک یہ اشعر کے پاس
تھیں۔ وہ یہاں رکھ کر بھول گیا ہوگا۔ اتنی خوب صورت نہیں ہیں آپ کہ میں آپ کے عشق میں مبتلا پھر رہا
ہوں؟“ نہ ہی میرا دماغ اتنا ستیا ہوا ہے کہ میں.....“

”شٹ آپ.....! جھٹ آپ.....!“

زہر میں بجھے ہوئے تیر کی قدر تلخ، بھڑکے ہوئے لہجے میں وہ اس کی سماعتوں میں اتار رہا تھا کہ وہ
”اے اے! کات کر حلق کے بل چیخ پڑی۔ احساس تو ہیں نے گویا اسے یکنیت کسی جلتے لالہ میں پٹخ دیا تھا۔

”میں نے آپ سے کوئی وضاحت نہیں مانگی۔ سمجھے آپ.....؟“

وہ اسی بیجان زدہ آواز میں پھنکاری تو ولید حسن ایک لمحے کو جواب سا ہو گیا۔ اسے خود بھی ایک لمحے
لہ لہائی، اپنا اتنا شدید رومل فضول محسوس ہوا تھا مگر پھر سر جھٹک کر اس پہ ایک دہکتی نگاہ ڈالی تھی۔

”آپ کو میرے کمرے میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی.....؟ مجھے ہرگز کسی ایرے غیرے کا انٹر
لہ لہ لہ نہ نہیں ہے۔“

”یہ غلطی بہر حال مجھ سے ہوئی جس کے لئے شاید میں کبھی خود کو معاف کروں۔ ایکسپوزی.....!“
وہ اس کی سائیڈ سے کترا کر نکل رہی تھی جب ولید نے جھک کر کارپٹ پہ گری تصویریں اٹھا کر اس
لی مت اچھالیں۔

”انہیں بھی لیتی جائیے.....! میرے کمرے میں بہر حال ان کی گنجائش نہیں ہے۔“

ایمان نے اپنے پیچھے اس کی پھنکاری آواز سنی تھی مگر اسے بنا سے سرعت سے باہر نکلتی چلی گئی۔ اپنے
مرے میں آئی تو اس کے چہرے اور آنکھوں سے گویا بھاپ نکل رہی تھی۔

”اتنی انسلٹ.....؟ اتنی تو میں.....“

اس کا جی چاہانی الفور وہاں سے بھاگ جائے۔ مگر بے بسی سی بے بسی تھی، آنسو بند توڑ کر بہہ نکلے تھے۔ اتنا رونے کے باوجود جب دل کا غبار نہیں دھلا تو بنا سوچے سمجھے گھر سے نکل آئی۔

گنے کی فصل کے ساتھ جو پگ ڈنڈی تھی، اس پہ چلے گی۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو کچی سڑک کے بعد نہر کا کنارہ آگیا۔ سرسبز درختوں کی قطاریں دور تک جاری تھیں۔ اس کا دل بوجھل تھا۔ اتنی معمولی سی بات پہ ولید نے اتنا ٹیپر لوز کیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر تپتی رہی۔ دماغ میں جیسے دھواں بھرتا جا رہا تھا۔

نہر کا کنارہ ویران تھا۔ کسی درخت پہ بیٹھی کوئل کی کوک وقفے وقفے سے فضا میں گونجتی تو اس کی سوچوں کا تسلسل بکھر جاتا۔ ہر بار چونکنے پہ آنکھوں میں نمی کا احساس ہوتا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ آج سے قبل کسی نے کبھی اتنی توہین کب کی تھی؟

وہاں بیٹھے جانے کتنی دیر گزری تھی، ڈوبتے سورج کا عکس نہر کے پانی کا رنگ تبدیل کرنے لگا۔ تب وہ چونکی۔ یہاں مزید ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ نہر کے ساتھ موجود کچی سڑک پہ اب کھیتوں میں کام کرنے والے تھکے پارے کسانوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس کے پاس سے گزرتے دیہاتیوں کی نگاہوں میں استعجاب و تجسس اور دلچسپی تھی۔

جنرل شرت میں ملبوس فیشن ایبل لڑکی گویا مفت کی تفریح کا سامان تھی۔ وہ احساس ہوتے ہی گھبرا کر جلدی سے اٹھ گئی۔ غصے میں وہ شال اوڑھے بغیر نکل آئی تھی۔ اب اس پہ اٹھنے والی نگاہوں میں جو تھا، وہ مضطرب کر دینے کو کافی تھا۔ گھر جانا ان کو منظور نہیں تھا، مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا.....؟

”مجھے پاپا کو فون کرنا چاہئے.....!“

اس نے سوچا۔

”مگر وہ مجھے بھی نہیں لے جائیں گے۔“

اگلے ہی لمحے خود اپنی ہی سوچ رد بھی کر دی۔

”مجھے ہر گز یہاں نہیں رہنا۔ میں یہاں سے بات کرتی ہوں۔ چاہے اس کے گھر رہوں، چاہے ہاسٹل میں، یہاں سے جانا ہے۔“

وہ فیصلہ کر کے ہی گھر واپس آئی تھی مگر ابھی گھر سے کچھ فاصلے پہ تھی جب تیزی سے ولید اپنی سمت آتا نظر آیا۔ اس نے یوں سرعت سے نگاہ کا زاویہ بدلا جیسے غلطی سے کسی حرام شے پہ جا پڑی ہو۔

”کہاں تھیں آپ.....؟ گھر والوں کی پریشانی کا بھی کچھ اندازہ ہے آپ کو.....؟“

وہ نزدیک آتے ہی برس پڑا تھا۔ ایمان کا دماغ اس لعن طعن پہ الٹ کر رہ گیا۔

”شت آپ.....! تم ہوتے کون ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والے.....؟ اپنا راستہ ناپو۔ سمجھے.....؟“

اس نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے، اپنی طرف سے اس کا منہ توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور اس کے تاثرات دیکھے بغیر بھاگتی ہوئی گھر کے اندر گھس گئی۔ مگر پہلے ہی مرحلے پہ گویا چکرا کر رہ گئی۔

ماما صحن میں ہی چار پائی پہ بیٹھی تھیں۔ تائی ماں ان کے ہاتھ پکڑے پتا نہیں کس بات پہ تسلی سے نواز رہی تھیں۔ فضا برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے پریشان نظر آئی تھی۔ مگر اس پہ نگاہ پڑتے ہی تینوں ایک

انہماں لی سمت لپکیں تھیں۔ ماما تو اسے گلے لگا کر زور زور سے رونے لگی تھیں۔

وہ کسی قدر حراساں ہو گئی اور اس وحشت بھرے انداز میں ان کے ہاتھ جھٹک کر الگ ہوتے ہوئے بہائی سے بولی تھی۔

”کیا ہوا ماما.....؟ آپ رو کیوں رہی ہیں.....؟“

”تمہاری وجہ سے.....! کہاں چلی گئیں تھیں تم.....؟“

جواب ماما کی بجائے فضا نے دیا تھا اور اس کا موڈ یکا یک بگڑ گیا۔

”حد ہو گئی.....! میں کوئی بچی تھی جو گم ہو جاتی.....؟ ماما.....! آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ فار گاڈ! چپ تو کریں۔“

اس کے لہجے میں برہمی و تخی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ فضا ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”آخر گئی کہاں تھیں تم.....؟ بتانا تو چاہئے تھا.....؟ نئی جگہ ہے، ہم تو تمہیں گھر میں نہ پا کے اتنے ایمان ہو گئے تھے۔ عاقب، اشعر اور ولید تمہیں ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے۔“

فضا کی بات پہ اسے آگ سی لگ گئی تھی۔ اس نے شعلہ بار نظروں سے موبائل پہ مصروف ولید کو دیکھا تھا اور طنز میں لپٹے سرد لہجے میں پھنکار کر بولی تھی۔

”بہی تو پوچھ رہی ہوں، کیوں ڈھونڈنے نکلے وہ مجھے.....؟ اور خاص طور پہ یہ.....؟ لگتے کیا ہیں یہ.....؟“

اس نے اُنکی اٹھا کر ولید کی سمت اشارہ کیا۔ انداز میں حقارت کا عنصر نمایاں تھا۔ فضا کا تو شرمندگی و ثبات سے سرنہ اٹھ سکا۔

”ایک تو بیچارے اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور یہ.....!“

اس نے دانت پیسے۔

”ایمی.....! بد تیزی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بہت بڑے میں ولید بھائی تم سے۔“

فضا نے ڈانٹا۔ اور وہ آپے سے باہر ہونے لگی۔

”میرا کوئی تعلق نہیں ہے کسی بھی فضول آدمی سے، سمجھیں تم.....؟ اور میں جاری ہوں، ابھی اور اس.....! اسی کو میری تلاش میں نکلنے کی ضرورت نہیں.....!“

ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہتی وہ ایک جھٹکے سے سرڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ وہ سب ششدر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے، سوائے ولید کے۔ وہ لب بھینچے، سر جھکائے کھڑا تھا۔

”اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی جا کے پوچھتی ہوں اسے تو میں۔“

فضا بھڑکے ہوئے انداز میں کہہ کر سرڑھیوں کی سمت لپکی تھی کہ کچھ خیال آنے پہ بے اختیار رُک گئی اور اُفت بھرے انداز میں ولید حسن کو دیکھا تھا جو ہنوز ہونٹ بھینچے، سر جھکائے کھڑا گویا کسی سوچ میں گم تھا۔

”آئی ایم سوری ولید.....! اس کی طرف سے میں آپ سے ایک کمبوز.....“

”پلیز.....! پلیز فضا.....! شرمندہ مت کریں اور ایمان کو بھی ڈانٹنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آل ریڈی

آپ سیٹ ہے۔“

اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے دوسرا فقرہ مکمل کیا تھا۔ فضا کی خفت مزید بڑھ گئی۔

”آپ سب لوگ بہت اچھے ہو، مگر وہ.....“

اس کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے نم ہو گئی۔ ولید نے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر آگے بڑھ کر نرمی سے اس کا سر تھپکا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایمان کو بھی میں سمجھا دوں گا۔“

”مگر وہ پتا نہیں کیا ٹھان بیٹھی ہے.....؟ ضدی بہت ہے۔ اب پتا نہیں کہاں جانے کو تیار ہے.....؟ کیسے روکوں گی اسے.....؟“

وہ مضطرب سی ہو کر بولی تو ولید نے چونک کر اسے دیکھا۔ عین اسی بل وہ اپنے بیگ سمیت سر میوں سے برآمد ہوئی۔

ولید کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا تو ہونٹ بھیجنے لڑے۔

”فضا.....! آپ جچی جان کو اور اماں کو لے کر اندر چلیں، انہیں میں دیکھ لوں گا۔“

اس نے جیسے ایک ایکی فیصلہ کیا تھا اور فضا کو مخاطب کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ فضا پریشان کن نظروں سے ایمان کو دیکھ رہی تھی، ٹھنک کر متوجہ ہوئی۔

”مم..... مگر وہ.....“

اس نے پھر اسی مدہم لہجے میں کہا تھا۔ فضا بے بسی سے اسے دیکھ رہی گئی۔ ولید مضبوط قدم اٹھاتا اس کی سمت بڑھ آیا تھا۔ ایمان اس کے پاس سے نظر انداز کرتی گزرنے کو تھی، جب ولید نے کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ جو اپنے دھیان میں آگے بڑھ رہی تھی، اس مداخلت پر لہرا کر دو قدم پیچھے گھسٹ کر گرتے گرتے اسی کی وجود کے سہارے سنبھلی تھی۔ ولید کے اطمینان ذرا فرق نہیں آیا، جبکہ اس کی اس درجہ بڑھی ہوئی جسارت نے ایمان کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے پہلے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا پھر سنبھلتے ہی پھکار ڈرہ لہجے میں بولی تھی۔

”ہاؤ ڈیر یو.....! اپنی حد میں رہو.....! مجھے.....“

”آئی ایم سوری.....!“

وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

”سوری.....؟ فار واٹ.....؟“

وہ بھڑک اٹھی تھی۔

”مجھے آپ کے ساتھ ایسا بی بیو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگین سوری.....!“

وہ اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایمان نے ہونٹ بھیجنے لڑے۔ اس کی جلتی آنکھوں پہ نئے سرے سے نمی چکنے لگی۔

”میرے راستے سے ہٹو.....!“

وہ نامی دیر کے بعد بولی تھی۔

”آپ مت جائیے.....! میں نے ایکسکوز کیا ہے ناں آپ سے.....؟“

وہ اسی قدر آشفتگی سے بولا۔

”میں اپنے مجرموں کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کر سکتی۔“

”میر کیا کرنا پڑے گا مجھے.....؟“

ان بڑی بڑی آنکھوں میں اضطراب در آیا۔ ایمان نے ایک نظر دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

”اتنا انوالو کیوں ہو رہے ہو.....؟“

”آپ میری وجہ سے گھر چھوڑ کر جائیں، مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔ آپ بتائیے ناں.....! مجھے

اپنا لانا لے کر کیا کرنا ہوگا.....؟“

”آئندہ مجھے سے بات مت کرنا۔ میں نے کہا ناں.....! میں اپنے مجرم کو اتنی آسانی سے معاف نہیں

پارہتی۔“

اس نے کسی قدر نخوت سے کہا اور بیگ وہیں چھوڑ کر دوبارہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ وہ ہونٹ بھیجنے اسے

ہاتے دیکھتا رہا تھا۔

”تھینک گاڈ.....! وہ مانی تو.....؟ ورنہ مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔“

”آپ نے واقعی معرکہ مارا ہے ولید بھائی.....!“

فضا جو کچھ فاصلہ پہ کھڑی دم سادھے کسی فیصلے کی منتظر تھی، چپکتی ہوئی نزدیک آ کر بولی۔ وہ چونکا تھا

اور نامی سے نظروں سے اسے دیکھ کر کچھ کہے بغیر پلٹ کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کون جانتا تھا کہ اس نے آج کے دن مزید کیا کیا کھودیا تھا.....؟

پھر کتنے سارے دن گزر گئے۔ وہ خود کو دانستہ محدود کر چکی تھی۔ پہلے جو اشعر کے ساتھ کچھ دوستی ہوئی

میں..... وہ بھی اس تلخی کی نظر ہو گئی۔ فضا نے متعدد بار اسے اکسایا کہ وہ اس کے ساتھ اس کی دلچسپیوں میں شریک

ہو، اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

اس وقت بھی وہ ایسے ہی اپنے کمرے میں گھسی بیٹھی تھی جب کوئی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ سیل

میں گیم میل رہی تھی۔ سرسری سامتوجہ ہوتی، مگر اپنے سامنے حرا آپ کی کو دیکھ کر مروتا مسکرانا پڑا۔

”بیٹھے ناں.....! کیسی ہیں آپ.....؟“

اس نے سیل فون ایک سائید پہ رکھ دیا تھا۔

میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تم نظر ہی نہیں آتیں.....؟ کل بھی شام کو فضا آ گئی تھی، اشعر اور عاقب کے

ساتھ، تم یہیں نہیں آئیں.....؟“

وہ اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئیں تھیں۔

”بس یوں ہی.....! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“

”اس دن تم نے ولید بھائی کی بات مان لی.....؟ مجھے قطعی امید نہیں تھی۔“

”جانا بھی کہاں تھا.....؟ ہم اپنا ٹھکانہ ہی نہیں، اپنی عزت نفس بھی شاید کھو بیٹھے ہیں.....؟ مجھے سرنڈر

لرنا ہی تھا.....؟“

اس کی آواز پہ آنسوؤں کا غلبہ تھا، فضلہ نے محسوس کیا تو تڑپ کر اسے گلے لگا لیا۔

”ایمی.....! ایمی.....! میری جان.....! کیوں اتنی معمولی باتوں کو جان کا روگ بنا رہی ہو.....؟“

فضلہ کی اپنی آواز بھی بوجھل ہونے لگی تھی۔

”مجھے لگ رہا ہے میں مرجاؤں گی۔ بہت ٹھٹھن ہو رہی ہے میرے اندر۔ پاپا نے بہت زیادتی کی ہے

ہمارے ساتھ، ہم سے ہماری انا چھین کر۔ دو ٹکے کی حیثیت ہو کر رہ گئی ہے۔ ورنہ کس کی جرأت تھی اتنی کہ ایمان

ارتضیٰ کی انسٹ کی جاتی اور وہ اسے بخش دیتی.....؟ مگر اب ہماری حیثیت اور ہے۔“

”کیا ہوا ہے ایمی.....؟ کسی نے کچھ کہا تمہیں.....؟ کس نے.....؟“

فضلہ ٹھٹھ کر رہ گئی تھی۔ اس کے لہجے میں غیر یقینی اضطراب تھا۔ ایمان ایک دم سنبھلی۔ وہ اتنی خودار

تھی۔

اپنی انا اتنی عزیز تھی کہ اپنی اس انسٹ کا احوال وہ اپنی ماں جانی سے بھی نہیں کہہ پائی تھی۔

”کچھ نہیں.....! بس یوں ہی.....!“

اس نے پھر سے خود کو مضبوط کر لیا۔

”تم کچھ چھپا رہی ہو.....؟“

فضلہ مشکوک ہوئی۔ مگر وہ ٹال گئی تھی۔ اور جس پل وہ تیار ہو کر سیڑھیوں سے نیچے اتر کر آئی، سب

سے پہلے سامنا تائی ماں سے ہی ہوا تھا، جنہوں نے اس کے نازک سراپے پہ ایک پیار بھری نگاہ ڈالی تھی۔ پھر

بے ساختہ لپٹا کر چٹاٹ پیار کیا تھا۔

”ماشا اللہ.....! دیکھ تو میری دھی کتنی سوئی لگ رہی ہے۔ پتر.....! ایسے ہی کپڑے پہنا کر میری

دھی.....!“

انہوں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ قطعی نہیں سمجھ سکی، البتہ ان کی محبت کے مظاہرے پہ بے زار ضرور

ہو گئی تھی۔ جیسی ان سے الگ ہو کر فاصلے پر ہوتی ہوئی بولی تھی۔

”آپ تیار نہیں ہوئیں.....؟ کب تک جانا ہے.....؟“

اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی رکھائی اور انداز میں بے زاری اور اکتاہٹ تھی، مگر تائی ماں

نے اپنی فطری سادگی میں سرے سے محسوس نہیں کیا تھا۔

”ناں پتر.....! میں وہاں جا کے کیا کروں گی.....؟ تم لوگ چلے جاؤ.....! میں گھر پہ رہوں گی،

تیرے ماؤ اور دادا کے پاس.....!“

وہ ابھی بھی اسے پیار بھری لگاؤٹ آمیز نظروں سے تک رہی تھیں۔ ایسی نظریں جن میں محبت کے

۲۰ تے بہوتے تھے، جن میں شفقت تھی، مانتا تھی۔ اسے جھلاٹ محسوس ہونے لگی تو کچھ کہے بغیر دادا کے

اس نے بہانہ گھڑا۔ مگر گویا پھنس گئی کہ وہ فوراً الٹ ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا.....؟ بخار تو نہیں ہو رہا.....؟ دکھاؤ تو.....!“

وہ اس کی پیشانی چھو کر دیکھنے لگیں۔

”سر میں درد تھا آپا.....! وہ بھی کل ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ آپ سنا بیٹے ناں.....! بچے کیسے ہیں.....؟“

وہ ان کا دھیان بنانے کو موضوع بدل گئی۔

”سب ٹھیک ہیں۔ بچے اپنی چھوٹی خالہ کو یاد کر رہے تھے۔ بھئی.....! وہ سب تو تمہارے دیوانے

ہو گئے ہیں۔“

وہ ہنس کر بتا رہی تھیں۔ ایمان بے دلی سے مسکرا دی۔ پھر ان کا دل رکھنے کو بولی تھی۔

”بہت پیارے بچے ہیں آپ کے۔ لائیے گا انہیں.....!“

”ارے.....! اب انہیں نہیں، تمہیں آنا ہے۔ میں خاص دعوت دینے آئی ہوں۔ ویسے تو تم نے آنا

نہیں ہے.....؟“

”ارے نہیں.....! میں آؤں گی آپا.....!“

وہ خفیف سی ہو کر وضاحتیں دینے لگی۔

”سوسو بار آنا، مگر کل تو لازماً آنا ہے، ورنہ میں روٹھ جاؤں گی تم سے۔“

وہ اس سے وعدہ لے کر ہی اٹھی تھیں۔ وہ ان کے خلوص کی قائل ہو کر رہ گئی۔ مگر اگلے دن وہ سرے

سے بھول بھی گئی تھی۔

”تم کون سے کپڑے پہن کر جاؤ گی.....؟ نکال دو استری کر دوں۔“

وہ ابھی نہا کر نکلی تھی، تو لیے سے بال خشک کرتے چونک گئی۔

”کہاں جانا ہے.....؟“

”حرا آپا کے گھر دعوت پہ.....! بھول بھی گئیں کیا.....؟“

فضلہ کے کہنے پہ اس نے گہرا سانس کھینچا تھا۔ اگر وعدہ نہ کر لیا ہوتا تو لازماً انکار کر دیتی۔

”کوئی سے بھی کر دو اپنی مرضی سے.....!“

اس نے رکھائی سے کہا اور برش اٹھا کر بال سلجھانے لگی۔ فضلہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا۔

وہ بہت نجھی نجھی سی نظر آرہی تھی۔ ابلے چہرے کی تمام باذبت جیسے اُداسی کے گھمبیر پردے میں جا چھپی تھی۔

”کیا بات ہے ایمی.....؟ اتنی خاموش کیوں رہنے لگی ہو.....؟“

”خوش ہونے والی کوئی بات بھی تو نہیں ہے.....!“

اس نے ترخ کر کہا تھا۔ فضلہ نے کچھ کہے بغیر اس کے لئے الماری سے اسکن براؤن اور میرون کبی

نیشن کا ملتان سوٹ نکالا جس کی شرٹ کے دامن اور دوپٹے کے پلوؤں پہ بہت خوب صورت بلوچی کڑھائی تھی۔

یہ سوٹ پاپا پچھلے سال اسلام آباد سے اس کے لئے لائے تھے، جسے ایمان نے صرف ایک بار پہنا تھا اور وہ اسے

پہن کر بہت کیوٹ لگی تھی فضلہ کو۔

کمرے میں کونکوں کی انگلیٹھی ان کے بستر کے پاس ہی پڑی رہتی تھی۔ اس وقت بھی انگلیٹھی میں کونکے دھک رہے تھے۔ دادا اپنے لحاف میں بیٹھے تسبیح پڑھنے میں مشغول تھے۔ اسے دیکھا تو شفقت سے مسکرا دیے۔

”آؤ پتر.....! آؤ میری سوئی دھی.....!“

انہوں نے اسے دیکھ کر تسبیح سائیڈ پر رکھ دی۔

”تو بالکل اپنے باپ کی تصویر ہے۔ تجھے دیکھ کر مجھے ارتضیٰ کی جوانی یاد آ جاتی ہے۔ وہ بھی اتنا ہی سو ہناتا تھا۔“

وہ ان کے پہلو میں بیٹھی تو دادا نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھر کے مدہم لرزتی آواز میں کہا۔ اس نے دیکھا کہ ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”پاپا آپ سے ملنے بھی نہیں آتے تھے.....؟“

اسے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ ہوا تو پاپا پر غصہ آنے لگا۔

”بڑا آدمی بن گیا ہے۔ اسے فرصت کہاں ہے.....؟“

وہ مسکرائے۔ ان کے لہجے میں نارسائی کی سلگن تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر ان کے لحاف کے ڈیزائن کو گھورنے لگی۔

”میری دھی کا دل تو لگ گیا ہے ناں یہاں.....؟“

دادا کے سوال پر وہ محضے میں پڑ گئی۔ بیچ میں بول کر وہ ان کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ جیسی سر کو اثبات میں جنبش دی تھی اور دادا کو تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔

”میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔ میری پتری کا دل بھی یہاں لگے گا۔ ارے بھی.....! ناخنوں سے ماس الگ ہوا ہے کبھی.....؟“

وہ جوش و خروش سے بولتے ہوئے ہنسنے لگے۔ ایمان بس انہیں خوش دیکھ کر مسکرا دی۔

”تیرے باپ کا خیال تھا میری بیٹیاں یہاں نہیں رہ سکتیں۔ دیکھا ناں.....! غلط سوچتا تھا وہ.....! اب اسے پتا چلے گا تو کتنا حیران ہوگا۔“

وہ اس سرخوشی کی کیفیت میں کہہ رہے تھے۔

”پاپا کو پتا تھا ہم یہاں خوش نہیں رہ سکتیں، پھر بھی پاپا نے ہمیں یہاں بھیج دیا، کوئی بھی اسٹراک ریزن دیئے بغیر۔“

اس کے اندر فشارِ خون بڑھنے لگا۔

”فضہ تو گھل مل گئی ہے سب سے۔ میری بہت خدمت کرتی ہے۔ اللہ اس کا نصیب سوہنا کرے۔ تو مجھے بتا پتری.....! تجھے یہ سب لوگ کیسے لگے.....؟“

دادا کے اگلے سوال پر وہ اپنی سوچ کے جنگل میں بھٹکتے چوکی تھی اور ایک سرد آہ بھری۔

”اچھے ہیں.....! دادا.....! سب اچھے ہیں۔“

”کیا حرج ہے اگر آج میں کسی کا دل رکھنے کو تھوڑا سا جھوٹ بول دوں گی تو.....؟“

اس نے خود کو ڈھارس دی۔

”اور ولید.....؟ ولید کیسا لگا تمہیں.....؟“

اس نے بہت بری طرح سے چوٹ کر دادا کو دیکھا اور اس سوال کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کا

ماں لفظ بھر کو جیسے تن سا گیا تھا۔ اب وہ دادا کا دل رکھنے کی خاطر بھی جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

مجھے نہیں پتا دادا.....! آپ کس سنیں میں یہ سوال مجھ سے کر رہے ہیں.....؟ مگر میں کسی بھی لحاظ سے

اس بندے کو پسند نہیں کرتی۔ ویسے بے فکر رہیں، میں عاقب بھائی اور اشعر کے متعلق اچھے خیالات رکھتی

”اں۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے بہت واضح اور مدلل انداز میں کہا تھا۔ دادا کو اس کی پوری بات تو

بمبہ نہیں آئی، مگر وہ یہ نتیجہ ضرور اخذ کر گئے کہ وہ ولید کے لئے اچھے جذبات نہیں رکھتی۔ ان کا بوڑھا چہرہ ایک دم

بمبہ لر رہ گیا۔

”شاید آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی.....؟ آئی نو کہ آپ اسے بہت پسند کرتے ہیں مگر.....“

”آپ کی دوا کا ٹائم ہو گیا ہے دادا.....! انھیں دوا لے لیں۔“

عین اسی پل ولید بولتا ہوا اندر آیا تھا۔ ایمان کی بات اُدھوری رہ گئی۔ اس نے ہونٹ بھیجنے کر چہرے کا

زخ پھیر لیا، جبکہ ولید اسے وہاں دیکھ کر چونکا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے نارٹل سے انداز میں آگے بڑھ کر دادا کی

”انہیں الماری سے اٹھانے لگا۔“

”میں چلتی ہوئی دادا.....!“

وہ اس کے نزدیک آنے سے قبل اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے جانب نگاہ کئے بغیر ہی پلٹ کر باہر چلی

گئی۔ ولید جو اس کے یوں اٹھ کر چلے جانے پر ہونٹ بھیجنے کھڑا تھا، دادا کی آواز پر چونکا۔ جو دوا کھانے سے

اب ہار پھرانکا کر رہے تھے۔

”یہ تو آپ کو کھانا ہوتی ہیں دادا.....! کیوں ضد کرتے ہیں بچوں والی.....؟“

وہ بھی جانے کس موڈ میں تھا کہ جھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔

”بچوں والی ضد ہو یا بوڑھوں والی، میں نے نہیں کھانی، تجھے کہا ناں.....! چل بھاگ اب ادھر

.....“

دادا کی بد مزاجی آج پھر عروج پر تھی اور ایسا ہمیشہ تب ہوتا تھا جب وہ اُداس ہوتے تھے۔ ولید نے

کمرہ لڑائیں دیکھا اور گہرا سانس کھینچا۔

”کیا باتیں کر رہے تھے آپ اس سے.....؟ منع بھی کیا تھا آپ کو مگر.....“

وہ بات اُدھوری چھوڑ کر ضبط کی کوشش میں ہونٹ بھیجنے کر سر جھٹکنے لگا۔

”اُھہ بھی تو.....“

حرا آپا آبدیدہ ہونے لگیں۔

”افوہ.....! میں سمجھاؤں گا، لگا لے گا پھر۔ مقصد تو ملنا ہوتا ہے ناں.....! وہ نہ سہی، تم آجاتی ہو۔“

عاقب حسن نے کسی قدر سبھاؤ سے کہا تھا۔ ایمان اس بات چیت، اس ماحول سے اکتانے لگی۔

چائے پی لی گئی۔ برتن اٹھا کر ثانیہ باہر چلی گئی۔ اب کمرے میں حدت آمیزی کا احساس تھا۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایمان خاموش بے زاری بیٹھی رہی۔ موضوع گفتگو ثانیہ کی شادی تھی جو اگلے مہینے کی کسی تاریخ میں طے پائی تھی۔ ان دنوں اس کا جہیز تیار کیا جا رہا تھا۔ ثانیہ شرماتی لجاتی بیٹھی تھی۔ چہرے پہ ایک مستقل مسکان تھی، جس نے اس کے عام سے نقوش کو بھی ایک انوکھی سی چمک بخش دی تھی۔

”بہت اچھی ہے ثانیہ.....! بہت فرمانبردار.....! سارا کچھ میں نے اپنی پسند سے خریدا ہے۔ اماں اور اسلم (حرا آپا کے شوہر) نے مجھے ہی سارا اختیار سونپا ہوا ہے۔ میں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سونے کا سیٹ بنوایا ہے، جہیز میں دو بیٹیاں، کپڑے دھونے کی مشین، کپڑوں کی الماری دے رہے ہیں۔ ایسا شاندار جہیز ہوگا کہ دنیا دیکھے گی۔“

حرا آپا خود ہی اپنی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں۔ ایمان کی ہنسی چھوٹنے لگی۔ جبکہ ماما اور فضا اس کے برعکس بڑی سنجیدگی سے سن رہی تھیں۔

”اب تھوڑی بہت چیزیں رہ گئیں ہیں یا پھر کپڑے وغیرہ۔ میں نے تو ثانی سے کہا ہے کم از کم کپڑے تو اپنی پسند کے بنالے، پرمانتی ہی نہیں ہے۔ کہتی ہے بھالی.....! مجھے آپ کی پسند پر بھروسہ ہے۔ ایک دوسوٹ میں نے خرید لئے ہیں، بٹھریں، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔“

اس نے لمحے بھر کا توقف کر کے ثانیہ کو اشارہ کیا وہ لپک جھپک دوسرے کمرے سے ایک شاپر اٹھا لائی۔ جنہیں کھولا گیا تو ایسے سوٹ برآمد ہوئے جن کی چمک دمک آنکھوں کو چھتی تھی۔ تیز چنگھاڑتے رنگ اور ہلکا سا کپڑا۔ مگر آپا بڑے فخر سے دکھا رہی تھیں۔

”اچھے میں ناں.....؟“

انہیں ان کی رائے کی بھی ضرورت تھی۔ ایمان نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ البتہ فضا کو تعریف کرنا پڑی تھی۔

”یہ دونوں ہی باجیاں بہت سوئی ہیں۔ ان کے کپڑے بھی بہت اچھے ہیں۔ بھابھو.....! ان جیسے بھی کچھ جوڑے مجھے منگوا دو ناں.....!“

کچھ دیر بعد ثانیہ نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا تو ایمان نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا اور کچھ فاصلے پر بیٹھے اشعر کا کاندھا ہلکا کر متوجہ کیا۔

”جناب.....!“

وہ اسے دیکھتے ہی باخبر ہو کر بولا۔ مگر ایمان کا موڈ ہنوز تھا۔

”ہم کب واپس چلیں گے.....؟“

”ارے.....! اتنی جلدی.....؟ ابھی تو کھانا بھی نہیں کھایا۔ پھر اس کے بعد بھی مشکل ہے کہ آپا آپ لوگوں کو جانے دیں۔ ویسے آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے واپسی کی.....؟ جبکہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کو گھر کی یاد آرہی ہے کیا.....؟ یا گھر میں موجود کسی خاص ہستی کی.....؟“

اشعر کے لہجے میں بے معنی سی، معصوم سی شرارت تھی، مگر ایمان کی حالت بری طرح سے بگڑ گئی۔ دھڑکنیں ناگواری کے احساس سمیت جھنجھکیں۔ اسی لحاظ سے موڈ بھی برہم ہوا تھا۔

”مانسڈاٹ.....! نہ تو تمہارا گھر اتنا پڑ آسائش ہے اور نہ ہی وہاں موجود لوگوں میں سے کسی سے میرا ایسا قلبی لگاؤ کہ میں اس کی کو محسوس کرتی بے چین ہو کر واپسی کا سوچوں.....؟ میں اس اوپرے ماحول سے اکتا گئی ہوں۔ تنہائی چاہ رہی ہوں۔ اینڈ دیٹ سیک.....!“

بغیر کسی لحاظ کے اس کا لہجہ درشت ہی نہیں تلخ اور برہم بھی تھا۔ شدید اشتعال کے باعث اس کی آواز بھی اونچی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے آپا کے ساتھ ساتھ فضا، ماما اور عاقب نے بھی چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

”کیا ہوا.....؟“

عاقب نے اس کا لال بھوکا چہرہ دیکھ کر اشعر سے استفسار کیا تھا جو بے تحاشا خجالت محسوس کرتا ہونٹ پکل رہا تھا۔

”کچھ نہیں بھئی.....!“

وہ بولا تو اس کی آواز بے حد مدہم تھی۔

”کچھ تو کیا ہوگا تم نے.....؟ ایویں تو ایویں کو غصہ نہیں آیا.....؟ لاکھ بار سمجھایا ہے، سوچ سمجھ کر بولا کر.....!“

آپا اسے بے دریغ ڈانٹنے لگیں۔ ماما حیران تھیں جبکہ فضا کی تنبیہی نظریں ایمان پہ آٹھری تھیں جو سختی سے ہونٹ بھینچنے جانے کیسے ضبط کے مراحل طے کر رہی تھی۔ آج کے دن میں اس ناپسندیدہ شخص کے حوالے سے دوسری بار اس کا موڈ خراب ہوا تھا، جس کے بارے میں سوچ کر ہی اس کی سوچیں سلگنے لگتی تھیں۔ اسے صاف لگا تھا جیسے درپردہ اشعر نے ولید کا حوالہ دے کر اسی پہ کچھ جتنا چاہا ہے۔ اشعر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب کہاں جا رہے ہو.....؟“

عاقب کی پکار پہ اس نے پلٹے بغیر اک لفظ کہا تھا۔

”گھر.....!“

اور دروازے سے نکل گیا۔

”ہائے میں مر گئی۔ لگتا ہے میرا دیر ناراض ہو گیا ہے.....؟“

حرا آپا نے گڑبڑا کر کہا اور اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگیں۔

”میں دیکھتا ہوں اسے۔ بہت بدتمیز ہو رہا ہے۔“

عاقب بھی اٹھ کر ان کے ساتھ لپکا۔ ماحول ایک دم کشیدہ ہو گیا تھا۔ فضا نے انتہائی ہمتی نظروں سے

”کیوں ہتھے سے اکھڑ جاتی ہو معمولی باتوں پہ.....؟ اپنے جذبات کو کنٹرول کرنا سیکھو ایمان.....! زندگی میں انسان کو ہر قسم کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس طرح انسان تماشہ بن جایا کرتا ہے۔“

”مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں.....! میرا دماغ پہلے ہی بہت خراب ہو رہا ہے۔“

وہ چیخ پڑی۔ ماما نے فضلہ کا ہاتھ دبا کر گویا اسے خاموش کرایا تھا۔ وہ ہونٹ بھیجنے گویا خود پہ ضبط کرنے کی کوشش میں مصروف ہوئی۔ اگلے چند لمحوں میں ہی آپا اور عاقب روٹھے روٹھے سے اشعر کو ساتھ لیتے واپس آئے تھے۔

فضلہ نے جلدی سے اسے اپنے برابر جگہ دی۔ وہ یوں ہی منہ پھلائے بیٹھ گیا تھا۔

”آئی ایم سوری.....! فار دیٹ.....!“

فضلہ کی سرگوشی پہ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”آپ تو بہت اچھی ہیں، ڈونٹ وری.....! میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔“

”تھینکس.....!“

فضلہ ایک دم ریلیکس ہو گئی۔ پھر دانستہ وہ اشعر سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھی۔ ایسے ہی ماحول میں کھانا کھایا گیا جسے بہتر بنانے میں آپا، ان کے شوہر، فضلہ اور عاقب کی کوششیں شامل رہی تھیں۔

”فضلہ..... بگلو.....! اگر تم لوگ کافی پیٹے ہو تب بھی بتا دو، ورنہ میں چائے بنا لاتی ہوں۔“

کھانے کے بعد آپا نے کہا تھا۔ فضلہ کی سوالیہ نگاہیں ایمان کی سمت اٹھیں مگر اس نے بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا۔

”اب چلیں.....!“

”ہائیں.....؟ اس وقت.....؟ نہ دھی رانی.....! اس وقت جوان کڑیوں کو باہر نہیں نکالتے ہم لوگ۔“

چور لیبرے راہوں میں بیٹھے ہوتے ہیں، صبح جانا اب تم۔

آپا کی ساس نے بے اختیار مداخلت کی تو آپا ہنس پڑی تھیں۔

”ہاں ہاں.....! بالکل.....! ویسے بھی میں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔ کچھ دن تو رہو ہمارے ساتھ.....! ہم تمہیں اپنا گاؤں دکھائیں گے، باغات اور فصلوں کی سیر کرائیں گے۔“

ایمان کو وہاں رہنے کے خیال سے ہی بے چینی ہونے لگی۔ مگر دانستہ کچھ کہنے سے گریز کیا۔

”بھئی یہ تو فاول ہے، آپ لوگ تو ہمارے مہمانوں پہ قبضہ جمانے کی بات کر رہے ہیں، جس کی ہم ہرگز اجازت نہیں دے سکتے.....؟“

عاقب نے مسکرا کر کہا۔ اس کی نگاہ بہت خاص انداز میں فضلہ کی طرف اٹھی تھی اور فضلہ کی مسکراہٹ بھی حیا بار تھی یا ایمان کو لگا، اس کا دل گھبرانے لگا۔

”چل دے.....! وڈا آیا مہمانوں والا.....؟ ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا تمہارا، ہمارے بھی چاہنے کی فیملی ہے۔ جانا ہے تو جاؤ، ورنہ بھلے تم بھی یہیں سو جاؤ۔ جگہ کی قلت نہیں ہے۔“

حرا آپا نے عاقب کو ڈانٹ دیا تھا۔ وہ کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ابھی تو جا رہے ہیں، مگر کل ضرور آئیں گے اپنے مہمانوں کو لینے کے لئے۔ اور کل یہ زبردستی نہیں چلے گی، ابھی بتا دیں۔“

عاقب کے انداز میں معصومیت تھی۔ اس بار دانستہ ایمان نے دونوں کے تاثرات نوٹ نہیں کئے۔

”وے نکلے.....! ضرور آنا تو بھی۔ ورنہ میں سمجھوں گی تو اپنی آپا سے ناراض ہے۔ ہو سکے تو ولید کو بھی لے آنا۔“

آپا انہیں رخصت کرنے باہر تک بولتی ہوئی گئی تھیں۔ ایمان نے لیٹنے ہی کروٹ بدل لی۔ اس کا دل ہی نہیں، دماغ بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ جیسی اس نے پہلے پاپا کی کال ڈسکنٹ کی تھی پھر نیہاں کی۔ اس پل وہ خود سے بھی خفا تھی، جیسی کسی سے بات بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

سفیدے کے درختوں سے گھری نیم پختہ سڑک پر ڈھلتی ہوئی شام کے رنگ اتر آئے تھے۔ کچھ سرمئی بادلوں کی وجہ سے بھی تاریکی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔ کچھ تو موسم ہی سخت سردی کا تھا اور پھر صبح سے متواتر برستی بارش۔ جہاں تک نگاہ جاتی کہہ رہی کہہ رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی ضد کر کے باہر نکل آئی تھی۔

کھیت ویران تھے۔ اگر کوئی کسان وہاں تھا بھی تو اپنی کنیا میں لحاف اوڑھے ٹھہر رہا ہوگا۔ اپنے ساتھ اس نے ثانیہ کو بھی آزمائش میں ڈالا ہوا تھا کہ فضلہ نے تو اس کے ساتھ آنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

باہر نکلتے ہی ٹھنڈی صبح ہوا کے جھونکے جیسے ہی اس سے ٹکرائے تھے، اسے تب سے ہی چھینکیں شروع ہو گئی تھیں جواب بھی وقفے وقفے سے آرہی تھیں۔ ثانیہ تو شاید عادی تھی اس موسم کی شدت کو سہنے کی، مگر وہ تو ہیسے خود کو آزما رہی تھی۔

”آپ نے اس سے پہلے کبھی گاؤں نہیں دیکھا باجی جی.....؟“

ثانیہ اس کی دیوانگی سے یہی نتیجہ اخذ کر سکتی تھی۔

”یہی سمجھ لو.....!“

اس نے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔ اتنی دیر سے وہ اس کے ساتھ تھی مگر ایمان نے اس کے ساتھ از خود کوئی بات نہیں کی تھی۔ ثانیہ بیچاری اب خود ہی گفتگو کا آغاز کر چکی تھی۔

”آپ کو گاؤں یقیناً بہت اچھے لگتے ہوں گے.....؟ ہے ناں جی.....؟“

وہ اسی متاثر کن انداز میں مخاطب تھی جو ایمان کے لئے اس کے چہرے، اس کی آنکھوں سے چھلکتا نظر آتا تھا۔

”ایسا کچھ خاص تو نہیں ہے گاؤں میں کہ پسند کیا جائے.....؟“

وہ کسی قدر نخوت سے بولی اور ثانیہ کا چہرہ اتر گیا۔ اس کا خیال تھا یہ خوب صورت خریلی سی باجی گاؤں میں اتنی ٹھنڈی پرواہ کئے بغیر سیاحت کے لئے نکلی ہے۔

”آپ کے کپڑے تو بہت مہنگے ہوں گے ناں.....؟“

اب اس کی نظریں اس کے لباس پر تھیں۔ ایمان چلتے چلتے رک گئی۔ اور سنبیل کے درخت سے جھڑک

گرتے سرخ پھولوں سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔ ان آنکھوں میں معصوم سی خواہش تھی۔
”نہیں.....! ہرگز بھی مہنگے نہیں ہیں۔ میں تمہاری شادی پہ تمہیں ایسا ہی سوٹ تحفے میں دوں گی۔
دیے تم مجھے بلاؤ گی ناں.....؟“

وہ بات کرتے کرتے ایک دم رک کر اسے دیکھنے لگی۔ ثانیہ کے چہرے پہ الوہی خوشی کے رنگ پھیل گئے تھے۔

”کیوں نہیں باجی جی.....! آپ تو ضرور آنا۔ مجھے میک آپ بھی آپ سے ہی کروانا ہے۔ آپ خود جتنی حسین ہوناں، اتنا ہی مجھے بھی بنادینا۔ اتنا کہ مجھے جو بھی دیکھے بس دیکھتا رہ جائے۔“
”ارے.....!“

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”یہ خواہش کیوں ہے تمہیں.....؟“

”ہر کسی کو ہوتی ہے۔ آپ کو نہیں ہے کہ جب آپ دلہن بنو تو ساری دنیا آپ کو دیکھ کر حیران ہو جائے.....؟“

”نہیں بھئی.....! مجھے یہ خواہش نہیں ہے۔“

اس نے کاندھے جھٹک دیئے۔

”اچھا.....؟“

ثانیہ بے حد حیران نظر آنے لگی۔ تب ہی اسے ایک بار پھر ایک ساتھ پانچ چھینکیں آئی تھیں۔ دماغ بل کر رہ گیا۔ ثانیہ پریشان ہو گئی۔

”واپس چلیں باجی جی.....؟ آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

”ہاں.....! اب چلو۔“

اس نے کاندھے اچکا دیئے۔ اپنا الجھا ذہن بٹانے میں وہ بہر حال کامیاب رہی تھی۔

☆☆☆

رات تقریباً آٹھ بجے کا عمل تھا، ساتھ والے کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔ سربک کبل اور اوپر لحاف اوڑھے بھی وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ گھر پہنچتے انہیں سات بج گئے تھے۔ عاقب انہیں لینے آیا تھا۔ راستے میں بھی اسے چھینکیں آئی تھیں اور آتے ہی لحاف میں گھس گئی۔

اپنی خرابی طبیعت کا اس نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ خود ساختہ انا سے بہت تیزی سے ہر رشتے سے دور کر رہی تھی۔ جسم شدید نوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ سردی سے پھٹ جا رہا تھا، مگر وہ سب کچھ خود پہ سہہ رہی تھی۔ دوسرے کمرے سے مسلسل ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اور جانے کیوں اس کا دل بھرایا جا رہا تھا بغیر کسی وجہ سے آنکھیں برسنے لگیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب فضا اور ماما سونے کے ارادے سے ٹی وی بند کر کے کمرے میں آئیں تو اس کی کراہوں پہ پریشان ہو گئیں تھیں۔

”کیا ہوا ایی.....! طبیعت ٹھیک ہے.....؟“

فضہ نے فی الفور سوال کیا۔ جواب میں کچھ کہنے کی بجائے اس نے سختی سے ہونٹ بھیج لئے۔ مگر آنسو اسی تسلسل سے بہہ رہے تھے۔

”ایمان بیٹا.....! کیا زیادہ طبیعت خراب ہو رہی ہے.....؟“

ماما نے صرف سوال نہیں کیا، اس کا لحاف ہٹا کر پیشانی کو چھوا اور بے حد پریشان ہو گئیں۔

”مائی گاڈ.....! فضا.....! اے تو بہت تیز بخار ہے۔ ذرا دیکھو.....!“

انہوں نے گھبراہٹ زدہ انداز میں فضا کو آگاہ کیا تھا۔ فضا تیزی سے اس کے نزدیک آئی اور نمبر پچر محسوس کرتے ہی اس کی تشویش بھی گہری ہو گئی۔

”میں تاؤ جی کو بلاتی ہوں، شاید کسی ڈاکٹر کی دکان کھلی ہو.....؟“

وہ فکر مندی سے کہتی شال لپٹتی کمرے سے نکل گئی۔ نیچے آئی تو وہ لوگ خبریں سنتے ہوئے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، شاید اتوار تھا اس لئے، ورنہ عموماً وہ سب اس وقت سونے کو پہنچ جاتے تھے۔

”آپتہ.....! رک کیوں گئی.....؟“

سب سے پہلے تاؤ جی نے اسے دیکھا تھا۔ وہ قدرے ہچکچا گئی۔

”تاؤ جی.....! اس وقت ڈاکٹر مل سکتا ہے.....؟ اچھولی ایی کو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔“

”لیکن کب سے.....؟ پہلے کیوں نہیں بتایا.....؟“

تاؤ جی حسب توقع بے تحاشا فکر مند نظر آنے لگے۔

”ہمیں بھی ابھی پتا چلا ہے۔ وہاں آپا کی طرف تھی ناں، سارا دن گاؤں میں گھومتی پھری ہے۔ شاید لٹنڈ لگ گئی ہے۔“

اس نے یوں ہی آہستگی سے جواب دیا تھا۔

”میں ولید کو بلاتا ہوں۔ دیکھ لیتا ہے بچی کو۔ ہو سکتا ہے اس کے پاس گھر پہ دوائیں بھی ہوں۔“

تاؤ جی اٹھ کر باہر نکل گئے۔ فضا نے اُلجھ کر ہلٹے پردے کو دیکھا تھا۔

”اس وقت ڈاکٹر نہیں مل سکتا شاید.....؟“

”ہر وقت مل سکتا ہے، مگر کا ڈاکٹر ہے ہمارا، ڈونٹ وری.....!“

اس کی خود کلامی کے جواب میں عاقب نے مسکرا کے تسلی دی تھی۔ وہ چونک کر رہ گئی۔

ولید نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہاؤس جاب بھی مکمل ہو گیا تھا کہ پھری ایس ایس کا شوق بڑھ گیا۔

”ڈونٹ وری.....! اے دواؤں کی سوجھ بوجھ ہے۔ دادا کا علاج وہی کرتا ہے۔“

اس کے اس انکشاف پہ پھیلنے والی آنکھوں پہ غور کرتا ہوا عاقب کسی قدر شریر انداز میں بولا تو وہ صدمہ لگی۔ اور وضاحتی انداز میں بولی تھی۔

”مجھے ان کی قابلیت پہ شبہ نہیں ہے۔ میں ابھی آگاہ ہوئی ہوں ناں اس لئے۔“

”او کے فائن.....! آئیے.....! میں بھی ایمان کی خیریت دریافت کر لیتا ہوں۔“

فضہ نے کاندھے اچکا دیئے۔ جس پل وہ اس کے ہمراہ اندر داخل ہوئی، تائی ماں سمیت سب ہی ایمان کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ بخار کی حدتوں سے سرخ چہرہ کھلے ہوئے ریشمی بالوں کے حصار میں دبک رہا تھا۔ بے تحاشا سرخ آنکھیں، بھیگی ریشمی پلکیں، وہ سخت جزبہ سی بیٹھی تھی۔
”تو فکر ہی نہ کر پتر.....! ابھی بھلی چنگی ہو جائے گی۔ اپنا ولید پتر پنڈ میں بہت سارے لوگوں کا علاج کر چکا ہے۔“

”اور یقین کرو، ان میں سے ایک بھی نہیں مرا، سب زندہ ہیں۔ سو ڈونٹ وری.....!“

عاقب نے بیچ میں لقمہ دیا تھا۔ انداز اتنا شریہ قسم کا تھا کہ فضہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ جبکہ تاؤ جی نے بیٹے کو گھورا تھا اور سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔

میں نے تو کہا تھا ڈکان کھول لے ڈاکٹری کی، پر مانتا ہی نہیں۔ کیا کرے.....؟ ٹائم بھی کہاں ہوتا ہے اس کے پاس.....؟ پہلے پڑھنے جاتا ہے شہر، پھر آکے فصلوں کا سارا حساب کتاب کرتا ہے، کھیتوں کا کام بھی اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ اگر خدا خواستہ کسی کو اچانک ضرورت پڑ جائے تو ماتھے پہ شکن لائے بغیر مسیحا ہی بھی کرتا ہے۔“

تاؤ جی بیٹے کی تعریفوں میں محو تھے جس سے ایمان کو تو ذرا برابر بھی دلچسپی نہیں تھی۔

”اس وقت موصوف ہیں کہاں.....؟“

عاقب نے اس کی کمی محسوس کر کے کھنکار کر پوچھا تھا۔

”کہہ تو آیا ہوں میں اس کو۔ آ رہا ہوگا.....؟“

تاؤ جی کی بات ابھی منہ میں ہی تھی، جب دروازہ ہلکے سے تھپتھا کر ولید حسن نے اندر قدم رکھا۔ ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔

ایمان کے چہرے پہ تاؤ کی لہر اٹھی تھی۔ تاؤ جی نے اس کے بستر کے نزدیک کرسی خالی کر دی۔

”ادھر بیٹھ کے چیک کر پتر.....! اچھی سی دوا دینا، تاکہ ہماری دہی کا بخار جلدی سے اتر جائے۔“

”یہ تھرما میٹر منہ میں لگائیں.....!“

اس نے تھرما میٹر جھٹک کر اس کی سمت بڑھایا، جسے پکڑنے کو ایمان نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو اس کے بستر میں موجود ماما نے جلدی سے ولید سے تھرما میٹر لے کر اس کا منہ کھلوا کر اندر رکھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بے حد ناگواری سمیٹے ہوئے تھے یوں جیسے مارے بندھے بیٹھی ہو۔ اتنے سارے لوگوں کے لحاظ میں ولید نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا تھا اور ہونٹ بھینچ لئے۔ اتنے افراد کی موجودگی کے باوجود کمرے میں خاموشی تھی۔ سب انہی کی سمت متوجہ تھے۔

اور یہی توجہ ایمان کو کھل رہی تھی۔ ولید نے ٹیپر پتر تھرما میٹر سے پڑھا تو اسی کے مطابق دوا باکس سے ڈھونڈنے لگا۔

”کتنا بخار ہے.....؟“

تائی ماں نے سوال کیا تھا۔

”103.....! سردی تو نہیں لگ رہی آپ کو.....؟“

تائی ماں کو جواب دے کر وہ براہ راست اس سے مخاطب ہوا۔ وہ ناگواری کی احساس سمیت ہونٹ بھینچ رہی تھی۔

”بتاؤ ناں بیٹا.....!“

”کچھ دیر پہلے تو بہت لگ رہی تھی، ابھی فضہ نے نیم گرم پانی پلایا ہے تو کچھ بہتر ہے۔“

ماما نے پہلے ایمان کو مخاطب کیا تھا پھر خود ولید کو جواب دیئے گئے۔ ولید اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میڈیکل باکس بند کرنے لگا۔

”دوا تو دے دو.....!“

تاؤ جی نے بے اختیار ٹوکا۔

”لانا پڑے گی بابا.....! میرے پاس نہیں ہے۔“

”اس وقت جاؤ گے.....؟“

ماما نے تشویش سے دس کے ہند سے عبور کرتی کلاک کی سویوں کو دیکھا۔ گاؤں میں اتنی رات کو نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ بات اب وہ بھی جان گئی تھیں۔

”اٹس او کے.....! میں لے آؤں گا۔“

اس نے جواب بازی سے کہا تھا۔ ماما ایک دم ممنون نظر آنے لگیں۔ جبکہ ایمان کو خواہ مخواہ غصہ آ گیا۔

”اشعر یا عاقب کو ساتھ لے جانا پتر.....!“

تاؤ جی نے تاکید کی تھی۔ اس نے سرکواشات میں ہلا دیا۔

”میں چلتا ہوں۔“

عاقب اسی پل اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”کوئی ضروری نہیں ہے عاقب بھائی.....! اتنی بھی خراب طبیعت نہیں ہے میری کہ دوانہ ملی تو صبح تک

مر جاؤں.....؟“

اس کا تیز لہجہ ناگواری کی تپش لئے ہوئے تھا۔ ولید کی بے ساختہ نگاہ اٹھی، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے اُمّی ناپسندیدگی، ناگواریت اور تلخی۔ گویا چیخ کر کہہ رہی تھی۔ اس احسان کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ گہرا سانس کھینچ کر سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

”خدا خواستہ.....! ایمان گڑیا.....! کیسی باتیں کر رہی ہو.....؟ پہلی بات تو یہ کہ ہم کوئی بہت برا کام نہیں کرنے جا رہے۔ دوسرے اگر ایسا ہوتا بھی، تب بھی ہمیں ہرگز ناگوار خاطر نہ ہوتا۔ اپنوں کے کام آکر

، مالی تسکین حاصل ہوا کرتی ہے۔ اور تم ہماری بہت پیاری سی گڑیا ہو۔“

”ذہن کو ریلیکس کرو۔ ہم یوں گئے یوں واپس آ جائیں گے۔“

وہ اس کا سر تھپک کر مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔ ولید اس سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ اور جس پل اس نے

ہاتھ اشارت ہونے اور روانہ ہونے کی آواز سنی، عین اسی پل دستک دیتا اشعر اندر چلا آیا تھا۔ اسے دیکھ کر

کو کھوجا تھا مگر وہ ساتھ نہیں تھا۔

”ولید کہاں ہے.....؟“

سوال ماما کی طرف سے ہوا تھا، وہ لاشعوری طور پہ متوجہ ہو گئی۔

”اپنے کمرے میں چلا گیا ہے۔ دوا کا طریقہ مجھے سمجھا دیا۔ شاید اس کو بھی ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ بار بار

چھینک رہا تھا۔“

عاقب فضا کو دوا دیتے ہوئے کھلانے کے بارے میں ہدایات دیتے ماما کو جواب دینے لگا۔ ماما لمحوں

میں منتظر ہوئی تھیں۔

”سردی بھی تو بہت ہے باہر.....! میں دیکھتی ہوں بچے کو۔“

ماما بستر سے نکل کر چلیں گئیں۔ اشعر کی ہنسی کی آواز پہ وہ جو جانے کیا سوچنے لگی تھی، چونک کر متوجہ

ہوئی۔

”یہ تو چین ہی بن گئی مریضوں کی۔ دیکھئے ناں.....! آپ کی وجہ سے دلی بھائی کو ٹھنڈ لگی وہ بیمار ہو

رہے ہیں تو چچی جان ان کی خبر گیری کو اتنی سردی میں نیچے گئی ہیں اب اس وجہ سے اگر انہیں ٹھنڈ لگ گئی تو یہ

چین تو بنے گی ناں.....؟“

وہ کھی کھی کے دوران اپنی ہنسی کی وضاحت دے رہا تھا۔ ایمان کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

”تم جا کے بستر سنبھالو، کہیں تمہیں بھی ٹھنڈ نہ لگ جائے.....؟“

فضہ نے اسے ایک دھپ لگا کر وہاں سے اٹھایا تو وہ یوں ہی ہنستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ فضا اسے

دوا کھلانے لگی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو ذہن رات کی دواؤں کے زیر اثر سویا سویا سا تھا۔ وہ لحاف میں کسمپاسی اور ذرا سا

منہ باہر نکال کر کمرے کا جائزہ لیا۔ بستر اور لحاف سٹے ہوئے تھے۔ رات کی بے ترتیبی کا کوئی منظر نہیں تھا۔ گویا

فضہ اور ماما بیدار ہو چکی تھیں۔ مگر کمرے میں نہیں تھیں۔ اچھی خاصی خاموشی تھی جو یکینوں کی غیر موجودگی میں ہی

مخلیق ہو پاتی ہے یا پھر آدھی رات کے مخصوص خوابیدہ تصور سے منسوب ہوتی ہے۔ معاً ٹھنڈی صبح ہوا کے تیز

جمو کے دروازے سے ٹکرانے لگے اور دروازہ ہولے ہولے لرزنے لگا۔

ایک دم سے خاموشی کے پردے پر سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہ یوں ہی سراونچا کئے کمرے میں آتی

رہی۔ دھندلی سی صبح تھی۔ کھلے دروازے سے کبر کے بادل اندر چلے آ رہے تھے۔ اس نے گہرا

مانس کھینچا اور پھر سے سر تکیے پہ ڈال دیا۔ معاً سائینڈ ٹیبل پہ پڑے موبائل کی اسکرین بلیک کرنے لگی۔ اس نے

ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔ اسکرین پہ پاپا کا لنگ لکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر یوں ہی اسکرین کو گھورتے رہنے کے بعد اس

نے کال ریسیو کر لی تھی۔

”السلام علیکم.....! صبح بخیر زندگی.....! پاپا کی جان.....! ہاؤ آر یو.....؟“

پاپا کی فریش بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو دل بھر آیا۔ آج کتنے دنوں بعد وہ یہ آواز سن

”نصیب دشمنان طبیعت ناساز ہے۔“

وہ اسے دیکھنے لگی۔

کیسے لگے تھے یہ.....؟ اس کے ناروا سلوک کے باوجود اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے، کیوں.....؟

کیا خصوصیت تھی اس میں.....؟

اس نے سوچا مگر کوئی وجہ نہ ڈھونڈ پائی، سوائے اس کے کہ بقول فضا وہ پُر خلوص، سادہ لوگ، محبت

کرنا، محبت بائنا ان کا احسان نہیں، ان کا مزاج ہے۔ وہ اس نتیجے پہ پہنچی تو جیسے دماغ کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی

پڑنے لگیں۔ اسے واقعی کسی ایک شخص کی وجہ سے سب سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ اس نے فیصلہ کیا اور ریلیکس

ہو گئی۔

”بھئی.....! اگر خد متیں کروانا تھیں تو دیسے ہی کہہ دیتیں۔ بیمار پڑنا ضروری تو نہیں تھا.....؟“

وہ اس کرسی پہ آ بیٹھا جس سے ولید اٹھ کر گیا تھا۔ تائی جی بھی اب اس کے بستر میں تھیں، اس کا سر

انہی کی گود میں تھا۔ جسے وہ بڑی نرمی سے ہولے ہولے دبا رہی تھیں۔

”تم خفا نہیں ہو مجھ سے.....؟“

اس نے دل میں چھتا سوال کیا۔ اشعر نے ٹھنڈا گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا تھا پھر سنجیدگی سے

بولاً۔

”آپ نے کبھی آئینہ دیکھا ہے غور سے.....؟“

”کیا مطلب.....؟“

وہ ہونق ہوئی۔ یہ تو وہی بات تھی سوال گندم جواب چنا.....!

”آپ کی صورت اتنی معصوم، اتنی پیاری ہے کہ کوئی خفا ہونا بھی چاہے تو رہ نہ پائے۔“

اس کے جواب پہ ایمان اچھا خاصا جھینپ گئی تھی۔

”ششے میں اتارنا تو خوب آتا ہے۔ کتنی لڑکیوں کو روز چکر دیتے ہو.....؟“

وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔ اس کی خفگی دور ہونے کے خیال سے دل ایک دم ہلکا ہلکا ہو گیا تھا۔

”میں کہاں اتارتا ہوں.....؟ یہ صورت ہی ایسی حسین ہے کہ لڑکیاں خود پٹاخ پٹاخ گرتی ہیں مجھ

پہ.....!“

کالر کھڑے کرتے ہوئے وہ لمبی لمبی چھوڑنے لگا۔

”تاؤ جی.....! آپ آرام کریں جا کے، اب ایسی بہتر ہے، میں دوا بھی کھلا دوں گی۔“

تاؤ جی کو نیند کے جمو کے آ رہے تھے، جب فضا نے انہیں مخاطب کیا۔ وہ خفیف سے ہو گئے۔

”نہیں پتر.....! میں ٹھیک ہوں.....!“

مگر فضا نے نہ صرف انہیں، بلکہ تائی جی کو بھی ایمان کی طرف سے مطمئن کر کے سونے کو بھیج دیا۔

جس وقت عاقب اوپر آیا، وہ اشعر کی باتوں پہ ہنس رہی تھی۔ لاشعوری طور پہ اس کی نظروں نے ولید

”ایکی.....! بیٹا.....! بولوناں.....! کیسی طبیعت ہے اب.....؟“
”مجھے کیا ہونا ہے.....؟“

اس نے نروٹھے پن سے جواب دیا۔ اتنی ہی خفا تھی وہ ان سے۔
”تمہیں رات سے ٹپڑ پڑ ہے۔ سوٹ ہارٹ.....! بے احتیاطی کیوں کی آپ نے.....؟“
”وہ سرزنش کر رہے تھے۔ اس کا موڈ خراب ہونے لگا۔“
”فضہ نے آپ سے میری شکایتیں کی ہیں.....؟“

”نہیں.....! فضہ نے تو کچھ نہیں کہا۔ دلی کا فون آیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے تم مجھے مس کر رہی ہو۔ بیٹا.....! میں بھی اپنی خوشی سے آپ سے الگ نہیں ہوا ہوں۔ بسا اوقات مجبوریاں آپ کو جکڑ لیتیں ہیں۔ میری بیٹی تو بہت سمجھدار ہے ناں.....!“
”پاپا اور بھی بہت سی باتیں کر رہے تھے۔ مگر وہ تو وہیں انک گئی تھی۔“
”ولید نے کال کی.....؟“

”میں بہت جلد اپنی بیٹی سے ملنے آؤں گا۔ مگر ایک شرط ہے۔ مجھے اپنی ڈول ہمیشہ کی طرح مسکراتی، خوش باش، صحت مند ملنی چاہئے۔ پراس.....!“
”وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔“

”ولید نے آپ کو کال کیوں کی تھی پاپا.....؟“

”بیٹے.....! مجھے آپ کے متعلق بتا رہا تھا ناں.....!“

پاپا کا لہجہ و انداز نارمل تھا۔ یوں جیسے یہ معمولی کی بات ہو۔

”یہ اتنی اہم بات تو نہیں تھی پاپا.....! جسے بتانے کو اس نے آپ کو کال کر لی.....؟“

”وہ پتہ نہیں کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتی تھی مگر پاپا اس کی بات سن کر ہنس پڑے تھے۔“

”ہمارے لئے تو اہم ہے ناں بیٹے.....!“

”ہمارے.....؟“

”وہ اس ایک لفظ سے کچھ اور بھی اُلجھی۔“

”صرف پاپا یا وہ بھی.....؟“

”کیا وہ اس سے پہلے بھی آپ کو کال کرتا رہا ہے پاپا.....؟“

”ہاں.....! ہماری اکثر بات ہوتی رہی ہے۔“

پاپا کا انداز ہنوز نارمل تھا جبکہ ایمان کے لئے یہ کسی انکشاف سے کم نہیں تھا۔

”آپ کو پتا سے پاپا.....! وہ ڈاکٹر بھی ہے اور سی ایس ایس بھی کر رہا ہے.....؟“

”آئی نو بیٹا.....! میں جانتا ہوں۔ آخر بھتیجا ہے ولید میرا.....!“

اب کے شاید پاپا مسکرائے بھی تھے۔ وہ کچھ خفت زدہ ہو گئی۔ آخر وہ اسے کیوں مسلسل ڈسکس کر رہی

ہے.....؟

پاپا اسے باقاعدگی سے دوا لینے۔ خوراک پہ توجہ دینے اور اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر رہے تھے۔

”جی بہتر.....! کسی اور سے بات کریں گے.....؟“

اس نے سعادت مندی سے سر ہلا کر سوال کیا۔

”نہیں.....! میری بات ہوتی رہتی ہے سب سے۔ بس تم سے نہیں ہو پاتی۔ بہت خفا تھی میری

بیٹی.....؟“

انہوں نے اس پہ ہلکی سی گرفت کی تو ایمان بے تحاشا جھل ہو کر رہی گئی۔

”نہیں تو پاپا.....!“

اور جس بل وہ الودعی کلمات ادا کر کے فون بند کر رہی تھی، ادھ کھلے دروازے پہ ہونے والی دستک پہ چونک کے متوجہ ہوئی۔ دروازے کے باہر ولید کی جھلک دیکھ کر اس کی نگاہیں ساکن ہو گئیں۔ وہ کھنکرتا ہوا اندر چلا آیا تو ایمان نے خود کو سنبھال کر جب اور کچھ نہ سوچا تو چہرے اور گردن کے ساتھ کاندھوں پر بکھرے بالوں کو سمیٹ کر کچر میں جکڑنے لگی۔

”بابا نے مجھے آپ کی خیریت دریافت کرنے بھیجا ہے۔ چیک آپ کی بھی تاکید کی ہے۔“

ولید کی نگاہ اس کے گلابی مائل حسین و لطیف نقوش سے بے سارحانہ چہرے پہ اٹھتی گرتی رہی۔
لوں میں ایک لمحے کو اُلجھی تھی۔ وہ گویا اپنی دہاں موجودگی کی وضاحت پیش کر رہا تھا۔ ایمان نے جواب میں اموشی کو اختیار کئے رکھا تو وہ خود کو احق تصور کرنے لگا۔

”کیسا محسوس کر رہی ہیں اب آپ خود کو.....؟“

”وہ کچھ توقف سے بولا تو لہجے میں خفیف سی تپش تھی۔“

”جی بہتر.....!“ اس نے دھیمے سے جواب دیا تھا۔

”بہتر ہوگا، آپ مجھے نبض چیک کرادیں۔“

وہ کسی قدر جھج کر کہہ رہا تھا۔ اسی کترائے ہوئے انداز میں ایمان نے بھی اپنی کلائی آگے کی تھی۔

ولید کی نگاہ میں سعادت مندی کے اس مظاہرے پہ حیرت در آئی مگر جلد خود کو سنبھال کر اس کی سفید کلائی پہ

انگشت شہادت اور انگوٹھے سے دباؤ ڈالا۔

”ٹپڑ پڑ کم ہے، بہتر ہے آپ سوپ یا دلیہ کھالیں۔ زیادہ چلنے پھرنے سے پرہیز کیجئے۔ دوارات دلیہ

ہی استعمال کر لیجئے گا۔ شام تک مزید بہتری کی توقع ہے۔“

وہ اپنا ہاتھ ہٹا چکا تھا۔ بات کرنے کا انداز مخصوص ڈاکٹری پیشہ ورانہ تھا۔

”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے.....؟ عاقب بھائی بتا رہے تھے آپ کو بھی شاید ٹھنڈ لگ گئی تھی.....؟“

☆☆☆

پڑی تھی۔

”کیا فضول ہانک رہے ہو.....؟ اتنا ہی اشعار پڑھنے کا شوق ہے تو کہیں اور چلے جاؤ۔ یونہی.....!“

میرے سر میں پہلے ہی درد ہے۔“

”آ.....آہم.....!“

وہ خواہ مخواہ کھنکارا اور پھر آنکھیں سکیڑ کر بولا تھا۔

”میں تو ڈیئر سسٹر کی مزاج پڑی کو حاضر ہوا تھا۔ اگر غل ہوا ہوں تو واپس جانے میں کوئی حرج نہیں

بھتا۔“

وہ جل کر بہت عاجز نظر آنے لگا۔ ولید اس دوران پلٹ کر جا چکا تھا۔

”ہاں جاؤ.....!“

وہ نروٹھے پن سے کہہ کر جھک کر اپنے جوتے ڈھونڈنے لگی۔

”او کے میم.....! کالج سے واپسی پر میں آپ کے لئے چاکلیٹ لاؤں گا، بائے.....!“

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی

اس نے خوشبو کی طرح میں پذیرائی کی“

وہ تنکنا تا ہوا دروازے تک گیا تھا، پھر پلٹ کر اسے معنی خیزی سے دیکھا اور ہنس دیا۔ ایمان اتنا جھلا گئی کہ سائینڈیکل پر پڑا کرشل وال اٹھا کر اسے دے مارا، مگر وہ بروقت خود کو بچا گیا اور دروازے سے نکل گیا۔

”ایڈیٹ.....! نان سنس.....!“

اسے بے تحاشہ تاؤ آنے لگا۔

”اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا

روح تک آگئی تاثیر میسائی کی“

اشعر نے کلمے دروازے سے سر اندر گھسا کر پھر اپنی پاٹ دار آواز کا جادو جگایا تو وہ آپے سے باہر ہوتی اٹھ کر ننگے پیر، ننگے سر ہی اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

”اشعر کے بچے.....! زکو.....! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

وہ بے اختیار جھنجھکی اور مٹھیاں بھینچتی اس کے پیچھے سڑھیوں تک آتے ہی بری طرح سے ہانپنے لگی۔ وہ بھلا کیا قابو آتا، کسی چھلاوے کی طرح سے غائب ہو گیا۔ البتہ اس کے لئے ناشتے کی ٹرے لئے اوپر آتی فضا اسے یوں کھڑے دیکھ کر چیخ پڑی تھی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو.....؟ بے وقوف لڑکی.....! مرنے کا ارادہ ہے کیا.....؟ اتنی سردی ہے باہر

اور تمہاری طبیعت پہلے ہی خراب ہے۔ چلو اندر.....!“

وہ ٹرے وہیں بیخ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر اسے اس کے بستر تک لائی تھی اور زبردستی

اسے لفاف میں دھکیل رہی تھی کہ وہ صبح کر بول پڑی تھی۔

”افوہ.....! مجھے واش روم تک تو جانے دو.....!“

وہ جو دروازے تک پہنچ گیا تھا، بے ساختگی میں پلٹا۔ ان بادامی آنکھوں کی حیرت غیر یقینی اور استعجاب نے اس کی خفت و خجالت اور تحیر کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ اس کی لابی پلکیں جھک گئیں۔ گلابی گالوں پر شرمندگی سرخی کی صورت بکھر گئی۔ وہ خود متحیر تھی، یہ بات کیسے اس کی زبان سے پھسل گئی.....؟ جہکہ اس کا ایسا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اس کی اس خفت تے اس کی خوب صورتی کو کچھ اور بھی پرکشش بنا دیا تھا۔ ولید حسن کے دم بخود چہرے پہ مسکراہٹ سورج کی پہیلی بن کر چمکی۔

اس نے پھر میرا حال پوچھا ہے

کتنا مشکل سوال پوچھا ہے

بچکیوں کا عجیب لہجہ تھا

بات کو ٹال ٹال پوچھا ہے

تم مجھے چھوڑ تو نہ جاؤ گے

واسطے ڈال ڈال پوچھا ہے

آنسوؤں کی زبان میں اس نے

جتنا پوچھا کمال پوچھا ہے

کیا کبھی مل سکیں گے ہم دونوں

مجھ سے میرا خیال پوچھا ہے

دن گزرتا ہے کس طرح میرا

کیسے گزرے کا سال پوچھا ہے

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہہ پاتا، اشعر نے اندر آ کر بڑے ہی برجستہ انداز میں پوری غزل پڑھ ڈالی۔ آنکھوں کی ناچتی شرارت ہونٹوں کی مچلتی مسکان گواہ تھی کہ وہ اور کچھ نہ بھی سہی، مگر ان کے بیچ ہونے والی وہ آخری بات ضرور سن چکا ہے۔ لہجے کی معنی خیزی از خود یہ بھید کھول رہی تھی۔ بظاہر وہ خود میں مگن تھا۔

ولید بظاہر سنجیدہ تھا، مگر آنکھوں میں ایک خوب صورت دبی دبی مسکان تھی جو صاف کہتی تھی، وہ اشعر کی شرارت کو انجوائے کر رہا ہے۔ ایمان کی خفت و خجالت پہ ناراضگی اور غصے کے ساتھ بے بسی کا بھی غلبہ چھانے لگا۔ خود پہ تاؤ آ رہا تھا۔ آخر وہ کیسے زبان کو بند کرنے سے بچا نہیں پائی.....؟ یہ جھنجھلاہٹ ہی تھی کہ وہ اشعر پہ الٹ

”جاؤ.....! مگر جوتے پہنو، شال اوڑھو، پھر.....!“

فضہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اپنی جرسی اٹھا کر پہننے لگی، پھر سر پہ اوٹی ٹوپی بھی اوڑھ لی۔ شال کا تکلف البتہ اس نے نہیں کیا تھا اور جوتے گھسیٹتی باہر نکل گئی۔

”ولید بتا رہا تھا اب تمہیں ٹیپر چڑ نہیں ہے۔ کیسا محسوس کر رہی ہو تم.....؟“

وہ تو لیے سے منہ پونچھتی ہوئی اندر آئی تو فضہ نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”ہاں.....! ٹھیک ہوں۔ لیکن میں دلیہ نہیں کھاؤں گی۔“

ٹرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہی اس نے بے زار کن لہجے میں کہا تھا۔

”ولید تمہارے لئے دلیہ ہی جھٹ کر کے گیا ہے۔“

”ولید جو کہے گا، میں ضرور مان لوں گی، یہ تم نے کیسے سوچ لیا.....؟“

وہ ولید کا نام سنتے ہی آتش فشاں لاوے کی طرح سے پھٹ پڑی۔ ابھی کچھ دیر قبل جس انداز میں اشعر نے ولید کے حوالے سے اس کی درگت بنائی تھی، وہ اس کا دماغ خراب کر چکی تھی۔ فضہ نے سنجیدہ کن نگاہ سے اسے دیکھا۔

”کنٹرول یور سیلف ایمی.....! کس بات کا اتنا غصہ آ رہا ہے تمہیں.....؟“

فضہ کو اس پہ ٹھیک ٹھاک تاؤ آ گیا۔ وہ ایک دم ہونٹ بھینچ گئی۔

”تم جانتی ہوناں کہ میں دلیہ نہیں کھاتی ہوں فضہ.....!“

اس کا انداز ہارا ہوا تھا۔ فضہ کو ایک دم اپنے سخت رویے کا احساس ہوا تو فوراً ڈھیلی پڑ گئی۔

”تھوڑا سا کھا لو.....! پھر میں تمہیں تمہاری پسند کا سوپ بنا کے دوں گی، اور تمہیں پتا ہے، آج پاپا بھی

آ رہے ہیں۔“

فضہ نے اسے منانا چاہا۔ وہ آخری اطلاع پر ٹھٹکی تھی۔

”لیکن مجھے تو انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میری بات ہوئی تھی ان

سے۔“

اس نے اچھنبے میں گھر کر کہا تو فضہ مسکرا دی۔

”تمہیں سر پرانز دینا چاہ رہے ہوں گے۔ میں نے تمہیں اس لئے بتایا ہے تاکہ تمہارا موڈ ٹھیک ہو

جائے۔ کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی.....؟“

فضہ اچھنبے میں گھر کر بولی تھی۔ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا تو فضہ بے چین ہونے لگی۔

”بتاؤ ناں.....!“

”میں اس روز خوش ہوں گی فضہ.....! جب وہ ہمیں یہاں سے لے جائیں گے۔“

سنجیدگی سے کہہ کر وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فضہ ٹھنڈا سانس بھر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”حالات کے بچوں میں گرفتار مسلسل

جی اپنا رہا خود سے بھی بے زار مسلسل

اس شہر میں جب جب بھی کوئی جرم ہوا ہے

ہم لوگ ہی ٹھہرے ہیں سزا وار مسلسل“

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی، جب اس غزل کے بول اس کی سماعتوں میں اترے۔ گائیکی شاندار، مغنیہ کی آواز دل میں اترتی ہوئی تھی۔ اس کے قدموں کی رفتار بے اختیاری کی کیفیت میں دھیمی پڑ گئی۔

”جیسے میری آنکھیں ہیں روتی جہر میں تیرے

یوں روئے نہ کوئی بھی میرے یار مسلسل

اظہار میں ہم نے تو کوئی فرق نہ چھوڑا

اس طرف سے ہوتا رہا انکار مسلسل

اے عمر بتا پھر بھی تجھے کیسے گزاریں

خداشات سے رہتے ہوئے دوچار مسلسل

کوئی اسٹاپ کہہ کر خود بھاگ گیا ہے۔“

اشعر اپنی ٹون میں اسی سمت آ رہا تھا، سڑھیوں پہ اسے ایستادہ پا کر شرارت سے مسکرایا۔ ایک طرح سے اس کے مجسمہ بنے وجود پہ چوٹ کی۔ اس کے زخماں رخت کی سرنخی سے متمما اٹھے۔

”تم کبھی نہیں سدھر سکتے.....!“

اپنی خجالت مٹانے کو وہ اسے گھورنے لگی، مگر اس پہ کیا اثر ہونا تھا بھلا.....؟ دائیں بائیں آگے پیچھے ادھر نیچے اچھی طرح جھانک کر جائزہ لے چکا تو منہ بسور کر بولا تھا۔

”یہاں تو مجھے ایسی کوئی باکمال چیز نظر نہیں آئی ہے کہ بندہ سراسر ہو جائے.....؟ آپ کی اس کیفیت

کی وجہ.....؟“

”افوہ.....! میں یہ غزل سن رہی تھی، کس نے لگا رکھی ہے.....؟“

اسے جھلا کر ہی سہی، مگر اصل بات بتانا پڑی تھی۔

”آئی سی.....!“

وہ سر دھننے لگا۔

”ایسی سڑی بُسی شاعری ہمارے گھر میں ایک ہی بندہ پسند کرتا ہے، اور وہ ہیں ولی بھائی.....!“

وہ معاً چونکا اور اسے عجیب کھوجتی نظروں سے دیکھتا ہوا کسی قدر راہ داری سے کسی حد تک مشکوک ہو کر

بولا تھا۔

”مگر ایسی شاعری پسند کرنے کے لئے تو محبت کرنا، وہ بھی دن سائید کو ضروری ہے۔ کہیں خدا نخواستہ

آپ.....“

اس نے دانستہ فقرہ اُدھورا چھوڑ دیا۔ ایمان جی بھر کے بے زار ہوئی۔

”ہمیشہ فضول ہی ہاٹکنا۔ شاعری پسند کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ بندہ محبت میں ناکام ہو یا

مک طرفہ محبت کا شکار ہو۔ حالات و واقعات کے مطابق وقتی کیفیت کے لحاظ سے الفاظ نچ کر س، بندہ تب بھی تو

سن سکتا ہے ناں.....! پسند بھی کر سکتا ہے۔“

اس نے جیسے بہت گہرائی سے سمجھایا تھا۔ وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے آنکھیں سکڑ کر معصومیت سے بولا۔

”بائی داوے.....! یہ آپ اپنی صفائی پیش کر رہی ہیں، یاد لی بھائی کی.....؟“

”صرف اپنی.....! ان سے میرا کیا تعلق.....؟“

اس نے جواباً نخوت سے ناک چڑھائی۔ اشعر اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر خود کو سنبھال کر اس شرارت کے جالے میں آگیا۔

”ان سے کن سے.....؟“

”ا.....ش.....ع.....ر.....!“

اس نے دانت پیٹتے ہوئے منھیاں سمجھتی لیں، اور وہ ہنستا ہوا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

”بابا کیوں نہیں آئے اب تک.....؟“

وہ صحن عبور کر کے کچن کے دروازے پر آکھڑی ہوئی، جہاں فضلہ ڈھیروں سامان اپنے آس پاس پھیلانے بریانی کو دم پہ لگا رہی تھی۔ کچن کی فضاء میں بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی، جسے اس نے گہرا سانس کھینچ کر اندر اتارا اور آگے بڑھ کر سلاڈ کی ڈش سے کھیرے کا قلم اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگی۔

”ہتا نہیں.....! تم فون کر کے پوچھ لو ناں.....!“

فضلہ اپنے کام میں مصروف رہ کر بولی تھی۔

”میری زد و بگ کی سم ہے، فی الحال سگٹل نہیں آرہے۔“

”کے فون کرنا ہے آپ نے.....؟ میرا سیل لے لیں.....!“

عین اسی پل وہ اندر آیا تھا۔ بلیک شلوار سوٹ میں اپنی ٹھٹکا دینے والی مردانہ وجاہت کے ساتھ، لہجہ و انداز دوستانہ تھا۔ ایمان نے چونک کر اسے دیکھا اور بے نیازی سے رخ موڑ لیا۔

”پاپا سے ان کے آنے کے متعلق پوچھنا ہے۔ کہہ رہے تھے ناں، شام تک آجائیں گے۔“

اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے فضلہ کو جواب دینا پڑا تھا۔

”ہاں.....! تو پوچھ لیں، کب تک پہنچ رہے ہیں.....؟“

وہ جیب سے اپنا سیل فون نکالنے لگا۔ تب ہی باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔

”رہنے دیں ولید بھائی.....! میرا خیال ہے، پاپا آگئے ہیں۔“

فضلہ نے ایک دم خوشی سے نہال ہوتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے کاندھے اچکا دیئے۔

”جی.....! آئی تھنک.....!“

فضلہ سب کچھ پھلانگی اگلے ہی لمحے کچن سے باہر تھی۔ باہر واقعی بابا آئے تھے۔ وہ اب اندر آچکے تھے۔ تاؤ جی ان کے ساتھ تھے۔

”السلام علیکم پاپا.....! آئی ایم ویری منگ یو.....!“

فضلہ بالکل کسی ننھی بچی کی طرح ہی دوڑ کر ان کے کشادہ سینے لے لپٹ گئی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیئے۔

”وعلیکم السلام بیٹا.....! پاپا بھی آپ کو اتنا ہی مس کرتے رہے ہیں۔ چھوٹی کدھر ہے.....؟“

ان کی متلاشی نگاہیں بے چینی سے یہاں وہاں بھٹکی تھیں۔ تب ہی ولید آگے بڑھ آیا۔ پاپا بہت ہی تپاک سے اس سے ملے تھے، پھر اشعر اور عاقب سے۔ تائی ماں اور ماما بھی ان کی آمد کی اطلاع پا کر آگئی تھیں۔

”وہ کچن میں ہے، آپ کو ہی شاید وہاں جانا پڑے پاپا.....! وہ خفا ہے ناں آپ سے۔“

فضلہ ہنس کر بتا رہی تھی۔ پاپا مسکراتے ہوئے کچن کی سمت آگئے۔

”مہنی کم مہر بیٹا.....!“

انہوں نے وہیں چوکھٹ پر رُک کر دونوں بازو پھیلائے تو وہ جو رخ پھیرے آنسو چھپا رہی تھی، یوں ہی منہ پھلایا کر ان کے بازو سے لگ کر سسکنے لگی۔ پاپا نے اسے نرمی و محبت سمیت خود سے لگا لیا تھا۔

”آئی ایم سوری بیٹا.....! آئی ایم رینی ویری سوری.....!“

وہ اس کا سر تھپکنے لگے۔ اس کے آنسو اور شدت سے بہنے لگے تھے۔

”ہم وہاں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے، مگر آپ تو یہاں ہمارے پاس آ سکتے تھے ناں.....؟“

وہ یوں ہی روتے ہوئے بولی تھی۔

”پاپا سوری کر رہے ہیں ناں جانو.....!“

انہوں نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ مگر وہ روٹھے ہوئے انداز میں ان کے ہاتھ جھٹکنے لگی۔

”ایمی.....! کیوں پریشان کر رہی ہو اپنے پاپا کو آتے ہی.....؟“

ماما نے ڈانٹا تو اس کے آنسوؤں میں شدت آگئی۔ پاپا نے آنکھ کے اشارے سے ماما کو کچھ کہنے سے منع کیا تھا۔ پھر اسے سنانے کی غرض سے بولے تھے۔

”چلو.....! اب میں پراس کرتا ہوں، ہر ویک اینڈ پہ ملنے آؤں گا، اب خوش.....؟“

”نہیں.....! بس آپ ہمیں یہاں سے لے کر چلیں۔“

اس نے منہ بسور کر شرط رکھی۔ پاپا کچھ بے بس سے ہوئے۔

”آئی پراس و دیو.....! میں بہت جلد آپ کو لے چلوں گا، ٹھیک ہے ناں.....!“

انہوں نے ایک بار پھر اس کے آنسو پونچھے۔ باقی سب جیسے خاموش دونوں کا مکالمہ سن رہے تھے۔

”او کے.....!“

وہ جیسے احسان جتلانے والے انداز میں بولی تو پاپا نے بے اختیار سکھ کا سانس بھرا تھا۔

”آپ کمرے میں چلو، میں بابا سے مل کر آتا ہوں۔“

وہ اس کا سر تھپکنے دوا کے کمرے کی سمت بڑھ گئے، تو وہ کسی کی بھی سمت دیکھے بغیر سڑھیاں پھلانگی

اپنی بات مکمل کر کے وہ نکا نہیں تھا، باہر کی طرف چلا گیا تھا۔ فضا بے اختیار سرد آہ بھر کے دوبارہ بیٹھ گئی۔

”مائی گاڈ.....! کتنے عجیب سے ہیں یہ ولید بھائی بھی۔ ذرا کے رکھ دیا مجھے۔ تو بہ میری، جو آئندہ ایسی بات کروں۔“
وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے ایگزٹم نزدیک آگئے تھے۔ پاپا نے اسے کالج جانے اور پڑھائی پہ توجہ دینے کی خاص تاکید کی تھی اور وہ خود بھی سنجیدہ تھی۔ بابا نے کہا تھا، وہ اس کی بکس وغیرہ کل تک بھیج دیں گے۔ آج ہی یہاں نے بھی طویل مسیج میں اسے ڈیٹ شیٹ بھیجی تھی۔
”پریشان کیوں ہوتی ہو.....؟ اگر پڑھائی میں کسی قسم کی مشکل ہو تو ولید بھائی اور عاقب ہیں ناں.....!“

اسے سوچ میں گم دیکھ کر فضا جو بیڈ شیٹ دھونے کے ارادے سے اُتار رہی تھی، مشورے سے نوازا۔
”ولید بھائی اور عاقب ہیں ناں.....؟“

ایمان نے زیر لب اس کا فقرہ ڈہرایا اور اسے بے دریغ گھورا۔
”اگر ولید بھائی ہو سکتا ہے عاقب سے چھوٹا ہو کر، تو عاقب کیوں نہیں.....؟“
بھنوں کو جنبش دیتے ہوئے وہ بے حد کڑے انداز میں اس کا گھیراؤ کر رہی تھی۔ فضا بیچاری واقعی ہی گڑبڑا گئی، اور خفت مٹانے کو بولی۔

”اچھا.....! میں نے ایسا کہا، مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔“
”پہلے خیال آیا ہوگا، جبھی تم نے یہ فضول حرکت کی ہے۔ فافٹ اُگلو، اصل بات کیا ہے.....؟“
وہ اسے کسی طور بھی بخشنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ فضا کھیا کر ہنس پڑی۔
”حولد ارنی صاحبہ.....! تفتیش پھر کبھی کر لینا، مجھے کپڑے دھونا ہیں۔“
وہ بھی صاف کترائی تھی، مگر ایمان نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے پردے اور بیڈ شیٹ جھپٹ کر زور پھینک دی۔

”فضا.....! مجھے پتا چل چکا ہے، تم کن ہواؤں میں اڑنے کی کوشش کر رہی ہو.....؟ یعنی حد ہوگئی۔ اتنا لو ہو گیا ہے تمہارا سنڈر کہ تم اب معمولی شکل کے ایک پننڈ وٹھنص کی محبت کا شکار ہو گئیں.....؟ کان کھول کر سن! تم اگر چاہو بھی تو میں تمہیں یہ حماقت نہیں کرنے دوں گی، سمجھیں.....؟“

وہ جس طرح آنکھیں نکال کر غرا کر بولی تھی، اس کے لہجے میں جو تضحیک اور حقارت کا عنصر تھا، اس نے فضا کا بھی اشتعال بڑھا دیا تھا۔ جبھی وہ جواباً اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں بولی تھی۔

”بس از نو بچ ایمان.....! انف.....! تم مجھے صرف ایک بات بتا دو.....! کیا سمجھتی ہو تم خود کو.....؟ امان سے اُتری ہوئی ہو.....؟ یا ہمارے وجود کو کوئی ہیرے موتی جوئے ہوئے ہیں۔ عاقب یا تاؤ کی فیملی ہرگز

اوپر چلی گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ ولید حسن کی تب سے اسے نکلتی نگاہیں بہت ہی مضطرب انداز میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں اُلجھ گئی تھیں۔

”کیا سوچ رہے ہیں ولید بھائی.....؟“
تقریباً سبھی پاپا کے ساتھ ددا کے کمرے میں چلے گئے تھے، بس وہ اکیلا ہی وہاں کھڑا تھا۔ فضا کچن کی سمت بڑھتے بڑھتے اس کو دیکھ کر رُک گئی۔ تب پہلے چونکا، پھر شپٹا کر رہ گیا۔
”کچھ نہیں.....! آپ ہر وقت کام میں لگی رہتی ہیں، سچ بہت شرم آتی ہے۔ کیا سوچتی ہوں گی، ہم تو جیسے آپ کے ہی منتظر تھے۔ سارا بوجھ آپ پہ ڈال دیا۔“
وہ اس کے ساتھ ہی کچن کے اندر آ گیا تھا اور اب پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے سلاد کے لئے کھیرے کاٹنے لگا۔ فضا اس کی بات سن کر زور سے ہنس پڑی۔ پھر کسی قدر شرارت سے بولی تھی۔
”مجھے کام کرنے کی عادت ہے۔ فارغ نہیں بیٹھ سکتی۔ اس لئے بے فکر ہو جائیے کہ میں آپ پہ کوئی احسان کر رہی ہوں۔“

اس کا بات کرنے کا وہی دھیمہ اور اپنائیت آمیز انداز تھا۔ وہ مسکرا دیا۔
”آپ دونوں بہنوں میں بہت فرق ہے۔“
”جی.....! ایکی بہت خوب صورت ہے، ہے ناں.....؟“
وہ بے حد شرارت سے کہہ کر ہنسی ولید بے طرح چل ہو گیا۔
”میں مزاج کی بات کر رہا تھا۔ آپ بہت ناکس ہیں، بہت کیمرنگ۔ میں آپ کے مزاج کی وجہ سے آپ کی بہت قدر کرنے لگا ہوں، ریکی.....!“

”لیکن محبت تو اسی سے کرتے ہیں ناں.....؟ اس کی تمام تر بد تمیزی کے باوجود.....؟“
الفاظ تھے یا بارود کے گولے، ولید حسن کو لگا تھا، اس کا وجود ایک دم ریزہ ریزہ ہو کر ہواؤں میں بکھر گیا ہے۔ وہ ہونٹ بھیچنے سا کن کھڑا رہ گیا تھا۔

”آئی ایم سوری ولید بھائی.....! شاید آپ کو میری بے تکلفی کچھ اچھی محسوس نہیں ہوئی.....؟“
معا اس نے فضا کی آواز سنی تھی جو اس کے تاثرات سے خاصی سہی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ولید حسن نے بشکل پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فضا جو اس کے انداز کی گھیرتا سے خائف تھی، ایک دم بھاگ کر اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ میرا ایک انداز تھا بھائی.....! پلیز، میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ آئی نو.....! آپ کو اچھا نہیں لگا۔“

وہ جیسے گڑبڑائی تھی۔ ولید حسن نے ایک طویل گہرا سانس بھر کے ضبط سے سرخ ہوتی آنکھیں اس پر نکا دیں۔

”فضا.....! آپ کا اندازہ صحیح ہے یا غلط.....؟ میری آپ سے صرف ایک گزارش ہے۔ پلیز.....! آئندہ مذاق میں بھی ایسی بات دوبارہ مت کیجئے گا۔ بی کار، مجھے اپنے جذبات کی تذلیل گوارہ نہیں ہے۔“

بھی گری پڑی نہیں ہے کہ تم ان کے متعلق اتنی سطحی بات کہو۔ اگر عاقب مجھے پسند کرتا ہے یا میں عاقب کو، تو اس میں ہمیں تمہارا فیصلہ لینے کی ہرگز بھی ضرورت نہیں پڑتی، اس لئے کہ زندگی ہمیں گزاری ہوگی۔ تکبر کی جس سیرجی پر تم کھڑی ہوناں.....! وہاں سے انسان ہمیشہ منہ کے بل ہی گرتا ہے۔ بہتر ہے کہ سنبھل جاؤ۔“

فضہ نے جارحانہ انداز میں کہا تھا اور اٹھل پھٹھل سانسوں کے ساتھ جب پلٹ کر دروازے سے نکل کر باہر آئی تو برآمدے میں ولید حسن کو ایک سکتے کی سی کیفیت میں کھڑے پا کر اس کا اضطراب اور تھکن جیسے ایک دم ہی مزید بڑھ گئی تھی۔ کچھ بھی کہے بغیر اس نے انتہائی بے کسی کی کیفیت میں کسی مجرم کی طرح ہی سر جھکا دیا تھا۔

ولید حسن نے ہاتھ میں پکڑا کتابوں کا بندل وہیں کونے میں پڑے میز پر رکھا اور انہی قدموں سے پلٹ گیا۔ فضہ کے دل کا بوجھ کچھ اور بڑھنے لگا۔

☆☆☆

”چلو پھر شرط لگ جائے
میں ثابت آج کروں گی
کہ تم نے دل لگی کی ہے
محبت نام کی کی ہے
سن کر اس کی باتوں کو میں بولا
سادہ دل لڑکی
اگر میں دل لگی کرتا
تو جینے سے نہ یوں ڈرتا
محبت نام کی کرتا
وفا میں عام ہی کرتا
مگر پھر بھی انا تیری
تیری تسکین کی خاطر
یہ کہتا ہوں

ہاں میں نے دل لگی کی تھی
تجھے اپنا ہی سمجھا تھا
تجھے دل سے لگایا تھا
جہاں نہ کوئی غم پہنچے
وہاں تجھ کو چھپایا تھا“

وہ خاموش، اداس بیٹھی جیسے پہلے چولہے کی راکھ بلیسن سے کرید رہی تھی، ویسے ہی کریدتی رہی۔
عاقب جس نے محض اس کا موڈ بدلنے کو یہ طویل نظم بنائی تھی، بد مزہ سا ہو گیا۔

”کیا بات ہے بھئی.....! یہ اداس بلبل کیوں بنی بیٹھی ہیں.....؟“
”نہیں تو.....!“

وہ سر جھٹک کر بولی، مگر عاقب کو ہرگز اس کی بات کا یقین نہیں آ سکا تھا۔

”کوئی پریشانی ہے یا آپ پہ بھی ایمان والی کیفیت طاری ہو رہی ہے.....؟“

”ایمی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ خفا ہو گئی ہے مجھ سے۔“

اس کی آواز جیسے آن کی آن میں بوجھل ہونے لگی۔ عاقب نے اُلجھ کر اسے دیکھا تھا۔

”خفگی کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی.....؟“

”یہ مت پوچھیں پلیز.....!“

اس نے عاجزی سے کہا تھا۔ آنکھوں کی سطح بہت سرعت سے گیلی ہونے لگی تھی۔

”اوکے.....! نہیں پوچھتا، یہ بتائیں.....! غلطی کس کی طرف سے ہوئی تھی.....؟ آپ کی یا اس

کی.....؟“

”اس کی.....! وہ شدید قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہے۔“

فضہ نے بلا جھجک کہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ولید حسن کے چہرے پہ ایک تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”وہ حقیقت پسند ہیں فضہ جی.....! میں انہیں غلط نہیں کہوں گا۔“

ولید حسن کسی قدر سرد آواز میں کہتا، ساس پین میں چائے کے لئے پانی رکھنے لگا۔ عاقب نے بہت

حیران کن نگاہ سے اسے دیکھا تھا۔

”تم جانتے ہو ساری بات.....؟“

”جی.....! بس اتفاقاً سن لی تھیں، جیسے ابھی آپ کی باتیں سن لی ہیں۔“

وہ نارمل انداز میں کہہ کر شلف سے چینی اور پتی کے ڈبے اٹھانے لگا۔ فضہ ہونٹ بھیجنے بیٹھی تھی۔

”آپ لوگ چائے پیئیں گے.....؟“

ولید نے ساس پین کے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے دونوں کو باری باری دیکھا۔ عاقب نے ہاں، جبکہ

فضہ نے نفی میں جواب دیا۔

”پنی لیں.....! سر کے درد کو افاقہ ہوگا۔ ورنہ حالات تو سدھرنے والے ہیں نہیں۔“

اس کے مدہم لہجے میں فضہ کے لئے ہمدردی تھی۔ فضہ نے شاکی نگاہ اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی

تھی۔

”مجھے صرف اس سے نہیں، آپ سے بھی شکایت ہے۔“

اس کی بات پہ ولید پکرا کر رہ گیا تھا۔

”یہ تو خیر، اب زیادتی ہے۔ میں نہ تین میں نہ تیرہ میں۔“

وہ بے ساختہ بلبلایا۔ انداز ایسا تھا کہ اتنی ٹینشن اور ناراضگی کے باوجود فضہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”اگر آپ اپنی بے نیازی اور اکڑ کو ذرا سا ڈھیلا کر لیں تو اسے راستے پہ بھی لایا جاسکتا ہے، مگر

آپ.....

”ایں.....؟“

دلید کا منہ کھل گیا۔ پھر بے چارگی سے بولا تھا۔

”آپ کو میرے سر کے یہ حسین اور گھنے بال اچھے نہیں لگتے.....؟ کیوں مجھ بیچارے کو گنجا دیکھنے کی متنی ہیں.....؟ اپنی خوشخوار ڈیئر سسٹر کا پتا ہے ناں آپ کو.....؟“

اس کے بات کرنے کے انداز پہ فضا کا ہنستے ہوئے برا حال ہونے لگا۔ عاقب جو نا فہم نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا، کسی قدر تپ اٹھا تھا۔

”میں تم دونوں کو احق اعظم نظر آتا ہوں.....؟ بیچ میں مجھے بٹھا کر خود دونوں کھی کھی کر رہے ہو.....؟“

”یہ لیجئے.....! جل گئے محترم.....! ہنستے مسکراتے تو کسی کو دیکھ ہی نہیں سکتے ہیں یہ۔ چلئے.....! آپ

ہی بتا دیجئے! انہیں ساری بات، میں ابا کو چائے دے آؤں۔“

وہ چھان کر چائے پیالی میں نکال کر باہر نکل گیا، جبکہ فضا محضے میں پڑ گئی۔ کیسے بتائے.....؟ جبکہ

عاقب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سنسکر کے بتانا شروع کیا تھا۔

☆☆☆

”اکیلے جو دکھ اٹھاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے

ہمارا دل جلاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے

کہا بھی تھا محبت میں محبت ہی اسے رکھو

تماشہ جو بناتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے

اٹھاتے ہو فلک تک تم ہمیں سر محفل مگر

اٹھا کر جو گراتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے

کوئی جو پوچھ لے تم سے کہ رشتہ کیا ہے اب ان سے

تو نظروں کو چراتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے

بکھر جائیں اندھیروں میں سہارا تم تو دیتے ہو

مگر پھر چھوڑ جاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے“

خوب صورت، فریش گلابوں کا بگے اور ساتھ میں ایک ننھے سے ”آئی ایم سوری“ کے کارڈ پہ موتیوں کے سے الفاظ میں لکھی یہ نظم۔

وہ سوکر اٹھی تو اپنے سر ہانے رکھے پھول دیکھ کر بے ساختہ حیران ہو گئی تھی۔ کارڈ پڑھنے کے بعد یہ استعجاب کچھ اور بھی بڑھ گیا۔ تبھی دروازہ ناک ہوا تھا اور فضا اس کے لئے ٹرے میں ناشتہ سجائے چلی آئی۔

”السلام علیکم.....! صبح بخیر زندگی.....!“

وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی۔ ایمان نے بے رخی سے چہرہ پھیر لیا۔

”ابھی تک خفا ہو.....؟“

وہ آگے بڑھی اور اس کے گلے میں بازو جھائل کر دیئے۔

”مجھ سے بات مت کرو.....!“

”سوری کر تو چکی ہوں یار.....!“

وہ بسوری۔

”مجھے تمہاری ایکسکوز کی ضرورت نہیں.....!“

”مگر یہ پھول تو سنبھالے بیٹھی ہو۔“

فضا نے اس کی گود میں دھرے بگے کو انگلی سے ٹھونکا۔ ایمان چونک گئی۔

”یہ تم نے رکھا تھا.....؟“

”تو اور کون رکھ کے گیا ہے.....؟“

”تو ٹھیک ہے.....! واپس لے جاؤ.....!“

ایمان کی بے اعتنائی فقط عروج پہ جا پہنچی۔ فضا ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”ایمان.....! تم ابھی بھی سمجھتی ہو کہ تم ٹھیک ہو.....؟“

”میں کوئی نہیں ہوتی تمہارے معاملات میں انٹرفیر کرنے والی۔“

ایمان کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔ فضا نے تڑپ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

”بہت بے وقوف ہو۔ سویٹ ہارٹ.....! مجھے غصہ اس وجہ سے نہیں آیا تھا۔ مجھے تمہارے لہجے کی

تھارت پہ خوف محسوس ہوا تھا ایی.....! میری عاقب سے کسی قسم کی کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ تم بہت غلط سمجھی

تمہیں۔ مجھے تمہارے لہجے کا غرور اچھا نہیں لگا تھا۔ تم جانتی ہو ناں، کسی کو حقیر سمجھنا کتنی غلط بات ہے۔ برتر و اعلیٰ

صرف رب پاک کی ذات ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم درجہ بندی کرتے پھریں۔

ماما نے ساری زندگی پاپا کے رشتوں کو حقیر جانا تھا۔ آج وقت کی گردش نے انہیں انہی کے در پہ لا پنجا

ہے۔ کیا یہ ماما کے غرور کی سزا نہیں ہے.....؟ ہم اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کو بھول جاتے ہیں، مگر خدا نہیں بھولتا

ہے۔ وہ اپنے بندوں کا انتقام بھی لیتا ہے اور حساب بھی برابر کرتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو، میں کیا کہنا چاہ رہی

ہوں.....؟“

اس نے تسلسل سے بولتے ہوئے رک کر اسے دیکھا تھا۔ ایمان نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

”گڈ.....! اب مجھے معاف کر دیا ہے ناں.....؟“

”ہاں.....!“

اس نے ایک بار پھر سر کو اثبات میں ہلایا تو فضا بے اختیار مطمئن ہو کر مسکرا دی۔ جبکہ ایمان آہستگی سے

بانگ سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے کے ارادے سے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

”ہجر کے موسم میں یہ بارش کا برسنا کیسا

اک صحرا سے سمندر کا گزرنا کیسا

اس سے بچے کے دوں میں کون دسرا کرے گا۔ یہ سب کچھ پتہ چلا گیا۔

وہ بننے لگا۔ فضلہ نے روشن ہنسی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

خفیف سا گھور کر بولی تھی۔

”آپ اس قسم کی باتوں میں لگا کر میرا دھیان نہیں بنا سکتے ہیں ولی بھائی.....! مجھے اپنے سوال کا جواب چاہئے۔“

”دھیان تو خیر میں آپ کا سو فیصد بنا چکا ہوں۔ ویسے کون سی بات.....؟“

وہ جیسے صاف کتر لایا تھا، جسے فضا نے محسوس کیا اور گہرا سانس بھر کے روٹھے ہوئے انداز میں منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ ولید اس کی بچکانہ حرکت پہ آہستگی سے مسکرا دیا تھا اور بہت آہستگی سے جیسے خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔

”مجھے خبر ہی نہ ہو سکی، میں نے کب اس سے محبت کی.....؟ شاید تب، جب میں نے ہوش سنبھالتے ہی آپ کا نام عاقب کے ساتھ اور اس کا اپنے نام کے ساتھ سنا تھا۔ ایک تجسس آمیز اشتیاق میرے اندر اُٹا آیا۔ اسے دیکھنے کا خیال۔“

ان دنوں میں پندرہ سولہ سال کا تھا۔ میٹرک کے بعد نیا نیا کالج میں انٹر ہوا تھا اور آپ کو پتا ہے، وہ دور بہت سنہرا دور ہوا کرتا ہے، جب ساری دنیا اپنی ملکیت اور خود سے کم تر لگتی ہے۔ میں ایک دن چاچو سے ملنے کے بہانے آپ کے گھر چلا گیا تھا۔ میری خواہش تو پوری ہو گئی۔ چھ سات سال کی خوب صورت فراک میں ملبوس باربی ڈول دیسی ایمان مجھے اتنی اچھی لگی تھی کہ بار بار اسے دیکھنے کو جی مچنے لگا تھا۔

مگر وہاں میرے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہ ہوا تھا کہ میں دوبارہ پلٹ کر وہاں جانے کا سوچتا۔ میں بہت انا پرست اور خود پسند واقع ہوا ہوں۔ جبھی خود کو ڈی گریڈ نہیں کر سکا۔ پھر جب دو سال قبل چاچو نے آپ لوگوں کی تصویریں بھجوائیں تو میں نے ایمان کو دیکھا تھا اور تب صحیح معنوں میں نے خود کو اس کے آگے ہار دیا تھا۔ فضا.....! آپ یقین کریں، میرے جذبے جتنے بھی شدید سہی، مگر مجھے اپنی انا بہت عزیز ہے۔ میں کبھی یہ پسند نہیں کروں گا کہ وہ میری، میرے جذبات کی تحقیر کرے۔ اسی لئے خاموشی کے ساتھ ساتھ بے نیازی اوڑھ لی۔“

فضا نے اس کے خاموش ہونے پہ یوں سر جھٹکا جیسے اس سے قطعی متفق نہ ہوئی ہو۔

”اور میں سمجھتی ہوں، یہی آپ کی غلطی ہے ولی بھائی.....! آپ اسے بتائیں تو سہی، وہ پتھر تو نہیں ہے۔“

”وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے فضا جی.....! شاید فولاد سے بنی ہے۔ جذبات ضرور ہوں گے اس کے اندر، مگر وہ میرے لئے نہیں ہوں گے۔ پھر آپ کو پتا ہے ناں.....! جس بات کو وہ آپ کے لئے محسوس کر کے اتنا شدید ری ایکشن دے سکتی ہے، میرے متعلق جان لے تو شاید شوٹ کر دے مجھے۔“

وہ بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا۔ فضا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

اشعر آج یونیورسٹی سے آتے ہوئے چلغوزے، مونگ پھلیاں، ریوڑھی کے علاوہ اپنے مند پسند تل

کے لڈو بھی لایا تھا۔ اس کا ارادہ آج موج مستی کا تھا، جبھی پہلے گھر کے پچھواڑے کھلے کچن احاطے میں جس کے گرد تاؤ جی نے چار دیواری کر چھوڑی تھی، آگ کا الاؤ روشن کیا، پھر بڑے اہتمام سے پانچ کرسیاں اس کے اطراف سیٹ کیں، ایک چھوٹی سی ٹیبل پہ یہ کھانے کی تمام چیزیں رکھیں، خود چائے بنا کر تھرموس میں بھری اور ٹرے میں کپ سجا کر انہیں بھی ٹیبل پہ رکھ آیا۔

”اب آپ لوگ بھی اُٹھ جاؤ.....!“

اس نے نی دی کے آگے کسی ٹاک شو میں مگن عاقب، فضا اور ولید کو باری باری ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”مگر کیوں.....؟“

سب سے زیادہ اختلاف ولید کو ہوا تھا۔ وہ ابھی اُٹھ کر اسٹڈی کا ارادہ باندھ رہا تھا۔

”افق کے اس پار جہاں زمین و آسمان ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ زمین و آسمان کے ملاپ کا مطلب سمجھتے ہیں ناں.....؟“

اس کا لہجہ و انداز دونوں ہی معنی خیز تھے۔ فضا نے چونک کر دیکھا، جبکہ ولید نے گھور کر۔ عاقب ہنسنے لگا۔

”سمجھتے ہیں جناب.....! یہ بتاؤ.....! تم نے ولید کو آسمان کہا ہے یا زمین.....؟“

”میں اگر کچھ کہوں گا تو چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔ سمجھنے والے نادان تھوڑا ہی ہیں۔“

وہ خوب صورت مسکان کے ساتھ کن اکھیوں سے ولید کو دیکھ کر بدستور اس کا ہاتھ پکڑے ساتھ تھکھیت رہا تھا۔ ولید نے سنجیدہ مگر سر دنگا اس پہ ڈال کر گویا اسے حد میں رہنے کی تائید کی، مگر وہ بسور اُٹھا تھا۔

”پلیز ولی بھائی.....! ہر وقت میرے ٹیچر نہ بنا کریں۔ اس وقت میرا موڈ اچھا ہے۔ اپنے بہت قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا اس مسکین کو بھی دے دیں ناں.....! ساری عمر دُعائیں دے گا۔“

اس کے انداز میں ایسی لجاجت تھی کہ ولید گہرا سانس بھر کے جیسے بے بس ہو گیا۔

”پلیز.....! تشریف کے ٹوکرے رکھئے، میں ذرا ایک اور پہاڑ سر کر آؤں، تاکہ کورم مکمل ہو۔“

وہ دانت نکالتا واپس بھاگ گیا۔ فضا تو جیسے ماحول کے سحر میں گم ہو گئی تھی۔ تاریک سردرات، آسمان پہ کہیں کہیں ستارہ تھا، چاند سرے سے غائب، ایسے میں کھلے آسمان تلے جلتی آگ کے گرد اپنی من پسند شخصیت کی قربت کو محسوس کرنا بے حد خوب صورت احساس تھا۔

”محترم کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔“

عاقب چیئر سنبھال کر بیٹھ گیا۔ فضا نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ جب سے ولید نے وہ انکشاف کیا تھا، وہ فطری طور پر اس سے ہچکچا رہی تھی۔ اس وقت بھی خاموشی سے لفافوں میں سے چیزیں پلیٹوں میں منتقل کرتی رہی۔

”آپ بہت خاموش ہیں، خیریت.....؟“

عاقب نے کچھ اچھپنے میں گھر کر اسے دیکھا تھا۔ ولید، عاقب کے برابر چیئر سنبھالتے ہوئے خواہ مخواہ کھاکار مگر عاقب کا سارا دھیان فضا کی جانب تھا۔ وہ پہلے تو کبھی ایسے چپ نہیں رہی تھی۔ یہ تشویش فطری تھی۔

وہ چند ثانیوں کو خاموش ہوا، پھر گلا کھنکھار کر بڑے درد مند سے انداز میں شروع ہوا تھا۔

”نظروں سے نظریں ملائیں تو برا مان گئے

ہم نے آنکھوں سے کیا اشارہ تو برا مان گئے

محببتوں کا اظہار اپنوں نے بھی کیا تھا

حال دل ہم نے سنایا تو برا مان گئے

ہر بات پہ مسکرانا عادت تھی ان کی

ہم نے ذرا سا ہنایا تو برا مان گئے

ہمیں آزمانے کی بات کرتے تھے وہ اکثر

جب ہم نے آزمایا تو برا مان گئے

پیار میں بے وفائی نہ کرنا اکثر وہ کہا کرتے تھے

اس بات کو ہم نے دہرایا تو برا مان گئے

”یار.....! اسے برا ماننے کے سوا بھی کچھ آتا تھا.....؟ لعنت بھیج ایسی لڑکی پہ.....!“

عاقب کی طرف سے مفت مشورہ حاضر ہوا۔ اشعر نے فرمانبرداری سے سر ہلایا، پھر چلغوزوں کی پلیٹ

سے مٹھی بھر کے اپنی شرٹ کی جیب میں منتقل کی اور تیل کے لڈو اٹھا کر کھانے لگا۔ سب ہی کچھ نہ کچھ کھا رہے

تھے، سوائے ایمان کے، جو بند مٹھی ٹھوڑی پہ نکائے شال لپیٹے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پہ نگاہ جمائے

ہوئے تھے اور اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ولید اسے حفظ کر رہا تھا۔ چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں پکڑا

ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ گویا جیسے اسے دیکھتا ہوا پورے ماحول سے کٹ چکا تھا۔

”ولی بھائی.....! آپ کچھ سنائیے ناں.....!“

اشعر نے گویا اسے اس کی غلطی کا احساس بخشنے کو ہی چونکایا تھا۔ وہ ہڑبڑایا اور ایک دم خفت زدہ ہو گیا۔

پھر سب کے اصرار پہ اس نے گلا کھنکھار کر گویا ذہن کو بھی کھنگالا۔ نگاہ بے ارادہ اس کی سمت اٹھی اور جیسے لفظ آپ

ہی آپ زبان سے ادا ہونے لگے۔

”وہ ساحل کی ہوا جیسی گلابی پھول سی لڑکی

وہ تتلی شوخ رنگوں کی بہاروں کی تھی دیوانی

وہ جس کی خواب آنکھوں میں

ستارے جگمگاتے تھے

قدم رکھتی تھی آنگن میں

تو جگنو ٹھہر جاتے تھے

ادا جس کی محبت تھی

وفا جس کا قرینہ تھی

وہ لڑکی عشق کے جگنو کی مانند

”اینی پراہلم.....؟“

وہ اب کے کچھ بے چینی سے گویا ہوا تو ولید کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”نو..... نو پراہلم.....! بس.....! آگاہیوں کی زد پہ ہیں۔“

ولید نے کسی قدر شرارت سے کہا تو فضلہ نے بے اختیار مگر دھمکی آمیز انداز میں اسے گھورا۔

”خبردار جو مزید کچھ بولے آپ.....! ابھی اٹھ کے چلی جاؤں گی ورنہ۔“

”ہائیں ہائیں.....؟ یہ غضب مت کیجئے، چراغوں میں روشنی نہیں رہے گی۔“

مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے وہ مسلسل اسے زچ کرنے کے موڈ میں تھا۔

”آپ اپنے چراغوں کی روشنیوں کی خیر منائیے.....! موصوف ابھی پہاڑ سر کر کے لوٹے نہیں ہیں۔“

وہ سخت چڑ کر بولی۔ ولید اس کی جھنجھلاہٹ پہ اور بھی زور سے ہنس پڑا۔

”ہماری بات مت کیجئے.....! ہم صابروں کے قبیلے میں سے ہیں۔“

”تو آپ باز نہیں آئیں گے.....؟“

فضلہ نے آنکھیں نکالیں۔

”نہ ہماری مجال.....! یہ لیں، ہونٹوں پر اُنکلی بھی رکھ لی۔“

وہ سمجھنے کی اداکاری کرنے لگا۔ عاقب دلچسپی سے ان کا مکالمہ سن رہا تھا۔ پھر کچھ کئے بغیر ذرا سا آگے

جھک کر ٹی پارٹ سے چائے کپ میں نکالنے لگا۔

”ویسے سر.....! آپ کی خام خیالی ہے کہ موصوف کچھ جانتے نہیں ہیں۔ گھنے ہیں پورے، ہماری

گفتگو کے ایک ایک حرف سے آگاہ تھے کہ ہم کون سی ٹون میں، کس کے حوالے سے بات کر رہے تھے.....؟“

وہ خاموش رہ جائے، یہ تو اب ناممکن تھا۔ فضلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر شدید خفت کے عالم میں

اسے ایک گھونٹہ دے مارا تھا۔ وہ خواہ مخواہ بلبلانے لگا۔

”مائی گاڈ.....! ریسٹر تو نہیں رہی ہیں آپ کسی دور میں.....؟ مجھے تو عاقب کی ہڈیوں پسلیوں کی فکر

لاحق ہو گئی ہے۔“

فضلہ کوئی جواب دینا چاہ رہی تھی، مگر اشعر کے ساتھ ایمان کو آتے دیکھ کر اسی سمت متوجہ ہو گئی۔

”دن میں نہائی تھیں محترمہ.....! مگر آنے سے اس وجہ سے انکاری تھیں کہ سردی لگ رہی ہے۔ اسی

لئے تو کہتا ہوں، کھایا پیا کریں، ماڑی جان کے سویا پے ہوتے ہیں۔ بیٹھیں یہاں.....!“

اشعر نے اسے جو کرسی پیش کی تھی، وہ ولید کے برابر تھی، اس نے دانستہ اس کرسی کو چھوڑا اور جا کے

فضلہ کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اب وہ ولید کے بالکل مد مقابل تھی۔ درمیان میں آگے روشن تھی۔ نارنجی

شعلوں کا قرض جاری تھا اور ان کی تپش اس کے ہوش رہا چہرے کو کچھ اور بھی حسین تر بنا کر دکھا رہی تھی۔ ولید کی

نگاہ اپنے اختیار سے باہر ہونے لگی۔

”آپ سب کو اندازہ تو ہو گیا ہوگا، ہم یہاں وقت کو یادگار بنانے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ آغاز اشعر

حسن شاہ کریں گے، پھر حسب توفیق سب کو اپنا ذوق آشکار کرنا پڑے گا، اور یہی اس محفل میں بیٹھنے کی شرط ہے۔“

اندھیری رات میں اکثر
جلا کرتی تھی تاکوں میں“

دھیمادھیم، پڑاثر، گنہیر تر لہجہ، دلکش اُتار چڑھاؤ کے ہمراہ اتنا پُر جذب تھا کہ ایمان الفاظ کے ساتھ
ساتھ لہجے کی گنہیرتا میں بھی کھوئی بے اختیار اسے ہنسی چلی گئی، جو آنکھیں بند کئے گویا تصویر کی کسی دنیا میں گم تھا۔
”دہمبر کی ٹھہرتی شب اچانک ہی وہ بچھری تھی

مجھے اس نے محبت کے کنارے پر کھڑا کر کے

چھڑایا ہاتھ چپکے سے

مجھے بے رنگ کر ڈالا

گلابی پھول سی لڑکی

وفا جس کا قریب نہ تھی

بہت ہی بے وفا نکلی“

وہ خاموش ہوا تو گویا اس کی آواز کے ساتھ بندھ جانے والا ایک طلسم بھی بکھر گیا۔ ایمان چونک کر
سیدھی ہوئی۔ وہ نارمل سے انداز میں اپنے منگ میں بیچی ہوئی چائے ختم کر رہا تھا۔ ایمان نے خود کو اس کیفیت
سے نکالنے کی غرض سے ٹیبل سے آگے کی سمت جھک کر چلنوزوں کی پلیٹ اٹھانا چاہی، عین اسی پل ولید نے بھی
خالی منگ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ بغیر کسی شعوری کوشش کے بے دھیانی میں دونوں کے ہاتھ ٹچ ہوئے تھے، جسے
اگلے ہی لمحے ایمان نے سرعت سے کھینچ لیا۔ مگر یہ لمحاتی لمس گویا اس کے وجود میں شرارے بھر گیا تھا۔ اس نے
اپنی کیفیت پر حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ ہنوز نارمل اور بے نیاز نظر آتا تھا۔

اشعر اسے کچھ سنانے پر زور دے رہا تھا۔ وہ ایک دم جھنجھلا گئی۔

”فضہ یا عاقب بھائی سے کیوں نہیں کہتے؟“

”آپ کو بھی تو کچھ نہ کچھ سنانا ہے ناں.....! سنا دیں ابھی۔“

اشعر کو پتا نہیں کیوں ضد ہو گئی تھی۔

”سنا دوں گی تمہیں کھری کھری.....! فی الحال فضہ سے سن لو۔“

اس نے بے زاری سے کہتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے تو اشعر کا منہ بن گیا۔

”ٹھیک ہے.....! نہ سنائیں، مگر اب آپ کی سزا بڑھ گئی ہے۔ صرف شاعری سے کام نہیں بنے گا۔

آپ کو گانا بھی سنانا ہوگا، اور میں بالکل کوئی دھاندلی برداشت نہیں کروں گا۔“

”اوکے اوکے.....! اب ہم کچھ عرض کریں۔“

عاقب نے مداخلت کرتے ہوئے گویا جھگڑا اپنایا۔ اشعر نے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

”وہ شخص کبھی دشت سے گزرے تو اسے کہنا

اک پل میرے گھر میں بھی ٹھہرے اسے کہنا“

”ہائیں.....؟ میں تو کچھ اور سمجھا تھا، یہ کس سمت اشارہ کر رہے ہیں.....؟“

اشعر کی اداکاری عروج پہ تھی۔ ولید نے اسے گھورنے پہ اکتفا کیا تھا۔

”کہنا کہ سمندر کے کنارے پہ نہ جائے

کچھ لوگ سمندر سے بھی گہرے ہیں اسے کہنا

زرخیز زمین کبھی بنجر نہیں ہوتی

دریا بدل لیتے ہیں رستہ اسے کہنا

کچھ لوگ سفر کے لئے ہوتے نہیں موزوں

کچھ راستے تنہا نہیں کلتے اسے کہنا

اس شہر میں سچ کہہ کے گنہگار نہ ہونا

کہ بستی کے سبھی لوگ ہیں بہرے اسے کہنا“

”یہ آخری شعر عاقب بھائی نے صرف آپ کے لئے کہا ہے ولی بھائی.....! میں شرط لگا سکتا ہوں۔“

”تم اتنے انوالومت ہو چھوٹے.....!“

ولید کی بے رخی کے مظاہرے پر اشعر کو بھی تپ چڑھ گئی۔

”اطلاعا عرض ہے، یہ میری ہی کوشش کا نتیجہ ہے کہ آپ اس وقت زندگی کے حسین لمحات گزار رہے

ہیں۔“

”عاشو.....!“

اس کے دھڑلے سے احسان جتانے پہ ولید نے اپنی بڑائی کا احساس دلانا ضروری خیال کرتے

ہوئے آنکھیں دکھائیں تو وہ مسکینیت سے سر کھجا کر فوراً شرافت کے جامے میں آگیا اور محض اشارے سے فضہ کو

جتایا کہ اب اس کی باری ہے۔ وہ گلا کھنکار کر مسکرائی، پھر سب کو مخاطب کر کے بولی۔

”دلظم چونکہ مجھے بہت پسند ہے، اس لئے سنا رہی ہوں۔ کسی سے منسوب کرنے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے تو اپنے تئیں حفظ ماتقدم کے طور پر کہا تھا، مگر بری طرح سے دہل گئی۔

”ہمارا بھلے ارادہ نہ ہو، آپ نے خود کہہ کر مشکوک کیا ہے۔“

ولید پہلی بار کچھ بولا، جب سے ایمان آکر بیٹھی تھی۔ اس کے شرارتی انداز اور بے تکلفی پہ کسی قدر

تیکھی نگاہ سے ولید کو دیکھا، مگر وہ متوجہ نہیں تھا۔

”بالکل بالکل.....!“

اشعر نے بھی بھرپور طریقے سے ولید کی ہاں میں ہاں ملا کر گویا اس شرارت کو طول دیا۔

”میں نہیں سنا رہی ہوں، اگر آپ لوگوں نے مجھے اس طرح تنگ کرنا ہے تو.....!“

یہ دھمکی کا رگر ثابت ہوئی اور اشعر فوراً خاموش ہو گیا۔ تب فضہ نے ابتداء کی تھی۔

”دوست یار ملتے ہیں

ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ساتھ ساتھ چلتے ہیں

رنجشیں تو ہوتی ہیں
رنجشوں میں کہیں
چاہتیں تو ہوتی ہیں
چاہتوں کی بھی ہر پل
اک عجب کہانی ہے
ہونٹ ہنستے رہتے ہیں
آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
بھگی بھگی آنکھوں میں
خواب جلتے رہتے ہیں
درد کے اس سفر میں
کچھ موڑ ایسے آتے ہیں
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
ساتھ چھوٹ جاتے ہیں
کرچیاں اٹھانے میں
وقت بیت جاتا ہے
درد جیت جاتا ہے

اس دوران ایک بار بھی گو کہ اس نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں، مگر کسی کی گرم نگاہوں کی تپش اپنا احساس بخشی رہی تھی۔ سب سے زیادہ اشعر نے اسے داد دی۔
”بجا فرمایا! بالکل بجا فرمایا!“
فضہ مسکرانے لگی، ریلیکس سے انداز میں۔
”تھینک گاڈ! تمہیں پسند تو آئی، ورنہ میں ڈر رہی تھی، ٹریجک شاعری ہے، کہیں تم لوگ خفا نہ ہونے لگو۔“
”خفا کیوں ہوں گے؟ ہر کسی کی اپنی پسند ہے۔ ویسے خدا آپ کو ہمیشہ شاد و آباد، خوش و خرم رکھے، آمین!“

عاقب کا انداز بزرگانہ سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ اشعر کو مصنوعی کھانسی نے آن لیا۔
”ایک! ہے کچھ یاد؟“

فضہ نے بڑی نرمی سے ایمان کو مخاطب کیا تھا، وہ جو اپنے کسی خیال میں تھی، چونک اٹھی۔
”بنا دیتی ہوں۔“

”لیکن کھری کھری نہیں! پلیز! آخر میری بھی کوئی عزت ہے۔“
اشعر نے بے ساختہ دونوں ماتھے اٹھا دیئے۔

”جی جی! ورنہ اس سے قبل ہم مشکوک تھے، ابھی ابھی پتا چلا ہے۔“
وہ ہنستے ہوئے اس کی درگت بنانے لگی۔

”اس بات کو چھوڑیں، اپنے ٹریک پر آئیں۔“

اشعر نے نخوت سے کہا تو ایمان نے کاندھے اچکا دیئے۔

”میرے باطن کو ظاہر کی حمایت مار ڈالے گی

دلِ برباد تجھ کو تو یہ وحشت مار ڈالے گی

کسی ہم سر سے خائف ہوں نہ اندیشہ ہے دشمن کا

میں انسان ہوں مجھے میری ہی نفرت مار ڈالے گی“

”بالکل بالکل! بجا فرمایا۔ اگر ہم کہتے تو محترمہ نے غصہ کر لینا تھا۔“

اشعر نے بیٹھے بیٹھے ہنگڑا ڈالا۔

”یہ فاول ہے، یہ میری ذاتی کاوش نہیں ہے۔ چپ کر کے سنو! ورنہ میں واک آؤٹ کر جاؤں

گی۔“

ایمان نے چیخ کر کہا، مگر وہ تھا باز آنے والوں میں سے.....؟“

”وہ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ

لاکھ پردوں میں رہوں، بھید میرے کھولتی ہے

شاعری سچ بولتی ہے

”تو جنابہ! اس شعر میں ہر خاص و عام کو شامل کیا گیا، بلکہ گھسیٹا گیا ہے، کیا سمجھیں.....؟“

”تم چپ کر کے بیٹھو! سمجھو.....؟ سچ میں نر زمرمت کرو۔“

وہ جھڑک کر بولی تو اشعر بری طرح سے برا مان گیا۔

”نر زمر.....؟ یعنی آپ نے مجھے مینڈک بنا دیا.....؟“

وہ چیخا۔

”بنانے کی کیا ضرورت ہے.....؟ تم ہو.....!“

وہ اسے چڑتا دیکھ کر اور چڑانے لگی۔ اصل بات سچ میں ہی رہ گئی، جس کی طرف فضہ نے دھیان

دلایا تو وہ پھر سے پڑھنے لگی۔

”لئے پھرتے ہیں ہاتھوں میں قضا کا پیش نامہ جو

انہیں اک روز ہونے کی ندامت مار ڈالے گی

خفا ہو کر زمانے سے کہاں جائے گا میرے دل

تجھے پڑ خار راہوں کی مسافت مار ڈالے گی

جلا رکھے ہیں راہوں میں دیے جو رسمِ اُلفت کے

انہیں قاتل ہواؤں کی حقارت مار ڈالے گی

کہا اس نے جہاں چھوڑو فقط میرے ہی ہو جاؤ
تمہیں عیار دنیا کی رفاقت مار ڈالے گی
میری تقصیر اتنی ہے میں رسوں کی نہیں قائل
مجھے اپنی ہی مٹی سے بغاوت مار ڈالے گی
تھکا ڈالا ہے جیون کو تیری مقروض سانسوں نے
مجھے اے زندگی! تیری ضرورت مار ڈالے گی
”تھینک یو.....! سوویری مچ.....!“

اشعر بے حد عاجزی سے کارلش بجانے لگا۔
”فارواٹ.....؟“

وہ نخوت وہ انداز میں بھنوں کو جنش دے کر بولی۔
”بڑی بات ہے.....! آپ نے ہماری بات مان لی۔ بھئی.....! اونچے مجاہدوں والی ہیں آپ.....!“
اشعر کی وضاحت پہ اس نے گردن اکڑالی۔
”ہاں بالکل.....! یہ تو ہے.....!“
فضہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”اب بس بھی کرو بونگیاں مارنا.....!“
اس نے دونوں کو ایک ساتھ ٹوکا۔

”ویسے اگر ہم اس وقت شاعری کے انتخاب میں ایورڈ دینا چاہیں تو کسے ملنا چاہئے.....؟“
عاقب کی بات پہ سب سے پہلے اشعر کا ہاتھ اٹھا تھا۔

”مجھے.....! مجھے.....! اس کی وضاحت پیش کرتا ہوں کہ یہاں ساری بسورتی، روتی صورتیں بیٹھی
ہیں، میں نے کامیڈی کلام پیش کیا ہے۔“

”جی نہیں.....! بات معیار کی ہونی چاہئے۔ بہر حال آپ کا کلام ہرگز معیاری نہیں تھا۔“
ایمان نے ناک چڑھا کر کہا تو اشعر فوراً ہی لڑائی کو تیار ہو گیا تھا۔

”آپ کا تو جیسے بہت معیار تھا.....؟ اونہہ.....!“
”ایوارڈ کے لئے تو مینشن عاقب بھائی کریں گے۔“

ایمان نے گویا اسے چپ کرانا چاہا۔

”ایوارڈ کیا ہے.....؟ پہلے یہ تو جان لو.....!“

فضہ نے اہم نقطے کی سمت توجہ دلائی اور اشعر کھی کھی کرنے لگا۔

”بالکل بالکل.....! بھلے یہ مونگ پھلی اور چلغوزوں کے چھلکے اٹھا کر آپ کو پیش کر دیں۔“

اس کی بات پر ایک زبردست قہقہہ پڑا تھا۔ ایمان ایک لمحے کو کھسیا گئی۔ پھر عاقب کی سمت متوجہ ہو کر

بولی تھی۔

”پہلے ایوارڈ کی رونمائی کیجئے بھائی.....!“

”چونکہ اس بات کی سمت پہلے توجہ نہیں تھی، لیکن ہم جیتنے والے کو کچھ نہ کچھ بہر حال ضرور دیں گے۔“

اونٹ دری.....!“

عاقب نے اس سنجیدگی سے جواب دیا، جس کا وہ اب تک مظاہرہ کر رہا تھا۔

”او کے فائن.....! تو بتائیے.....! آپ کے خیال میں کون رہا ہے ورنہ.....؟“

”ولید حسن.....!“ گلابی پھول سی لڑکی“ میدان لوٹ لیا بچی یار.....! تم نے۔“

عاقب حسن نے بلا تخفیف کہا تو جہاں ولید چونکا تھا، وہاں ایمان کا منہ بن گیا۔ جبکہ عاقب، ولید کا

شانہ تھپک رہا تھا۔

”اونہہ.....! اپنے بھائی کو ہی جتایا ناں.....؟“

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اشعر بے ساختہ مسکرانے لگا، شوخ رنگ چھلکاتی مسکان۔

”یہ جیت بھائی کی نہیں، درحقیقت آپ کی ہے، اگر سمجھیں تو.....!“

ذو معنی لہجہ ایمان کو ٹھنکا گیا۔ اس نے دیکھا نہیں، ولید حسن نے اپنی جگہ پہ پہلو بدلا تھا اور بہت سنگین

قسم کی نظروں سے اشعر کو گھورا جس میں تنبیہ تھی۔ اشعر کا پتہ پانی ہو کر رہ گیا۔

”ایکسپلین کرو.....! مطلب کیا ہے تمہارا.....؟“

وہ تو جیسے اسی بل اس پہ چڑھ دوڑی تھی۔ تاثرات بے حد خوف ناک تھے۔

”آپ کو پتا ہے ناں.....! زبان میں ہڈی نہیں ہوتی۔ بے چاری گوشت کا لوتھڑا، بے وجہ بھی پھسل

جاتی ہے۔ میرا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں، اٹھ کر بھاگ گیا۔ ایمان اپنی شال میں الجھتی ہوئی اس کے پیچھے

لپکی۔ عاقب گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ فضہ چائے کے برتن اکٹھے کر کے ٹرے میں رکھنے لگی۔ ولید اٹھ کر چل

دیا، مگر اس کی چال میں اضمحلال تھا۔

☆☆☆

”اس کی چاہت کا صلہ یاد نہیں

یاد ہے جرم، سزا یاد نہیں

توڑ کر ہمسفری کا رشتہ

وہ کہاں چھوڑ گیا یاد نہیں

اپنے گرنے کا سبب یاد تو ہے

کس بلندی سے گرا یاد نہیں

یاد ہے اس کا بچھڑنا ہم کو

پھر ہمیں جو بھی ملا یاد نہیں“

رات چونکہ وہ بہت دیر تک جاگی تھی، تبھی صبح آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ اوپر مکمل طور پر خاموشی

تھی۔ وہ فریش ہونے کے بعد نیچے آگئی تو صحن میں کچھ چارپائی پہ موبائل فون پڑا تھا، جس پہ یہ غزل چل رہی تھی۔ وہ نظر انداز کئے کچن کی سمت بڑھ گئی کہ ڈیوڑھی میں کھڑی بایک کو پاپ لگا کر دھوئے ولید کو دیکھ کر وہ اتنا تو جان گئی تھی کہ یہ سیل فون اسی کا ہے۔

کچن صاف ستھرا تھا اور فضا کچن میں نہیں تھی۔

”فضہ.....! فضہ.....!“

جب نیچے کے دونوں کمرے بھی چیک کر لئے تو اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر فضا کو آواز دی تھی۔ دادا اپنے کمرے میں سو رہے تھے جبکہ تائی ماں کا کمرہ خالی تھا۔ ولید کے کمرے اور بیٹھک میں اس نے اس لئے نہیں جھانکا کہ وہاں فضا کی موجودگی کا امکان بہت کم تھا۔

ولید حسن نے اس کی پکار پہ مڑ کے دیکھا۔ گلابی لانگ سکرٹ اور بلیو ٹاپ پہنے، لائبنے بالوں کی چوٹی بنائے، سر پہ ادنی گلابی ہی ٹوپی تھی۔ وہ کوئی خوب صورت نازک سی گریڈ دکھائی دے رہی تھی۔

”فضہ گھر پہ نہیں ہیں۔ اماں اور چاچی جان کے ساتھ حرا آپا کی طرف گئی ہیں۔ شاید ثانیہ کی شاپنگ کے سلسلے میں۔“

ولید حسن نے اس کی تسلی کی خاطر جامع اور تفصیلی جواب دیا تھا۔ وہ جو پانی کی دھار کے ساتھ بایک کے پہیوں سے گلے پانی کو بہہ کرتیزی سے نشیب کی طرف جاتے دیکھ رہی تھی، بری طرح سے ٹھکی۔

”وار.....! یعنی وہ سب لوگ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے.....؟“

وہ پہلے زور سے چیختی تھی، پھر یہ انداز خود کلامی اور انتہائی ٹمگین ہو کر رہ گیا تھا۔

”ڈونٹ وری.....! اشعر کے علاوہ ددا بھی گھر پہ ہیں۔“

اسے لگا تھا وہ مسکرایا ہے۔ ایمان کا روم روم سلگ اٹھا۔ وہ پیر پختی ہوئی دوبارہ کچن میں جا گھسی۔

”سوئی ہوئی ہی تھی ناں.....! مروتو نہیں گئی تھی کہ مجھے ناشتہ بھی کرنا تھا، کم از کم کھانے کو تو کچھ دے جاتی مجھے۔ جانتی بھی تھی مجھے کچھ بنانا نہیں آتا۔“

ڈھلے ڈھلائے برتن چٹختے ہوئے وہ اتنی زور زور سے بول رہی تھی کہ باہر ڈیوڑھی میں مصروف ولید تک اس کی آواز بآسانی جا پہنچی۔ اسے اس کے موڈ کی خرابی کا اندازہ ہوا تو پاپ پھینکا، ٹل بند کیا اور ہاتھ دھو کر کچن کی سمت بڑھ آیا جہاں بڑبڑاہٹوں اور برتن چٹختے کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔ وہ اسے متوجہ کرنے کو کھنکھارایا۔ ایمان جو غم و غصے کی زیادتی میں اس کے وجود کو فراموش کر بیٹھی تھی، چونک کر متوجہ ہوئی اور سلگتی نظروں سے اسے گھورا۔

”جی فرمائیے.....؟“

عجیب انداز تھا، تنفر سے بھرپور۔

”میں آپ کی مدد کر دیتا ہوں، اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو.....؟“

وہ بہت محتاط سے انداز میں بولا تھا۔ ایمان نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا کریں گے.....؟ ناشتہ بنا کر دے سکتے ہیں مجھے.....؟“

”جی.....! آئی تھنک.....!“

وہ مسکرایا اور آگے بڑھ آیا۔ فریج کھول کر انڈے اور ڈبل روٹی نکالی، ساتھ میں دودھ کا برتن بھی۔

تینوں چیزیں سلیپ پر رکھیں، پھر مچس اٹھا کر مٹی کے تیل کا چولہا جلانے لگا۔

بلیک جینز جس کے پانچے فولڈ کر رکھے تھے، آسمانی شرٹ کی دونوں آستینیں کہنیوں تک موڑی ہوئی تھیں۔ ماتھے پہ بکھرے بالوں سمیت وہ اس عام سے حلیے میں بھی ہرگز نظر انداز کئے جانے والا نہیں تھا۔ وہ اس کی خاطر اپنا کام اُدھورہ چھوڑ آیا تھا اور اب اس کی بھوک کا خیال کرتے ہوئے خود اس کے لئے اہتمام کر رہا تھا۔ اس انداز کی یہ اہمیت اس کے اندر ایک انوکھا احساس جگانے لگی۔

پہلی بار ایمان کو اس کی جاذب نظر پرسنالٹی کا ادراک ہوا۔ وہ عجیب قسم کی کیفیات کا شکار ہوتی، بے دھیانی میں مسلسل اسے تھکنے لگی اور یقیناً یہ اس کی نگاہوں کے ارتکاز کا ہی نتیجہ تھا کہ سلاؤس گرم کرتے ہوئے ولید نے مصروفیت کے عالم میں سرسری سا سر اٹھا کر دیکھا اور اسے یوں یک ٹک نکتہ پا کر ہلکا سا چونکا۔

”پلیز.....! صرف پانچ منٹ ویٹ کریں۔“

وہ سادگی و متانت سے بولا۔ ایمان نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔

”یہ لیجئے.....! آپ کا گرماگم ناشتہ.....!“

وہ واقعی اگلے چند لمحوں میں ٹرے اس کے سامنے لے آیا تھا۔

”ہاف فرائی انڈہ، سکے ہوئے سلاؤس، چائے کا مگ اور دودھ کا گلاس۔ اسے یہ دیکھ کر گھرے استعجاب نے آن لیا کہ یہ وہی ناشتہ تھا جو وہ ہر روز کرتی تھی۔ اس نے متحیر نگاہوں کو اٹھایا اور جیسے خائف سی ہو گئی۔ وہ جھک کر ٹرے اس کے سامنے رکھ گیا تھا۔ اس کا لمبا چوڑا مضبوط وجود ایک لمحے کو سہی، گویا اس کے نازک سراپے پہ چھا سا گیا تھا۔ اس کے منہ سے اٹھتی آفرشیو لوشن کی مہک نے اس کے حواسوں کو ہلکا کر دیا تھا۔ محض ایک لمحے کی بات تھی، مگر وہ اسی ایک لمحے میں جیسے گم ہو گئی تھی۔

ولید حسن نے پھر سے پلٹ کر بہت سلیقہ مند گھٹڑ خاتون کی طرح دودھ کا برتن، بریڈ کا پیکٹ واپس فریج میں رکھے اور انڈوں کے چھلکوں کو کچن میں ہی سائیڈ پہ دھری ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ دھونے والے برتن اٹھا کر سنک میں رکھ دیئے۔ ہر شے پہلے کی طرح معمول پر آگئی تھی، سوائے ناشتہ کرنے والی کے۔

”سنیں.....!“

وہ پلٹ کر دروازے سے نکل رہا تھا، جب وہ بے اختیار پکار بیٹھی تھی۔

”جی.....!“

وہ وہیں سے گردن موڑ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ انداز میں وہی بے نیازی اور ٹھہراؤ تھا۔

”یہ سب کیوں کیا آپ نے.....؟ آئی مین.....“

وہ کچھ کہہ نہیں پائی تو ہونٹ بھینچ لئے۔ ولید جیسے اس کی ان کہی بات سمجھ کر رواداری سے مسکرایا تھا۔

”آپ ہماری مہمان ہیں، آپ کی ضرورت کا خیال رکھنا ہماری ذمہ داری.....!“

نری سے اپنی بات مکمل کر کے وہ باہر نکل گیا تھا۔ ایمان سر جھٹک کر ناشتہ کرنے لگی۔ مگر یہ سچ تھا کہ

دل کہیں اندر ہی اندر پہلی بار اس کی اچھائی کا قائل ہوا تھا۔

☆☆☆

”تو کیا جانے لگی کوئل!“

کون مجھے تڑپاتا ہے

جاگی سوئی آنکھوں والا

دل میں اُترا جاتا ہے

کتنے کوئل کوئل چہرے

میری راہ میں آتے ہیں

لیکن وہ اک سندر چہرہ

سپنوں میں آ جاتا ہے

اس کا درد چھپا کر دل میں

غزلیں لکھتے رہتے ہیں

ہر موسم کی پہلی بارش

اس کی یاد دلاتی ہے

بادِ صبا کا ہر اک جھونکا

اس کی یاد دلاتا ہے

تو کیا جانے لگی کوئل!

کون مجھے تڑپاتا ہے

اسی پچھلے آنگن میں کل اشعر نے اس کے لئے ٹاہلی کے پیڑ میں جھولا ڈالا تھا۔ اسے اپنے کارنامے سے آگاہ کرنے کو ساتھ لاکر دکھایا، داد و صل کی اور پھر خود ہی جھولتا رہا۔ ایمان نے دو تین مرتبہ اسے خالی کرنے کو کہا تو دانت نکوس کر ہر بار ٹکا سا جواب دے ڈالا۔

”یہ تو بڑے مزے کا کام ہے۔ کاش میں ساری زندگی بچہ ہی رہتا۔ اماں مجھے جھولے میں ڈالے جھلاتی رہتیں۔“

”یہ تم نے اپنے لئے بنایا ہے یا میرے لئے؟“

ایمان کا جب ضبط جواب دیا تو دانت پیس کر بولی۔

”ڈالا تو آپ کے لئے ہی تھا۔ اماں نے کہا تھا، بچی سارا دن اُداس بلبل بنی رہتی ہے، جھولا ڈال

و۔“

”اب تم اُترو گے یا میں تائی ماں کو شکایت کروں تمہاری؟“

اسے یکا یک غصہ آنے لگا۔

”یہ لیجئے.....! اُتر گیا۔ ویسے آپ کو اتنی بے تاب کیوں ہو رہی ہے جھولے یہ بیٹھے کی.....؟ یہ گانا

کا میں گی کیا.....؟

باغوں میں پڑے جھولے

تم ہمیں بھول گئے

ہم تم کو نہیں بھولے.....!“

وہ لہک لہک کر گانے لگا۔ ایمان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”مسخرے ہو پورے.....!“

”ویسے وہ ہیں کون جن سے آپ یہ شکوہ کریں گی.....؟“

وہ راز داری سے اس کی جانب جھکا۔ ایمان نے جھلا کر اسے پوری قوت سے پیچھے کی جانب دھکیل

دیا۔

”خود سے پوچھو، کیونکہ یہ گانا میں نہیں، تم گارہے ہو۔“

”ایچی.....! اشعر.....! واپس آؤ.....! تائی ماں بلا رہی ہیں۔“

فضہ دروازے میں کھڑی پکار رہی تھی۔ ایمان نے ہاتھ ہلا دیا۔

”آتے ہیں کچھ دیر میں۔ تم چلو.....!“

”افوہ.....! ابھی آؤ.....! تائی ماں کہہ رہی ہیں، اس ٹائم پہ درختوں کے نیچے کھڑے ہونے کی

ضرورت نہیں۔“

فضہ نے دہن سے ہانک لگا کر کہا اور ساتھ لے کر ہی ملی، جس پر ایمان کو تاؤ سا آ گیا تھا۔

”اس وقت کیا ہوتا ہے.....؟ فضول کی باتیں.....!“

”مغرب کا وقت ہونے والا ہے مادام.....! اور سنا ہے، اس وقت بھوت پریت اپنے گھروں کو لوٹتے

ہیں، اگر خوب صورت لڑکی کہیں نظر آ جاتے تو عاشق ہو جاتے ہیں۔“

وہ سر جھٹکتے ہوئے دروازہ عبور کر کے گھر کے اندر آئی تو تائی ماں مل کے پاس بیٹھیں کھیت سے آئیں

گا جریں دھو کر ٹوکری میں رکھ ہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر تازہ مولیاں اور اور گئے بھی بندھے پڑے تھے۔ تاؤ جی ابھی

پچھ دیر قبل ہی کھیتوں سے لوٹے تھے۔

”گجریلا پسند ہے دھی رانی کو.....؟“

وہ ایک دھلی ہوئی گاجر اٹھا کر کھا رہی تھی، جب تائی ماں نے اپنے مخصوص، پر شفقت انداز میں اسے

مخاطب کیا۔

”گجریلا.....؟“

وہ قطعاً نہیں سمجھی تھی۔

”گا جر کا حلوہ.....!“

اشعر نے کچن کے دروازے کی چوکھٹ سے کاندھانکا کر گویا اس کی مشکل آسان کی۔

”اوہ.....! جی.....! کھا لیتی ہوں۔“

وہ مسکرانے لگی۔ تائی ماں کا جیسے سیروں خون بڑھ گیا۔

”آج بناؤں گی اپنی دھی کے لئے، ویسی کچی اور کھویا ڈال کر۔ ولید بھی شوق سے کھاتا ہے۔“

تائی ماں نے گویا اطلاع دی تھی، مگر وہ فضلہ کی سمت متوجہ ہو گئی۔

”کیا پکایا ہے آج.....؟“

گھر میں چکراتی پکڑوں کی مہک محسوس کر کے اس نے بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے استفار کیا۔

”کرھی.....! بھوک لگی ہے تو روٹی ابھی ڈال دوں تمہارے لئے.....؟“

فضلہ نے کچن کی کھڑکی سے جھانکا، مگر وہ منع کرتی ہوئی بیڑھیاں چڑھ گئی۔

ماما اپنے کمرے میں بستر میں لیٹی سیل فون پر مصروف تھیں، یقیناً بابا سے بات کر رہی تھیں۔

”کب ہوگا یہ مسئلہ حل.....؟ کب تک پڑے رہیں گے ہم یوں کسی کے در پر.....؟ میری بیٹی یہاں نوکرانی بنی ہوئی ہے۔ آپ کو احساس ہے کچھ.....؟“

ایمان اُلٹے قدموں باہر نکل گئی۔ اس کے دل پہ ایک بوجھ سا آگرا تھا۔

”ماما صحیح کہتی ہیں۔ کتنی آکورد پوزیشن ہو گئی ہے ہماری.....!“

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو ہونٹ بھیج کر دیوار کے ساتھ لگی چارپائی بچھا کر تھکے ہوئے انداز میں اس پر بیٹھ گئی۔

”ایمی.....! ایمان گڑیا.....!“

تبھی عاقب حسن اسے پکارتا ہوا اوپر آ گیا۔ اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹکا۔

”خیریت.....؟“

اس کی نگاہوں میں اُلجھن تھی۔

”جی.....! آپ کو کچھ کام تھا.....؟“

اس کا لہجہ پھر سے وہی نخوت اور تلخی سمٹ لایا تھا، جو یہاں آنے کے بعد سے اس کے انداز میں رچ بس گئی تھی۔

”یہ تمہاری نوٹ بک اور قلم ہے، تم گاڑی میں ہی چھوڑ آئی تھیں۔“

ہاتھ میں پکڑی دونوں چیزیں اس کی سمت بڑھاتے ہوئے وہ متانت سے بولا تھا۔

”تھینکس.....! آپ کو زحمت ہوئی۔“

اس کا لہجہ ہنوز تھا۔ عاقب کو اس کے موڈ کی خرابی کا احساس ہوا تو کچھ دیر کیوں خاموش ہو گیا جیسے اس پجوائیشن کو ہینڈل کرنے کا مناسب حل سوچ رہا ہو۔

”میں نے آپ سے ایک بار پہلے بھی کہا تھا ایمان.....! کہ اپنوں میں یہ سب نہیں ہوتا۔ ایک ذرا سی نوٹ بک اور قلم آپ تک پہنچانے میں بھلا میری کتنی انرٹی ویسٹ ہوئی ہوگی.....؟ سویٹ ہارٹ.....! ایسی ننھی مٹی باتوں کو ذہن پہ سوار مت کیا کرو۔ ابھی تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ انجوائے یور سیلف.....!“

وہ اس کا سر تھپک کر واپس مڑ گیا۔ لہجے میں حلاوت، ٹھہراؤ اور رسائیت کے ساتھ محبت و اپنائیت کا

میں احساس تھا۔ وہ آنسو بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آکر چپ ہاپ بستر میں گھس گئی۔

ماما شاید واش روم میں تھیں، ان کا سیل فون مسلسل بج رہا تھا، مگر وہ کان بند کئے پڑی رہی۔ بالآخر گھنٹی بند ہو گئی، مگر چند لمحوں کے توقف سے اس کے سویٹر کی جیب میں پڑا اس کا اپنا سیل فون وائبریٹ کرنے لگا تھا۔ وہ سمجھ گئی، پاپا کال کر رہے ہیں۔ سویٹر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے اسکرین پر نگاہ کئے بغیر آف کا بٹن دبا دیا۔

”یا۔“

”اگر آپ کو ہماری اہمیت اور عزت نفس کا احساس نہیں ہے تو ہمیں بھی آپ کی بات نہیں سننا۔“ وہ ایک بار پھر ان سے شدید خفا ہو چکی تھی۔ آنسو بہاتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی.....؟ دوبارہ اس وقت کھلی جب فضلہ نے اسے زبردستی جگایا تھا۔

”واٹ نان سنس.....! کیا طوفان آگیا ہے کوئی.....؟“

وہ نیند خراب ہونے پہ دھاڑی تھی۔

”کھانا کھا لو.....! پھر سو جانا.....!“

فضلہ بیچاری خفیف سی ہو گئی۔

”نہیں کھانا مجھے تمہارا یہ اسپیشل کھانا.....! اونہہ.....! کڑی پکڑے نہ ہوئے، مرغ مسلم ہو گیا.....؟“

وہ حقارت سے بولی۔ فضلہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”تمہیں جو کھانا تھا، وہ بتا دیتیں، میں بنالیتی۔“

”ہاں.....! تم بنالیتیں، تم نوکرانی ہونا.....؟ کبھی میری پسند کا بتاتیں، کبھی گھر والوں کے خمرے اٹھاتیں۔“

فضلہ ششدر ہو گئی۔

”ایمی.....! کیا ہو گیا ہے.....؟“

”پاگل ہو گئی ہوں، دماغ ستیا گیا ہے، اور کیا.....؟“

وہ اتنی وحشت سے چلائی کہ آواز پھٹ گئی۔ فضلہ نے ہونٹ بھیج لئے تھے۔

”جس دن میں گھر پہ نہیں تھی، اس روز تمہیں ولید نے ناشتہ بنا کر دیا تھا۔ کیا تم نے اسے اپنے ملازموں کی فہرست میں شامل کر لیا.....؟ نہیں ایمی.....! یہ محبتوں اور احساس کی بات ہوتی ہے، دلوں میں گنجائش

اکٹ، تب ہی یہ کام ہو پاتے ہیں۔ مگر تم نہیں سمجھ سکتیں۔“

”تمہیں کس نے بتایا کہ مجھے ولید نے اس روز ناشتہ بنا کر دیا تھا.....؟“

وہ زہر خند لہجے میں بولی تھی۔ فضلہ نے گہرا سانس کھینچ لیا۔

”کم از کم ولید نے نہیں بتایا۔ ڈونٹ وری.....!“

”پھر کس نے بتایا.....؟ تب گھر پہ صرف ددا تھے، وہ بھی سو رہے تھے۔“

وہ چیخنے لگی۔

”اشعر بھی تھا، اشعر نے ہی مجھے بتایا تھا، وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ خوش تھا کہ تمہاری دلی بھائی سے صلح ہو گئی ہے۔“

فضہ نے گویا وضاحت دے کر جان چھڑائی۔ ایمان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”میں اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ اس سے لڑائی کروں۔ تعلق ہی کیا ہے میرا اس سے.....؟“

اس کے لہجے میں تنفر ہی تنفر تھا۔

”جانتی ہوں، بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

فضہ نے بے ساختہ ٹوک دیا اور اٹھ کر چلی گئی۔ وہ بعد میں بھی بہت دیر تک جلتی ٹکڑھتی رہی تھی۔

☆☆☆

”میری آنکھوں پہ مرتا تھا

میری باتوں پہ ہنستا تھا

نہ جانے شخص تھا کیسا

مجھے کھونے سے ڈرتا تھا

مجھے جب بھی وہ ملتا تھا

یہی ہر بار کہتا تھا

سنو!

اگر میں بھول جاؤں تو

اگر میں روٹھ جاؤں تو

کبھی واپس نہ آؤں تو

بھلا پاؤ گی یہ سب کچھ

یوں ہی ہنستی رہو گی کیا

یوں ہی جیتی رہو گی کیا

یہی باتیں ہیں بس اس کی

یہی یادیں ہیں بس اس کی

مجھے معلوم ہے بس اتنا

مجھے وہ پیار کرتا تھا

مجھے کھونے سے ڈرتا تھا“

اس نے طویل سانس بھرا اور کتاب بند کر دی۔ آج ثانیہ کی مایوں تھی اور فضہ چاہتی تھی، وہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو۔ مگر وہ صاف انکار کر چکی تھی۔

”تمہیں پتا ہے ناں.....! میرے ایگزام ہو رہے ہیں۔“

روز کے آنے جانے کا طویل سفر اسے بہت تھکا جاتا تھا۔

”آئی پر اس.....! میں تمہیں جلد واپس بھجوا دوں گی، بہت مزہ آئے گا۔“

”میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

وہ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی اڑی دکھا رہی تھی۔

”اتنا حسین سوٹ لائی ہوں تمہارے لئے، اس کا کیا ہوگا.....؟“

”تم پہن لیتا۔“

اس نے نروٹھے پن سے کہہ ڈالا۔

”میرے پاس اپنا ہے، اس احسان کی ضرورت نہیں.....!“

فضہ روٹھے ہوئے انداز میں کہہ کر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اس نے کتلب کھولی، مگر پڑھائی میں دھیان نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی قنوطیت تھی۔ اس نے کتابیں سمیٹ کر رکھ دیں اور وہیں لیٹ گئی۔

”دھی رانی.....! ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئی ہے.....؟“

تائی ماں جانے کس کام کی غرض سے اوپر آئی تھیں، اسے یوں لیٹے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔ خود وہ بلکے بادامی ریشمی سوٹ میں تیار ہو چکی تھیں، ساتھ میں بلوچی کڑھائی کی سیاہ چادر۔

”اس لئے کہ میں نہیں جا رہی ہوں تائی ماں.....!“

اس نے کروٹ بدلتے ہوئے بادل ناخواستہ جواب دیا۔

”کیوں پتر.....؟ کیوں نہیں جا رہی.....؟ سب وہاں تیرا پوچھیں گے۔“

”آپ کہ دیجئے گا، طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”ہائیں.....؟ کیا ہوا میری دھی کو.....؟ پھر بخار ہو گیا کیا.....؟“

تائی ماں فوراً اس کی پیشانی چھو کر دیکھنے لگیں۔ وہ سخت بے زار ہو گئی۔

”بخار نہیں ہے تائی ماں.....! سر میں درد ہے۔“

اس کے لہجے میں اکتاہٹ بھر گئی۔

”دلید سے کہتی ہوں، تمہیں سر درد کی گولی دے دے۔ پھر تیار ہو جا پتر.....! سب جا رہے ہیں، تو کیا

کرے گی یہاں رہ کر.....؟“

اس کا سر تھپک کر کہتی ہوئیں وہ واپس مڑ گئیں۔ ایمان بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر تیار ہونے کے لئے

چل دی۔ بہر حال وہ جان گئی تھی، کم از کم آج جان چھٹنے والی نہیں ہے۔

☆☆☆

”نہ وہ ملا نہ ملنے کا اشارہ کوئی

کیسے اُمید کا چمکے گا ستارہ کوئی

حد سے زیادہ نہ کسی سے بھی محبت کرنا

جان لے لیتا ہے جان سے پیارا کوئی“

واش مین کے اوپر لگے آئینے کے آگے کھڑا وہ شیو بنانے میں مصروف تھا، جب فضہ کے آواز بلند

پڑھے گئے اشعار پہ مسکرا کر متوجہ ہوا۔

”واٹ یو مین.....؟ یہ نصیحت ہے یا.....“

”نصیحت ہی سمجھ لیں.....! ویسے آپ کے لئے اچھی اطلاع نہیں ہے۔ وہ نہیں جا رہی ہے۔“

فضہ کے انداز میں مایوسی تھی۔ وہ کاندھے اچکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔ اتنا اصرار مت کریں۔ وہ مشکوک ہو سکتی ہے۔“

”یہی تو بات ہے کہ وہ مشکوک ہوتی نہیں ہے۔ مجھے اکثر حیرانی ہوتی ہے۔ آپ کے جذبات کی

شدت اس تک کیوں نہیں پہنچتی.....؟“

”اس لئے کہ یہ فلم یا ناول نہیں ہے سوئی.....! زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے۔“

وہ شیو کر چکا تھا، تو لیے سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”جو بھی ہے، بہر حال مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“

فضہ اپنی بات کہہ کر تائی ماں کے کمرے میں گھس گئی جو اسے پکار رہی تھیں۔ انہیں اس کی صلاح سے

وہاں دینے والے کپڑے باکس سے نکالنے تھے۔ ماما بھی وہیں تھیں۔

وہ نہانے کے لئے واش روم کی سمت آیا تو اشعر وہاں پہلے سے گھسا ہوا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں

وہیں چار پائی پر بیٹھ گیا۔ تب ہی فضہ کو پکارتی وہ اپنے دھیان میں سیڑھیاں اترتی نیچے آتی نظر آئی۔ ولید نے

سرسری سے انداز میں نظر اٹھائی تھی، مگر صحیح معنوں میں وہ مبہوت رہ گیا تھا۔

بلیک جارجٹ شیفون کا اسٹائلش سا سوٹ جس کے دامن اور دوپٹے کے پلوؤں پہ پٹا پٹی کا کام

جھل جھل کر رہا تھا، اس کی گوری رنگت اس میں ایک دم لشکارے مارتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوش ربا حسن کا

بجلیاں گراتا ہوا یہ دل کش روپ کسی کے بھی حواس چھین لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ تو پھر اس کا پہلے سے اسیر

تھا۔ وہ کچھ لمحوں کو اپنی نگاہوں پہ اختیار کھو بیٹھا۔

اور یہ اس کی نگاہوں کی تپش کا ہی شاخصانہ تھا کہ ایمان نے اچانک پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس

کی نگاہوں سے ایک ناگواری کا احساس اس کے چہرے سے پھلکا اور اگلا قدم اٹھائے جانے کیسے اس کا پیر

پٹ گیا۔ اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلتی چلی گئی تھی۔

ولید فوراً اسی گھبراہٹ اور سرسبکی کے عالم میں اٹھ کر اندھا دھند اس کی سمت بھاگا، کچھ اس طرح

لہراتے میں پڑی تپائی اور سبزیوں کی ٹوکری بھی اسے نظر نہیں آئی، وہاں سے اُلٹتا ہوا خود گرتا بچا تھا۔

☆☆☆

”آر پو اد کے.....؟“

وہ جتنی تیزی سے بھاگ کر اس تک پہنچا تھا، نزدیک آ کر اتنی ہی آہستگی سے جھک زدہ آواز میں گویا

ہوا۔ ایمان جو ایک دوڑنے تک ہی پھسلتی تھی، پھر رینگتھا مگر سنبھل گئی تھی، جیسی چوٹ تو اتنی نہیں آئی، مگر اس

کے سامنے گرنے پہ سبکی کا احساس ضرور آنکھوں کو نم کر گیا تھا۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں سمیت پھلکتی آنکھوں میں غمگی

بھرے ایک نظر ہی اسے دیکھ پائی کہ تب تک اندر کمرے سے ماما کے ساتھ تائی ماں اور فضہ بھی بدحواسی میں اٹھ

کر باہر آ گئیں تھیں کہ اس کی چیخ آسانی اندر سنی گئی تھی۔

”ہائے میں مر گئی، کیسے گرمی ہے بچی.....؟“

تائی ماں نے دیکھتے ہی شور مچا دیا، جبکہ فضہ آگے بڑھ کر اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرنے

لگی۔

”کہاں چوٹ آئی ہے بیٹے.....؟ بتاؤ تو سہی.....!“

ماما کی تشویش بھی فطری تھی۔ اسے وہاں سے اٹھا کر صحن میں بچھی چار پائی پہ بٹھا دیا گیا تھا۔

”ویاہ پہ جانے کو تیار ہونے آئی تھی میری دھی.....! لگ بھی تو اتنی سونی رہی تھی۔ جانے کس بدخواہ کی

نظر لگ گئی.....؟“

تائی ماں کی اپنی باتیں تھیں۔ ایمان کی نگاہ بے ساختہ اٹھی۔ وہ وہیں خفیف سے تاثرات لئے کھڑا

تھا۔ اس الزام پہ جیسے جبر بڑھ کر رہ گیا۔ فضہ کی ہنسی چھونٹنے لگی۔

”حد ہے تائی ماں.....! یہاں بھلا کس کی نظر لگتی ہے.....؟ سب ہی تو اپنے ہیں۔“

فضہ نے گویا بات اڑائی، مگر تائی ماں کا یقین کامل تھا۔

”ارے.....! نظر بھی تو اپنوں کی لگتی ہے۔ ہماری ساس اللہ بخشے کہا کرتی تھیں، بچے کو سب سے زیادہ

نظر اپنی ماں کی ہی لگتی ہے۔ ماں کو ہی زیادہ پیارا جو لگتا ہے۔“

”مائی گاڈ.....! تائی ماں.....! ماما تو ہمارے ساتھ تھیں ناں کمرے میں، جبکہ محترمہ اوپر کے پورشن

سے تیار ہو کر نیچے آ رہی تھیں، اوپر صحن میں کوئی نہیں تھا، سوائے ولید کے۔“

فضہ نے یوں ہی وضاحت کی، مگر آخری فقرہ اس نے کسی قدر شرارت میں ادا کیا۔ ولید اتنا جبر بڑھ

کہ فی الفور وہاں سے پلٹ گیا۔

”کدھر جا رہا ہے اب.....؟ بچی کو دیکھ تو سہی.....! پیر میں موج تو نہیں آگئی.....؟“
تائی ماں نے اندر کمرے میں گھستے ولید کو بے ساختہ آواز دی۔ وہ رُک تو گیا، مگر پلٹ کر واپس نہیں آیا۔

”آجائے آجائے.....! آپ کی عافیت اسی میں ہے۔“

اماں نے بھلے منہ سے نہیں کہا، مگر ان کا انداز صاف کہہ رہا ہے۔

”نظر لگا کر اب کدھر جا رہے ہو.....؟ اپنا بھگتان بھگتو.....!“

واش روم کے دروازے پر کھڑے تو لیے سے سر کے بال رگڑ کر خشک کرتے اشعر نے مزہ لے کر سرگوشی کی۔ ولید کی سرخ ہوتی رنگت گویا اس کے ضبط کی گواہ تھی۔ وہ پیر پختا ہوا واپس آیا تھا۔

”آپ خاموش کیوں ہیں.....؟ انہیں بتاتی کیوں نہیں کہ میں نے آپ کو نہیں گرایا ہے.....؟ یہ سب کا غلط خیال ہے کہ میں نے آپ کو نظر لگائی ہے۔“

اس ساری صورت حال نے جتنی بدمزگی اور کڑواہٹ اس کے اندر بھری تھی، وہ ساری ولید نے ایمان پر الٹ دی۔ تائی ماں ”ہائیں ہائیں“ کرتی رہ گئی تھیں۔ ولید کے تاثرات بے حد کبیدہ تھے۔ تائی ماں نے اسے گھورا۔

”میں تجھے کہہ رہی ہوں بچی کا پیر دیکھ.....! تو اُلٹا اس پر برسنا شروع ہو گیا ہے.....؟“

”پہلے اپنی بچی سے تو پوچھ لیں، وہ مجھ سے چیک کرانا چاہے گی بھی کہ نہیں.....؟“

وہ کچھ اور بدمزہ ہوا کہ ایمان کے چہرے پر اُمدتی محظوظ کن مسکان اسے پتنگ لگا چکی تھی۔

”میں نے کب انکار کیا ہے تائی ماں.....؟ شاید ان کی انا کو گوارہ نہیں ہے کہ یہ میرے پیر کو ہاتھ لگائیں.....؟“

ایمان نے اتنی معصومیت سے کہا تھا کہ ولید اس کی مکاری پہ دانت کچکا کر رہ گیا۔ فضا کو اپنی مسکراہٹ چھپانے کی غرض سے منہ پھیرنا پڑا۔

”ادھر کریں سامنے اپنا پاؤں.....!“

وہ جیسے طوعاً و کرہاً پنجوں کے بل چارپائی کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔ چہرے کے ناخوش گوار تاثرات ایمان کو اس پجوائیشن میں لطف اندوز کرنے لگے۔ اسے کہیں بھی چوٹ نہیں آئی تھی، کہنی اور گھٹنے پہ گھیٹ کر لڑھکنے سے ایک آدم کھروچ ضرور آتی تھی، مگر اس پل وہ اس مغرور، نیک چڑھے اور بے نیاز نظر آنے والے ولید کو محض زچ کرنا چاہ رہی تھی۔ جیسی سلور سینڈل سمیت اپنا سفید مرمریں پیچریوں ہی اس کے آگے کر دیا۔ ولید نے اس حرکت پہ اچنبھے میں گھر کر اس کی صورت دیکھی اور آنکھوں میں مچلتی شرارت پہ جل کر راکھ ہو گیا۔

”کم از کم جوتا تو خود اتار لیں.....؟ میں ڈاکٹر ضرور ہوں، زرخید غلام نہیں۔“

اب کے وہ صحیح معنوں میں بھڑکا تھا۔ فضا دفعتاً ایمان کی اس حرکت پہ تمحیر رہ گئی تھی۔

”افوہ.....! ایی.....! حد ہے بھی.....! لاؤ میں اتاروں جوتا۔“

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسٹریپ کھولا اور جوتا پیر سے نکال لیا۔ ولید نے اس کا پیر ہلا جلا کر

معائنہ کیا، پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”موج تو نہیں آئی ہے۔ درم بھی نہیں ہے چیر پہ۔ کہاں درد محسوس کر رہی ہیں آپ.....؟ مجھے

بتائیں.....!“

اس کی نگاہوں میں الجھن تھی۔

”میں نے کب کہا مجھے درد محسوس ہو رہی ہے.....؟ وہ تو تائی ماں نے کہا، چیک کرالو تو میں نے کرا

لیا۔“

اس اعلیٰ درجے کی معصومیت کے مظاہرے نے ولید کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ہونٹ بھیچنے لے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں جا گھسا۔

”یہ کیا حرکت تھی ایی.....؟“

فضہ کا انداز بے حد کڑا تھا۔ وہ کاندھے اچکا کے چیونٹ گم چبانے لگی۔

”بتایا تو ہے، تائی ماں.....“

”شٹ آپ.....! اتنی فرمانبرداری نہیں ہوتی.....!“

فضہ بے ساختہ برس پڑی۔

”یو شٹ آپ.....! وہ خود کو جانے کیا افلاطون سمجھے بیٹھا ہے.....؟ میں نے ذرا اسے بتایا ہے کہ

بہر حال وہ بھی بے وقوف بنایا جاسکتا ہے، اینڈ دیٹ سیک.....!“

اس کے اطمینان میں ذرہ برابر جو فرق آیا ہو، فضا متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ تب ہی

تائی ماں چمٹے سے تھالی اٹھائے برآمد ہوئی تھیں، جس میں جلتی ہوئی مرچیں تھیں، جن کی باس سے ان دونوں

کے ساتھ ماما بھی چھینکنے لگیں۔ مگر تائی ماں بہت گمن سے انداز میں تھالی کو ایمان کے سر پر گول گول چکر دینے میں

مصروف رہی تھیں۔

”افوہ.....! تائی ماں.....! یہ کیا کر رہی ہیں آپ.....؟“

فضہ نے ہاتھ سے دھوئیں کو ہٹاتے ہوئے آنکھوں سے بہتا پانی صاف کیا۔

”نظر آتا رہی ہوں بچی کی، اتنے لوگوں میں جا رہی ہے۔“

ان کے جواب پہ فضا کا جی چاہا تھا، اپنا سر پیٹ لے۔ کچھ کہے بغیر اس نے سب سے پہلے چمٹے

سمیت تھالی ان کے ہاتھ سے پکڑی اور کچن میں جا کر سنک میں رکھنے کے بعد نوٹی کھول دی تھی۔

”اس سے کچھ نہیں ہوتا تائی ماں.....! محض رزق کی بے حرمتی ہے۔ آپ نظر بد سے حفاظت کے لئے

آیت الکرسی پڑھ کر اس پہ پھونک مار دیں، ہر قسم کی حفاظت اللہ کے ذمے.....!“

فضہ نے باہر آ کے رسائیت و نرمی سے سمجھایا۔ تائی ماں کچھ خفیف سی ہو گئیں۔

”ارے بیٹا.....! ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا تھا ناں.....!“

”اُس اوکے.....! اب میں بھی تیار ہوں۔“

وہ نرمی سے کہہ کر بیڑھیوں کی سمت چلی گئی۔ تب ہی اسے کمرے سے اشعر کھانسا ہوا باہر نکلا تھا۔

”افوہ.....! کیا پھونک دیا ہے.....؟“

”تمہارا دل.....!“

ایمان نے روئے سخن اس کی طرف کیا، وہ کاندھے اُچکانے لگا۔

”اتفاقاً تو نہیں ہے میرا دل کہ یوں چولہے میں جھونک دیا جائے۔“

”اتفاقاً خاص بھی نہیں ہے کہ سنبھال کر رکھ لیا جائے۔“

”خدا نہ کرے کہ میرے نصیب میں آپ جیسی غریبی لڑکی ہو، جس کے پلے بندھیں گی، بیچارہ عمر بھر سر پکڑ کر روئے گا۔“

”اپنی خیر مناؤ.....!“

”ہائیں.....؟ کہیں آپ کے ارادے خطرناک تو نہیں.....!“

وہ سہنے کی ادا کاری کرنے لگا۔

”یہ منہ اور مسور کی دال.....!“

”اس کا کیا مطلب ہے.....؟“

وہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔

”شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں.....؟“

وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی تھی۔

”الحمد للہ.....! ہر روز کئی بار دیکھتا ہوں، کبھی جی نہیں بھرا، مگر کبھی غرور بھی نہیں کیا۔“

”ایمی.....! یہاں کی کال ہے، آکر بات کر لو۔“

”یہ بحث ابھی طول پکڑتی، اگر جو فضا اسے اوپر سے نہ پکار لیتی۔ وہ اسے منہ چڑھاتی اُٹھ کر بھاگ گئی تھی۔“

☆☆☆

”لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا

آؤ سانسے کولوں دی رُس کے نہ لنگ ماہیا“

ڈھولک پر پڑنے والی تھاپ کے ساتھ بہت ہی بلند آواز میں سر ہلایا گیا تھا۔ ایمان جو ثانیہ کو تیار کر رہی تھی، بے ساختہ مسکرا دی، اور لپ اسٹک کا ایک اور ٹچ دینے لگی۔ ثانیہ تیکھے نقوش کی سانولی مگر بڑکش لڑکی تھی، ذرا سے سگھارنے ہی گویا اسے ایک دم جگمگا ڈالا تھا۔

”تیری ماں نے پکائے اٹلے

اساں مگے تے پے گئے ڈنڈے

لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا

آؤ سانسے کولوں دی رُس کے نہ لنگ ماہیا“

اب کی مرتبہ آواز کچھ اور بھی یاٹ دار تھی۔ اسے پہچاننے میں ایک لمحہ لگا۔ گویا ڈھولک کی اشعر کے

ہاتھوں کم بختی آگئی تھی۔

”عاشو بھائی.....! بہت شرارتی اور بخولی ہیں۔“

اس کی مسکراہٹ کو دیکھتی ثانیہ نے اپنی رائے دی۔ ایمان کی مسکان گہری ہو گئی۔ تب ہی بند دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ایمان نے ثانیہ کا دوپٹہ اُٹھا کر سیٹ کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں آنے والے کو اندر آنے کی اجازت دی۔

”یہ پھولوں کے گجرے امی نے بھیجے ہیں۔ امی کہہ رہی ہیں، ان میں آپ کے بھی دو گجرے ہیں۔“

حرا آپا کا چھ سالہ بیٹا پھولوں کے زیورات کا شاپنگ بیگ لئے اندر آیا تھا۔

”او کے.....! تھینکس.....!“

ایمان نے شاپنگ بیگ لیتے ہوئے بچے کا گال نرمی سے چھوا۔ وہ شرما کر بھاگ گیا۔

”آپ تو پہلے ہی اتنی پیاری لگ رہی ہو باجی.....! پھول پہن کر تو پڑی لگو گی، پڑی.....!“

ثانیہ کی آنکھوں میں اس کے دلکشی و رعنائی سے بھر پور نازک سراپے کے لئے ستائش ہی ستائش بھری تھی۔ وہ آہستگی سے مسکرا دی۔

”تم تیار ہو، یہ زیورات گننے وغیرہ تمہیں باہر رسم کے دوران پہنائے جائیں گے۔ آج تم اتنی کیوٹ لگ رہی ہو کہ کوئی تمہیں پہچانے گا بھی نہیں۔“

سائیڈ پر پڑا اپنا دوپٹہ اُٹھا کر شانوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے ایک طرح سے اس کی تعریف کی تھی۔ ثانیہ کی خواہش یہ اس نے ثانیہ کو تیار کیا تھا، ورنہ اسے ان کاموں کا ہرگز شوق نہیں تھا۔

”یہ اپنے گجرے تو پہن لیں باجی.....!“

ثانیہ نے شاپنگ بیگ سے مہکتے ہوئے چنبیلی اور گلاب کے تازہ گجرے نکال کر اس کی سمت بڑھائے تو وہ دروازے سے پلٹ کر گجرے لیتی ہوئی باہر چلی آئی، مگر اس طرح کہ ساتھ ساتھ کلائی پہ گجرہ باندھنے کی کوشش بھی جاری تھی۔

”یہ شہری کڑی کون ہے.....؟ کتنی موٹی ہے۔“

اس نے اپنے عقب میں یہ آواز سنی تھی، مگر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

”حرا کے چاچے کی دھی ہے جو شہر میں ہوتا ہے۔ جتنی سوئی ہے ناں، نخرہ اس سے دس گناہ زیادہ ہے۔ کیا کڑیل ہے ولید باؤ، سارے پنڈ کی کڑیاں جان وارتی ہیں اس پہ، دل ہی دل میں پسند کرتی ہیں اسے، مگر اس نے کسی کو کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ پر اس کے آگے تو وہ ہارا ہوا لگتا ہے۔“

ایمان کے اُٹھتے قدم ٹھٹک گئے۔ اعصاب جیسے سُن ہو گئے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھیں، آپا کے سسرالی عزیزوں سے تعلق رکھتی تھیں یا محلے سے آئی تھیں۔ اس وقت برآمدے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھی بڑی فراخ دلی سے اس پر تبصرے کرنے میں مصروف تھیں۔ گجرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنے پیروں کے درمیان گرے گجرے کو نکلتی رہی جس کی کچھ پتیاں ٹوٹ کر آس پاس بکھر گئی تھیں۔

”ہائیں.....؟ تجھے کیا الہام ہو گیا کہ ولید باؤ بھی اسے پسند کرنے لگا ہے.....؟“

دوسری آواز میں محسوس کی جانے والی تلخی اور ناگواری شامل تھی۔ ایمان اپنی جگہ ساکن رہ گئی۔
 ”محسوس کرنے والی آنکھ چاہئے ہوتی ہے۔ کبھی شامل ہوا ہے وہ ایسی دعوتوں میں.....؟ آج دیکھ کیسی جج دج سے آیا ہوا ہے، اور یہ جدھر جاتی ہے ناں.....! اس کی نگاہیں ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہیں۔ تجھے اس لئے بتا رہی ہوں کہ اب تو عقل کو ہاتھ مار، سدھر جا، وہ تجھے ملنے والا ہرگز نہیں.....!“
 ”خود ہی تو کہہ رہی ہے، اس لڑکی میں غرہ ہے، وہ اسے کسی قابل نہیں سمجھتی.....؟“
 وہی لڑکی بے بسی سے کہہ رہی تھی۔ دوسری زہر خند سے لہجے میں ہنسی۔
 ”اس سے تو نے کیا سمجھا کہ وہ تجھ سے شادی کر لے گا.....؟ اگر تو ولید باؤ میں بھی بہت ہے۔ بھلے دل میں اسے جتنا بھی پسند کرتا ہو، مگر اظہار کبھی نہیں کرے گا۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔“
 ”اچھا ہے.....! اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“
 پہلی والی نے رقت آمیز انداز میں باواز بلند کہا۔

”نی چپ کرنی.....! وہ دیکھ رک گئی ہے وہ، بھلے ہماری باتیں سن لی ہوں.....؟ اڑیے.....! میں نے سنا ہے، بڑی اتھری ہے۔ باؤ ولید سے بھی کئی بار پنکا لے چکی ہے۔ کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں تو چلی، اگر کچھ کہے تو، تو ہی نپٹا۔“

ایمان نے بھیچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ قدموں کی دُور ہوتی آہٹ سنی اور جھک کر گجرا اٹھالیا۔
 رسم کے لئے انتظام کھلے آنگن میں ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔ وہیں دریاں بچھا کر کرسیاں بھی رکھی گئی تھیں اور اسٹج بھی وہیں بنایا گیا تھا۔ اس وقت سب خواتین وہیں موجود تھیں۔ برآمدے میں ایک آدھ بچے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بے لاگ تبصرے میں مشغول تھیں۔ وہ اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ پلٹ کر دیکھے بنا پنڈال کی ست چل دی تھی، جہاں سے اشعر کی آواز ابھی بھی آرہی تھی۔

”تیری ماں نے پکائی کھیر دے
 اسان منگی تے پنے گئی بیڑ دے
 لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا
 آوؤ سامنے کولوں دی رُس کے لنگ ماہیا“

ٹینٹ کے داخلی دروازے کے عین درمیان دو سو پاؤر کا بڑا بلب روشن تھا جس کے گرد چکراتے پروانے ہر آنے جانے والے پہ چل چل کر گرتے۔ وہ اپنے بڑے سے دوپٹے کو سنبھالتی کسی گوشے میں اپنے بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے لگی۔ اشعر کے اس اشارے کو اس نے سرے سے اِگنور کر دیا تھا جو اسے دیکھتے ہی اپنے پاس بلاے کو اس نے کیا تھا۔

”بلے بلے بھی ٹور پنجاہن دی
 جوتی کھل دی مروڑا نیوں جھل دی
 ٹور پنجاہن دی ، او بلے بلے“

اشعر نے اسے دیکھ کر شرارت بھرے انداز میں نئی تان اُڑاتی تھی۔ فصد بھی اس کے ساتھ تھی۔ ایمان

کو دروازے کی سائیڈ پہ آخر میں ایک خالی کرسی نظر آگئی۔ وہ جا کر اس پر بیٹھ گئی۔ ان لڑکیوں کی آواز کی پازگشت جیسے اس کے تعاقب میں لپکتی ہوئی ساتھ ساتھ آئی تھی۔

”اور یہ جدھر جاتی ہے ناں.....! اس کی نگاہیں ساتھ ساتھ سفر کرتی ہیں۔“

اس نے ہونٹ بھیچ لے۔ پتا نہیں کس حد تک صداقت تھی ان باتوں میں.....؟ مگر ولید حسن کی ذرا سی لغزش نے اس کی ذات کو ضرور افسانہ بنا ڈالا تھا۔ معاً کسی خیال کے تحت اس نے پورے پنڈال میں اسے کھوجا۔ وہ اسے آپا اور ان کی ساس کے ساتھ کھڑا باتیں کرتا نظر آگیا۔

بلیک گرتا شلوار، سلیقے سے بنے بال، ست رنگا چمکدار پنکا جسے وہ ٹائی کے انداز میں گلے میں لٹکائے ہوئے اپنی بے پناہ وجاہت کے ساتھ گویا پورے ماحول پہ چھا رہا تھا۔ ذرا سا غور کرنے پر اس پہ یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ وہاں ہر عمر کی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز وہی تھا۔ جبکہ اس کی توجہ کا مرکز صرف وہی۔ اس کی بھٹکی نگاہیں بار بار اس کے سراپے کا احاطہ کر رہی تھیں۔ ایمان کے اندر جیسے کوئی برق اُترنے لگی۔ ہونٹ بھیچنے وہ شعلہ بار نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”بلے بلے بھی او تیرا کی لگ دا
 بڑا ہس دی ایں نین ملا کے
 او تیرا کی لگ دا ، او بلے بلے“

اشعر جو اس کی تاک جھانک میں مصروف تھا، اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھنے بغیر گلا چھاڑ کر چنگھاڑتے ہوئے اس پر بہت کچھ جتانے لگا۔ بظاہر وہ گانا گارہا تھا، ایمان کی پیشانی تپ اُٹھی۔ ضبط کی انتہاء بھی ہوگئی تو یوں ہی دانتوں پر دانت جمائے، منھیاں بھیچنے تک کر ماما کے پاس آگئی جو تائی ماں اور حرا آپا کی ساس کے ساتھ بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔

”ماما.....! مجھے گھر جانا ہے، ابھی اور اسی وقت.....!“

اس کے تک کر کہنے پہ ماما کے ساتھ تائی ماں نے بھی چونک کر اسے دیکھا اور اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر گھبرا کر اٹھیں۔

”کیا ہوا پتر.....؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں میری دھی کی.....؟“

”جی نہیں.....!“

اس نے زروٹھے پن سے، بے رُخی سے جواب دیا، پھر ماما کا کاندھا ہلا کر بولی تھی۔

”میں کیا کہہ رہی ہوں ماما.....؟“

”چلتے ہیں بیٹا.....! ابھی تو رسم بھی نہیں ہوئی۔“

ان کا لہجہ بظاہر نرم مگر انداز میں ناگواری تھی۔ انہیں ایمان کی یہ خود سری اب کھلنے لگی تھی۔

”مجھے کچھ نہیں پتا.....! میں رسم تک ویٹ نہیں کر سکتی۔ آپ کسی سے کہیں، مجھے چھوڑ کر آئے، کل میرا

”ہی بھی ہے۔“

اب کے اس کے انداز کی بدتمیزی اور تلخی تائی ماں نے بھی محسوس کی تھی جیسی بات سنبھالنے کو بولی

اس کا چہرہ آن کی آن میں جل اٹھا، آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

”اماں نے کہا ہے، انہیں گھر پہنچا دوں۔“

ولید نے فضا کی معنی خیز نگاہوں کے جواب میں سنجیدگی و متانت سمیت وضاحت پیش کی۔

”جائیے جائیے..... اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔“

اشعر خواہ خواہ ہنسا۔ ولید کا ندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا۔

”ہاہ.....! کاش یہ محترم اور محترمہ زندگی کے سفر کے بھی ساتھی بن جائیں۔“

اشعر نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ فضا نے صدق دل سے آمین کہا تھا۔

”میرے پاس بایک ہے، گاڑی عاقب لے گیا ہے۔“

اس کے ہمراہ چلتا ہوا وہ جیسے خیال آنے پہ ڈیوڑھی میں رک کر بولا اور اس کے قیامت خیز ہوشربا

حسن سے نگاہ چرائی۔

”تو پھر.....؟“

وہ از حد بے زاری سے گویا ہوئی۔

”میں نے اس لئے بتایا ہے کہ آپ کو اعتراض نہ ہو۔“

وہ جواباً نخوت سے بولا۔ یہ لڑکی مسلسل اسے ڈی کرڈ کر رہی تھی۔

”اعتراض تو مجھے آپ کے ساتھ آنے پر بھی تھا۔ مگر حالات ہمیں مجبور ہی نہیں، بے بس بھی کر دیتے

ہیں۔“

وہ دروازے سے نکل کر اس کے پیچھے آتے ہوئے گویا صاف صاف اس پر جتا کر بولی تھی۔ ولید کے

چہرے پر ایک دم آگ سی دھک اٹھی۔ گلی میں چار بانیاں بچھا کر مہمان وہیں براجمان تھے اور کل کے لئے تیار

ہونے والے کھانے کے انتظامات دیکھ رہے تھے۔ دہلیں وغیرہ بھی وہیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ دانستہ خاموش رہا،

مگر بایک کے نزدیک آ کر ملکے اندھیرے میں اس کے سراپے پر نگاہیں جما کر بولا تھا۔

”مگر میں حالات کے آگے مجبور اور بے بس ہونا پسند نہیں کرتا۔“

ایمان کے چہرے پر زہر خند پھیل گیا۔

”میں جانتی ہوں۔“

بایک اشارت کرتے ہوئے ولید کو جھٹکا لگا تھا۔ ایمان کے لہجے میں، انداز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ

وہ ٹھنک گیا تھا۔

”کچھ نہیں جانتی ہیں آپ.....!“

وہ اسے بھرپور انداز میں جھٹلانے کو ٹھوس آواز میں بولا تو ایمان تلخی سے ہنس پڑی۔

”غلط خیال ہے آپ کا.....! آپ کی بہت ساری کمزوریاں جانتی ہوں میں۔ میری خاموشی کو میری

فلمات مت سمجھئے گا۔ یقیناً آپ کو اپنے بارے میں انکشاف میرے منہ سے سننا اچھا نہیں لگے گا۔“

وہ ذرا سا اچکی اور بایک پر سوار ہو گئی۔ مگر اس طرح کہ اس سے واضح فاصلہ رکھ کر ولید اس سکتے سے

تھیں۔

”ہاں ہاں پتر.....! مجھے پتا ہے۔ میں بھیجتی ہوں تجھے گھر۔ بہن.....! بچی کے امتحان ہو رہے ہیں،

بہت لائق ہے۔ آنے کو مان ہی نہیں رہی تھی، میں ہی زبردستی لائی تھی۔ چل آ پتر.....! میں عاقب سے کہتی

ہوں، تجھے گھر چھوڑ آئے گا۔“

تائی ماں نے اٹھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں سمدھن کو بھی مطمئن کیا جو مطمئن ہوئیں یا نہیں،

البتہ سر ضرور اثبات میں ہلا دیا۔

”ولید.....! عاقب کدھر ہے.....؟“

تائی ماں نے اسی سمت آتے ولید کو پکار کر پوچھا تھا۔

”وہ تو مٹھائی کی ٹوکری بنوانے گئے ہیں شہر، بھائی صاحب کے ساتھ.....! کیا بات ہے.....؟ اگر کوئی

کام ہے تو مجھے بتا دیں.....؟“

وہ ایمان کے سرد تاثرات سے سچے چہرے پہ ایک گہری نگاہ ڈال کر بولا تھا۔

”بچی کو گھر بھجوانا تھا، چلو.....! تم ہی چھوڑ آؤ.....!“

تائی ماں کے انداز میں وہی سادگی تھی جو ان کی شخصیت کا ایک اہم حصہ تھی۔

”پہلے جانے والوں سے تو پوچھ لیں اماں.....! انہیں میرے ساتھ جانے پر اعتراض تو نہیں

ہے.....؟“

وہ کسی قدر طنز سے کہہ کر ایمان کے چہرے پہ بکھری تلخی و درشتی کو دیکھنے لگا۔ ایمان کی دھڑکنیں چیخنے

لگیں۔

”اگر آپ کو اعتراض ہے تو رہنے دیں۔“

ایمان کو عجیب سی توہین کا احساس ہوا تھا، جیسی پھنکار کر بولی تھی۔

”آئیے.....!“

وہ اپنے تاثرات چھپاتا آگے بڑھ گیا۔ ایمان نے عجیب سی کیفیت میں اس کی تقلید میں قدموں کو

موڑا تھا۔ ابھی وہ دونوں آگے پیچھے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ فضا اور اشعر انہیں پکارتے ہوئے تقریباً

دوڑتے ہوئے ان کے پیچھے آگئے۔

”ہائیں ہائیں.....! یہ آپ آدھی رات کو ایک نوجوان، خوب صورت، حسین لڑکی کو اپنے ساتھ کہاں

لے جا رہے ہیں.....؟“

اشعر نے قریب آتے ہی پھولے سانسوں سمیت کہا، فضا کی ہنسی نکل گئی۔

”لڑکی اپنی مرضی سے جا رہی ہے۔ پوچھ لو.....!“

فضا کی آنکھیں جانے کسی احساس کے تحت چمک اٹھی تھیں، جبکہ یہ لفظی چھیڑ چھاڑ ایمان کے اندر

کڑواہٹ بھر گئی تھی۔

”واٹ نان سنس.....!“

لوگ آپ کے حوالے سے باتیں بنا رہے تھے، وہ کیا تھا.....؟“
اسے اپنی بکھرتی آنا کو بھی تو بچانا تھا کچھ کہہ کر۔ ولید نے اس کی خجالت اور شرمندگی کو محسوس کیا اور گہرا سانس بھر کے خود کو کمپوز کیا تھا۔

”تصویروں کے حوالے سے میں نے جب ہی آپ کو وضاحت دے دی تھی، جس پر یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کی سوچ ہے۔ جہاں تک آپا کے مہمانوں کی باتوں کا تذکرہ ہے، تو ایسی باتوں پر عقل مندکان نہیں دھرا کرتے۔“
وہ کچھ توقف سے بولا تو لہجے کی تیزی اور بے رحمی میں قدرے کمی تھی۔ ایمان نے ہونٹ بھیج کر اسے دیکھا۔

سچ کہا تھا اس انجان لڑکی نے، وہ ہرگز بھی اپنی کمزوری اسے دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنے اندر عجیب سی جھنجھلاہٹ محسوس کی تو خاموشی سے پلٹ گئی۔

”بات سنیں.....! یہ چائے لے لیں.....! مجھے پتا ہے کہ آپ کو چائے کی طلب تھی۔“
وہ بھاپ اڑاتا ملک اس کی جانب بڑھائے کھڑا تھا۔ انداز اتنا نارمل تھا گویا ابھی ان کے بیچ کوئی تلخی نہ ہوئی ہو۔

”زیادہ بن گئی تھی ناں.....!“
وہ اس کی ہچکچاہٹ کو گریز سمجھتے ہوئے بولا اور ایمان کے اندر تنفر بھر گیا۔

”سوری.....! میں ایسی باقیات کی عادی نہیں ہوں۔“
پھنکار کر کہتی وہ ایک جھٹکے سے کچن سے نکل گئی۔ ولید گہرا سانس بھرتا اضطحال زدہ انداز میں وہیں بیٹھ گیا۔ انا کو بچاتے بچاتے اس نے ایک بار پھر دل کا خون کر ڈالا تھا۔ اب کتنی دیر نہ حال رہنا تھا، کون جانتا تھا.....؟

☆☆☆

”چاند تاروں سی حسین ذات میرے نام کرو
اپنی زلفوں کی سیاہ رات میرے نام کرو
اپنی آنکھوں میں مچلتے ہوئے دریا سارے
اپنی آنکھوں کی یہ برسات میرے نام کرو“

وہ اپنے کمرے میں بستر پہ اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر پہ گیت چل رہا تھا، مگر اس کی ساری توجہ اپنی ڈائری میں رقم نظم پہ تھی۔ ایک عجیب سی یاسیت اس کے رگ دپے میں سرایت کر چکی تھی۔
تاؤجی نے اس بار چاچو سے بات کی تھی اور انہوں نے فضلہ کی رضامندی سے عاقب اور فضلہ کی باقاعدہ معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ گھر کی فضاء میں ایک خوش گوار ہلچل اور جوش پایا جاتا تھا۔ مگر ولید کے اندر اضطراب در آیا تھا۔ فضلہ نے ایک بار پھر اسے اکسایا تھا۔
”آپ کے اندر کوئی کمی نہیں ہے ولی بھائی.....! کہ وہ انکار کرے۔ ایک بار بات تو کر کے دیکھیں

نکلا تو کھولتے ہوئے دماغ کے ساتھ بائیک اشارٹ کی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ اپنے کمرے سے دانستہ نہیں نکلی۔ سب لوگ چلے گئے، تب اس نے اٹھ کر کتابیں کھول لی تھیں۔ مگر ذہن الجھ رہا تھا۔ ایک لفظ بھی جب پلے نہیں پڑا تو اس نے چائے بنانے کا ارادہ کیا اور نیچے چلی آئی۔ دوا اپنے کمرے میں تھے۔ یقیناً تاؤجی بھی انہی کے پاس تھے۔ وہ سیزھیان اتر کر سیدھی کچن کی سمت آگئی تھی مگر پہلے ہی مرحلے پر ٹھک گئی۔ وہ اپنے دھیان میں مگن چائے بنا رہا تھا۔

”یہ کیوں نہیں گیا.....؟ اور وہاں لوگ میرے ساتھ ساتھ اس کی بھی عدم موجودگی سے کیسے کیسے افسانے گھڑیں گے.....؟“

اس سوچ نے اس کا دماغ کیلے ڈھونیں سے بھر دیا۔

”خیریت.....؟ مجھے کیوں گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں.....؟“

وہ آہٹ پر پلٹا تھا، مگر اس کی گھورتی نظروں کو محسوس کر کے کسی قدر ترش انداز میں گویا ہوا۔

”تم کیوں نہیں گئے ہوشادی پر.....؟“

وہ جیسے تیوریاں چڑھا کر بولی۔ انداز صاف لڑائی والا تھا۔

”میری مرضی.....!“

وہ بے نیازی سے کہہ کر اُبلتی ہوئی چائے چھان کر ملک میں ڈالنے لگا۔

”بہت گھٹیا ہو تم.....! اس وجہ سے نہیں گئے ہونا کہ میں نہیں گئی.....؟“

وہ بھڑک کر کہتی باقاعدہ لڑائی کا آغاز کر چکی تھی۔ ولید کو شاید اس سے کسی بھی صورت اس بات کی توقع نہیں تھی، جہی چند ثانیوں کو گنگ رہ گیا تھا۔ مگر جب سنبھلا تو ناگواری اور برہمی کا احساس اسے آپے سے باہر کرنے لگا۔

”دماغ ٹھیک ہے آپ کا.....؟ میں آپ کو اتنی اہمیت دوں گا، یہ خوش فہمی کس نے ڈالی آپ کے دل میں.....؟ محترمہ.....! ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا ہے کہ میں آپ جیسی ہٹ دھرم، احمق اور سرکش لڑکی کی خاطر اس قسم کی فضول حرکتیں کرتا پھروں.....؟ اور ہاں.....! آئندہ بہت سوچ سمجھ کر بات کیجئے گا مجھ سے، ورنہ اس کی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں.....؟“

تمام نرم گداز جذبوں پر انا کا نقاب چڑھا کر وہ پھنکار پھنکار کر اتنی تلخی سے بولا تھا کہ ایمان تو صحیح معنوں میں گڑبڑا کر رہ گئی۔ ساری اکڑ، ساری نخوت جیسے اس کے اشتعال کے سامنے بھاپ بن کر اڑ گئی تھی۔
اس کا صحیح معنوں میں وہ حال تھا کہ کالو تو بدن میں لہو نہ ہو۔

ولید کے ہاتھ کی تیوریوں اور آنکھوں کی ناگواریت نے ایسی بکی اور خفت سے دوچار کیا تھا کہ مارے انسٹ کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اگر ایسا نہیں تھا تو پھر میری تصویریں آپ کی ڈائری میں کیا کر رہی تھیں.....؟ اور حرا آپا کے گھر جو

اس سے۔“

اور وہ اسے بتا نہیں سکا تھا کہ یہ معاملہ کسی کی بیٹی کا نہیں، انا کو توڑنے کا تھا۔ وہ جھکنے پہ آمادہ نہیں تھا کہ اسے اپنے جذبوں کی توہین گوارہ نہیں تھی۔ ایمان جیسی سر پھری لڑکی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ پھر جبکہ وہ اپنی انا کی تسکین کی خاطر بار بار تردید بھی کر چکا تھا۔

”تتلیاں پھول محبت کے گلابی لمے

اپنی یادوں کی بارات میرے نام کرو

اپنے جیون کے سبھی درد مجھے دے دو تم

اپنے جذبات کی ہر بات میرے نام کرو“

اس نے ایک طویل سانس کھینچا اور اٹھ کر دروازہ کھولنے سے قبل ٹیپ آف کر دیا۔

”کہاں گم ہیں.....؟ ابلا رہے ہیں آپ کو.....!“

دروازے پہ اشعر تھا، اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر بولا۔

”تم چلو.....! میں آتا ہوں۔“

وہ پلٹ کر پیروں میں سلیپر پہننے لگا۔

”بندے کو اتنا بھی انا کا ضدی نہیں ہونا چاہئے کہ زندگی کی خوشیوں کو ہی خود پہ حرام کر لے۔“

اشعر کو اس کی آنکھوں کی سرخیوں نے اذیت دی تھی، جیسی کلس کر بولا۔ ولید نے اسے آنچ دیتی

نظروں سے دیکھا اور سائیڈ سے ہو کر ابا کے کمرے کی سمت آ گیا۔

”آپ نے بلایا بابا.....؟“

دستک دے کر اس نے اندر قدم رکھا تو انہیں ددا کے ساتھ کسی بحث میں مصروف پایا تھا۔

”ہاں.....! آؤ بیٹھو ادھر، آگیا ہے، خود بات کر لیں اب۔“

انہوں نے پہلے اسے، پھر ددا کو مخاطب کیا تھا۔ انداز کی نارنگی چھلکی پڑ رہی تھی۔ ولید نے محتاط

نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ کیا، گھر کے سبھی افراد اس سے روٹھے بیٹھے تھے۔

”کیا کہہ رہا ہے باپ تیرا.....؟ تو نے منع کیا ہے کہ تمہارے حوالے سے ارتضیٰ سے کوئی بات نہ

کرے.....؟“

”یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے ابا جی.....! یہ ہمیشہ سے خود مختار رہا ہے۔ زیادہ پڑھ لکھ گیا ہے ناں.....!“

اس لئے اب ہم جیسوں کی عقل اور فیصلوں پر اعتبار نہیں ہے اسے۔“

انہوں نے کسی قدر کلس کر باپ کو جواب دیا، مگر اس طرح کہ اسے ہی سنایا تھا۔ ولید نے بے بس سی

نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا تھا۔

”بابا.....! پلیز، آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“

”ناں تو پھر یہ بات نہیں ہے کیا.....؟ کیوں تجھے لگتا ہے کہ تیرا چاچو تجھے ہی رشتہ سے منع کرے

گا.....؟ ارے.....! اسے دونوں بیٹیاں برابر کی عزیز ہیں۔ اگر وہ بڑی بیٹی کا رشتہ نہس کر دے سکتا ہے تو

تھوٹی.....“

”میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ چاچو منع کریں گے بابا.....! دونوں لڑکیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا

فرق ہے۔ فضہ یہاں آئی ہے تو رچ بس گئی ہے۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ لیا ہے اس نے، جبکہ وہ.....“

وہ کچھ دیر کے لئے رکا، پھر دوبارہ گویا ہوا۔

”آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ وہ انکار کر کے میری توہین کر دے.....؟“

وہ خفیف سی جھنجھلاہٹ سمیت کہہ کر انہیں تنکے لگا تو تاؤ جی کو کچھ اور بھی تپ چڑھ گئی تھی۔

”ہاں.....! اسے تو الہام ہوا ہے ناں کہ بچی نے انکار کر دینا ہے.....؟ تمہاری طرح ہی ہر کوئی تھوڑا

ہوتا ہے.....؟ اکڑو اور بے لحاظ.....؟“

تاؤ جی نے اسے بے نقط سنائی تھیں۔ وہ سر جھکائے ان کی گرمی سہتا رہا۔

”آپ پتھر سے سر پھوڑ رہے ہیں ابا جی.....! چھوڑیں اسے جانے دیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا

ہوگا.....؟ میں اپنے سے چھوٹے بھائی کے سامنے شرمندہ ہی ہو جاؤں گا ناں.....؟ کہ اگر بچپن میں دونوں

بیٹیوں کی بات کی تھی تو اب ایک کو کیوں چھوڑ دیا.....؟ مجھے تو لگتا ہے، اپنے کالج یونیورسٹی میں ہی کسی لڑکی سے

چکر چلا کے بیٹھا ہوا ہے۔“

تاؤ جی کا پارہ اس کی خاموشی کو دیکھ کر ایک دم چڑھ گیا۔ اس کی یہ چپ انہیں سراسر اس کی ہٹ دھرمی

اور ڈھٹائی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ بوکھلا کر رہ گیا۔

”حد کرتے ہیں بابا.....! آپ بھی۔ ایسا سمجھ رہے ہیں مجھے.....؟“

وہ شپٹا کر وضاحتیں دینے لگا، مگر انہوں نے سنا کہاں تھا.....؟

”میں تجھے اس سے بھی کچھ زیادہ ہی سمجھ رہا ہوں۔ آئندہ مجھ سے بات بھی مت کرنا۔ یہی دن دیکھنے

کے لئے میں نے خود مشقتیں سہ سہہ کر تمہیں منزل پہ پہنچایا تھا.....؟ ایسا ہی ہوتا ہے پتر.....! تو کچھ دنیا سے نیا

اور الگ تھوڑا ہی کر رہا ہے.....؟“

وہ اس پر اپنی کوئی تیش نہ جلتی دیکھ کر جذباتی بلیک میلنگ پر اتر آئے۔ ولید تو چکر اکر رہ گیا تھا اور فوراً

ہتھیار ڈال دیئے۔

”معاف کر دیں مجھے.....! غلطی یہ تھا میں جو آپ کے سامنے اپنے نظریات رکھنے کی غلطی کی۔ ٹھیک

ہے.....! آپ کو جو کچھ کرنا ہے کریں، معافی بھی نہ کریں، سیدھا نکاح کر دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب

خوش.....؟“

جھنجھلاہٹ، خفگی، بے بسی، کیا کچھ نہ تھا اس کے لہجے میں.....؟ تاؤ جی نے قہر بار نظروں سے اپنے

الٹن فائق سپوت کو دیکھا جس پر آج سے قبل وہ برملا فخر کرتے رہے تھے۔

”ہماری لڑکی اتنی گری پڑی نہیں ہے کہ زبردستی تیرے پلے باندھ دیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے یہ

انسان کرنے کی۔“

تاؤ جی کو تو اس کی بات پہ گویا پٹنگے لگ گئے تھے۔ ولید کا جی چاہا، اپنا سر پھوڑ لے۔ وہ سخت عاجز ہوا

”اب اور کیا کروں.....؟ کسی طرح خوش بھی ہوں گے آپ.....؟“

”تو اٹھ اور جا یہاں سے، ہمیں تم سے کوئی خواہش نہیں ہے۔“

تاؤجی نے بے رُخی دے اُعتنائی کی حد کردی تو اسے بھی تاؤ آگیا تھا۔ اپنے پیچھے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کرتا وہ پیر پختا باہر چلا گیا۔ تاؤجی نے ہونٹ بھیجنے کر دوا کی سمت دیکھا۔

”دیکھا آپ نے اس کا طغظہ.....؟“

انہوں نے گویا باپ سے شکایت کی۔ وہ آہستگی سے مسکرا دیئے۔

”آپ ہنس رہے ہیں.....؟“

تاؤجی کو گویا شاک لگا۔ پھر کسی قدر شکایتی نظروں سے انہیں دیکھ کر بولے تھے۔

”آپ کی شہ پہ ہی وہ اتنا بگڑا ہے۔“

”وہ بگڑا ہوا نہیں ہے۔ تم سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ جس بات کو تم اپنی کم فہمی میں نہیں سمجھ سکے، وہ اسی

سے خائف ہے۔“

”اس بات میں بھلا کیا مصلحت ہے.....؟“

تاؤجی بھڑک اُٹھے۔

”وہ خود ایمان کو بہت پسند کرتا ہے، مگر.....“

دارانے ساری بات مختصر اُبتادی، جسے سن کر تاؤجی نے طویل سانس بھرا تھا، پھر رنجیدگی سے بولے۔

”جانتا ہوں، باپ ہوں اس کا، جب ہی تو چاہتا ہوں، اسے اس کے من کی مراد مل جائے۔ آپ کو پتا

ہے ناں، میں نے بچوں کو اس لئے پڑھایا لکھایا تھا کہ یہ میرے بھائی کی بچیوں کے مقابل کھڑے ہوں، تو ان

کے کسی انداز میں کمتری نہ ہو۔ میں اپنی بات بھی نبھانا چاہتا تھا کہ ارتضیٰ کی شادی کے بعد وہ ایک طرح سے ہم

سے جھوٹ گیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی حل نہیں تھا، اسے پھر سے خود سے موڑنے کا۔ خدا کا شکر ہے کہ

آج اس نے مجھے سرخرو کیا ہے۔ مگر اب یہ آپ کا لاڈلہ.....“

”اس نے تمہیں منع نہیں کیا ہے مصطفیٰ.....! تم اس کی نوکری لگنے تک انتظار کر سکتے ہو۔ دیے بھی

ایمان کی عمر ہی ابھی کیا ہے.....؟ فضہ سے چار سال چھوٹی ہے وہ۔“

دوانے رسائیت وزنی سے کہا تو تاؤجی خاموش ہو گئے تھے۔ ان کے انداز سے لگتا تھا انہیں باپ کی

بات سمجھ آگئی ہے۔

☆☆☆

”مسکراہٹ کا ہر اک راز ملاقات سے تھا

میری آنکھوں میں چھپا غم بھی تیری ذات سے تھا

تو نے جانا ہی نہیں اس دل کی تمنا کیا ہے

کچھ تعلق تیرا مجھ سے، میرے جذبات سے تھا“

وہ اپنے دھیان میں کمرے سے نکل کر آئی تھی۔ دیوار کے ساتھ بھی چار پائی پہ کتائیں پڑی تھیں۔

یقیناً اشعر یہاں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ آئی۔ شاعری کی کھلی کتاب کے صفحے ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اس نے یوں ہی ہاتھ بڑھا کر کتاب اُٹھائی تو جہاں سے کھلی تھی، وہاں نہ صرف صفحہ فولڈ کیا گیا تھا، بلکہ ریڈ مارکر

سے پوری غزل کو انڈر لائن کیا گیا تھا۔ لمحہ بھر کو نظریں ساکن ہو گئیں۔ وہ پھر سے دوبارہ پڑھنے لگی۔

”یاد کر تو، تیری ہر بات کو مانا میں نے

خواہش دل کا تعلق بھی عنایات سے تھا

صبح کی تازہ ہوا میں بھی زہر شامل تھا

شب کے اس ظلم کا انداز تیری ذات سے تھا

دل جو ٹوٹا تو بدن بھی ہوا ریزہ ریزہ

سلسلہ جسم کا دل کا میرے جذبات سے تھا

بھولنے والے تیری یاد کے لمحوں کی قسم

کس قدر حسن تیری یاد کے لمحات سے تھا

کوئی بھی آس نہیں زیست بھی ہے بے معنی

میری سانسوں کا میرے حالات سے تھا

بات کرتا ہوں تو وہ سامنے آجاتا ہے

اس طرح ربط میرا اس کے خیالات سے تھا“

اس کا دل جانے کیوں گداز سا ہونے لگا.....؟ کتاب بندی اور ٹھوڑی کے نیچے نکا کر وہ کچھ سوچنے

لگی تھی، جب اشعر کی شوخی سے بھرپور کھنکار پر بد مزہ ہو کر پٹلی۔

”مجھے پتا تھا یہ شغل ویلے نکلوں والا صرف تم ہی سے منسوب ہو سکتا ہے۔“

اشعر زور سے ہنس پڑا۔ پھر سر کوئی میں جنبش دیتا ہوا بولا تھا۔

”ناں جی.....! اللہ نے ہمیں تو بچا کے رکھا ہوا ہے اس فضولیات سے۔ یہ تو ایک لچر قسم کا دوست

پیچھے پڑا ہوا ہے کہ کچھ اچھی شاعری سینڈ کروں، تب دلی بھائی کی کتاب چرا کر لایا تھا نقل کرنے کے لئے۔

لائیے.....! واپس رکھ آؤں۔“

اس نے کتاب لینے کو ہاتھ بڑھایا۔

”تمہارے دلی بھائی عجیب سے نہیں ہیں.....؟ انہیں دیکھ کر ایسا نہیں لگتا جیسے کسی سے عشق و شوق

فرماتے ہوں.....؟“

اس نے بظاہر سرسری انداز میں کھوج لگانے کی کوشش کی کہ وہ تو اتنا چکنا گھڑا تھا، کبھی پھوٹ کر نہ

دیتا۔

”ہاں جی.....! آپ کا اندازہ درست ہے۔ بے چارے مریمض محبت ہیں۔“

اشعر کی بات پر وہ ایک دم اندر سے کھل اُٹھی، مگر بظاہر سنجیدگی سے بولی تھی۔

انداز ایسا تھا، گویا جتاری ہو۔

”آپ کی گاڑی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“

عاقب نے کچھ کہے بغیر کوٹ کی جیب سے چابی نکال کر اس کی سمت بڑھا دی۔
”تھینکس.....!“

اس نے چابی اچکی اور ان کی نگاہوں کی تشویش کو نظر انداز کئے آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”خیمے سے دُور شام ڈھلے اجنبی جگہ

نکلے ہوں کسی کی کھوج میں بے وقت سر کھلے

وہ مجھ سے دُور خوش ہے، خفا ہے، اُداس ہے

کس حال میں ہے کچھ تو میرا نامہ بر کھلے

ہر ریت میں وہ شخص نظر کو بھلا لگے

حد یہ کہ روٹھ جانا بھی اس شوخ پہ کھلے“

بے چینی، وحشت، اضطراب، بے کلی، کتنے ہی احساسات تھے اس کے ہوا، جن سے چھٹکارے کی خاطر ہی وہ یوں گاڑی لے کر نکلی تھی، کسی بھی سمت کا تعین کئے۔ بغیر یہ احساس ہی رگ جان میں خنجر اتار رہا تھا کہ وہ بے حس، مغرور اور گھمنڈی شخص جانے کب، کیسے اس پہ حاوی ہو گیا تھا.....؟ وہ اس کے لئے خاص ہے، یہ احساس ایمان کو روہنا کر رہا تھا۔ وہ تو ہمیشہ اسے نیچا دکھانے، اسے زچ کرنے، شکست سے دوچار کرنے کی خواہش میں وہ خود شکست سے دوچار ہو گئی تھی، خود اس کی اسیر ہو گئی تھی، اور خود کو برتر رکھنے والوں کو اپنی ہاریوں ہی زلایا کرتی ہے۔ اتنی ہی اذیت عطا کرتی ہے جتنی اذیت کا وہ شکار ہوتی تھی۔

اس کی جیکٹ میں پڑا اس کا سیل فون بار بار واہیریت کر رہا تھا، مگر وہ انور کئے رہی۔ وہ جو خود سے بھی بھاگ رہی تھی، بھلا کسی اور کا سامنا کرنے کی تاب کہاں سے لاتی.....؟

سورج واپسی کا سفر شروع کر چکا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلی تھی، اور اب سورج کو مکمل طور پر غروب ہوئے بھی ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا۔ یقیناً گھر میں اب تک اس کے لئے سب فکر مند ہو چکے تھے۔ مگر اسے احساس ہی نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ تنہا اجنبی علاقے میں ہے، اور کتنی خطرناک بات ہے۔ وہ تو گویا سب کچھ بھولی ہوئی تھی۔

گاڑی کی اسپید ہر گزرتے لمحے تیز ہو رہی تھی اور اسی خطرناک اسپید کی بدولت موڑ مڑتے ہوئے سامنے سے آنے والی لینڈ کروزر کی زد سے چھوٹی سی کرولا کو کسی طرح بھی نہ بچا سکی۔ اس کی نگاہیں لینڈ کروزر کی تیز روشنیوں سے چندھیا سی گئیں۔ اس نے سرعت سے اسٹیرنگ ڈھیل گھمایا تھا، مگر اس کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہو گئی اور اگلے ہی لمحے فضاء ٹائروں کی چرچاہٹ اور ایک خوف ناک دھماکے سے لرز اُٹھی تھی۔

☆☆☆

”دُشمن ہے اور ساتھ رہے جان کی طرح

”ہوں.....! کون ہے وہ لڑکی.....؟“

”انہیں ہی پتا ہوگا۔“

اب کی بار اشعر نے صاف کٹی کٹرائی تھی۔

”بتا دو مجھے بھی، میں کون سا انہیں جا کر بتانے والی ہوں.....؟“

اس نے بے نیازی سے کہا تھا، مگر اندر تجسس نے اودھم مچا رکھا تھا۔

”ایک بار پتا چل جائے، ثبوت ہاتھ لگ جائے، پھر میں کیسی درگت بناتی ہوں ولید حسن.....!“

بھاری، دیکھنا تم.....!“

”مجھے واقعی نہیں پتا ہے، ٹرسٹ می.....!“

اشعر نری سے کہہ کر کتاب لئے سیڑھیاں اتر گیا۔ وہ چلبلا کر رہ گیا۔ اسے پورا یقین تھا، جب تاؤ جی، فضہ کی پاپا سے بات کریں گے، لازماً برسوں قبل طے کئے اس کے رشتے کی بات بھی چلے گی اور تب اسے ولید سے حساب چکنا کرنے کا موقع میسر آجائے گا۔ مگر وہ منتظر ہی رہی تھی اور ایسا کوئی تذکرہ نہیں ہوا تھا۔ ایک حیرانی کے ساتھ ساتھ ایک بے مائیگی اور انسٹل کا بھی احساس تھا جو اسے دھیمی دھیمی آگ میں جلا رہا تھا۔

بھلے اسے ولید کی ذات میں دلچسپی نہیں تھی، مگر یہ احساس تو تھا ناں کہ وہ اس کے نام سے منسوب ہے۔ مگر اب یہ خاموشی اسے بے چینی کے گرداب میں الجھا رہی تھی۔ ہر وہ یقین جو اسے یہ احساس بخشتا رہا تھا کہ وہ اس کی ذات میں انوالو ہے، ہاتھ چھڑاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی جگہ اس خدشے نے دل میں جگہ بنانا شروع کر دی تھی کہ کہیں ولید کسی اور میں انٹرنلڈ تو نہیں ہے.....؟ وہ چاہتی تو کسی سے بھی اس بات کی تصدیق کرا سکتی تھی۔ فضہ سے، ماما سے، بابا سے۔ مگر اس کی بلند وبالاسی اُنا کو ہر گز بھی یہ گوارہ نہیں تھا۔

نیچے گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر وہ اپنے خیالات سے چونک اُٹھی۔ یقیناً عاقب حسن تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال نے سرعت سے جگہ بنائی تو تیزی سے سیڑھیاں پھلانگی ہوئی نیچے آ گئی۔

”عاقب بھائی.....!“

اس نے آخری سیڑھی پہ رُک کر اپنے کمرے کی سمت جاتے عاقب حسن کو بے اختیار پکارا تھا۔

”جی جناب.....! حکم.....!“

عاقب پلٹا اور مشفق قسم کی نظروں سے اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”مجھے گاڑی کی چابی چاہئے.....!“

”کہیں جانا ہے کیا.....؟“

عاقب ایک پل کو چونکا۔ اس نے محض گردن کو اثبات میں جنبش دی۔

”آؤ.....! میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ.....!“

عاقب اُلٹے قدموں مڑ کر اس کے نزدیک آ گیا۔ اس نے ایک بار پھر سر کو نفی میں ہلایا۔ انداز میں

مخصوص ہٹ دھرمی اور ضد کا عنصر تھا۔

”مجھے اکیلے ہی جانا ہے۔ ویسے مجھے گاڑی ڈرائیور کرنا آتی ہے، ڈونٹ وری.....!“

”پچھلے دس سالوں سے تو ہوئی نہیں، اگر ہونی ہوتی تو ہو چکی ہوتی۔“

ہارون کا دوانی نے کہا تھا اور وہ ہارون سے خفا ہو گیا تھا۔ مگر اب جب ہارون نے اس کو لڑکی کو دیکھا اور خود کو اس کا اسیر ہوتے محسوس کیا تو سب سے پہلے اسے ہی خوش خبری سنائی تھی۔

”مجھے وہ لڑکی مل گئی ہے موسیٰ! جسے تمہاری بھابی بننا چاہئے۔“

”ریلی! مجھے ملائیں بھائی! ابھی، اسی وقت۔“

وہ کیسے بے تاب ہوا اٹھا تھا، چل کر فرمائش کر دی۔

”ابھی ممکن نہیں! اس کا ایکسٹنٹ ہوا ہے میری گاڑی سے، اور میں اسے لے کر ہسپتال جا رہا ہوں۔ فی الحال تو بس تم اس کے لئے دعا کرو، کیونکہ اس وقت اسے سب سے زیادہ دعا کی ہی ضرورت ہے۔“

ہارون نے کہہ کر رابطہ کاٹ دیا تھا اور اب پچھلے دو گھنٹوں سے ہارون کے سیل پر مسلسل موسیٰ کے میسجز اور کالز آ رہی تھیں، جن میں ایک یہ تقاضہ تھا کہ وہ اسے ہسپتال کا نام بتائے، وہ خود وہاں پہنچ جائے گا، اور ہارون کا دوانی اس کی شدتوں سے گھبرا اٹھا تھا۔

”پاگل ہو تم موسیٰ! انجان لڑکی ہے، ہمیں کیا پتا وہ انگیجڈ ہو.....؟ یہ بھی ممکن ہے، میریڈ ہی ہو.....؟“

اس نے دل میں مچلتا خدشہ اس تک پہنچایا اور وہ اپنے مخصوص اناؤلے اور جذباتی انداز میں بولا تھا۔

”اول تو ایسا کچھ ہوگا نہیں، اگر ہوا بھی تو اب وہ صرف آپ کی ہے لالہ! ڈونٹ وری!۔“

اور اس کی بات پہ ہارون کا دوانی سر جھٹک کر ہنس پڑا تھا۔

”محترم! آپ کی حکمرانی شاہ پور میں ہے، پورے پاکستان میں نہیں!۔“

”پورے پاکستان میں ہی ہے۔ بس! طاقت کا استعمال آنا چاہئے۔“

موسیٰ کے لہجے نے پہلی بار ہارون کا دوانی کو ٹھٹھکایا، اور اسے ایک دم لگا جیسے وہ موسیٰ کو بتانے میں جلد بازی کر گیا ہے۔

”کیا مطلب.....؟“

اس کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔

”کچھ نہیں!۔“

موسیٰ بھی سن بھل گیا اور فون بند کر دیا تھا۔ ہارون نے سیل آف کر کے جیب میں رکھا، اسی پل دروازہ کھلا اور ارتضیٰ کے ساتھ ولید اور تاؤ جی، عاقب بوکھلائے، گھبرائے ہوئے اندر چلے آئے۔

”مہنی! ایمان بیٹا!۔“

پاپا نے تڑپ کر اسے پکارا تو وہ جو آنکھیں موند لھے نڈھال سی پڑی تھی، چونک کر متوجہ ہوئی۔ تب تک پاپا اس کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ وہ ان سے لپٹ کر بری طرح سے بلک اٹھی۔

”پاپا! پاپا! پاپا! مجھ سے بہت لاس ہو گیا ہے، ساری گاڑی تباہ ہو گئی ہوگی۔ مجھے معاف کر دیں

پاپا! میری وجہ سے.....“

مجھ میں اتر گیا ہے وہ سرطان کی طرح

جکڑے ہوئے ہے تن کو میرے اس کی آرزو

پھیلا ہوا ہے جال سا شریان کی طرح“

اس کی دوبارہ آنکھ کھلی تو خود کو ہسپتال میں پایا تھا۔ سفید بستر، سفید چادر میں اس کا سر اپا چھپا ہوا تھا۔ ایک پل کو تو اسے لگا کہ وہ مر گئی ہے، عدم میں ہے۔ مگر اس سے مخاطب وہ مہربان آواز اپنا احساس بخش رہی تھی جو اس سے مخاطب تھی۔ مگر اسے آواز کا، الفاظ کا مفہوم سمجھنے میں دشواری کا سامنا ہوا۔ ایکسٹنٹ بہت شدید تھا۔ پتا نہیں وہ بچ کیسے گئی تھی.....؟ سر میں، جسم کی ایک ایک پور میں درد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس تکلیف کے احساس نے آنکھوں بے سیل رواں جاری کر دیا۔

”ارے! نائس گرل! آپ رور ہی ہو.....؟ کم آن بی بریو!۔“

اس کی داہنی جانب سے وہی آواز ابھری۔ اس مرتبہ وہ مفہوم بآسانی سمجھ گئی۔ مگر کوئی رد عمل نہ دیا اور کچھ اور شدتوں سے رونے لگی۔

”آپ پہلے بے بہت بہتر ہیں۔ حوصلہ کریں، میں نے آپ کے فادر کو انفارم کر دیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں وہ آپ کے پاس پہنچنے والے ہوں گے۔“

اس بھاری بھر کم آواز نے پھر قلی سے نواز تو اس نے یوں ہی بہتے آنسوؤں کے ساتھ ذرا سی نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔ دراز قامت فیز کا میکیشن، بڑی بڑی پرکشش آنکھیں، وہ شاندار پرسنالٹی کا مالک تھا۔

”آئی ایم ہارون کا دوانی! میں ہی آپ کو ہسپتال لے کر آیا ہوں۔ وہ گاڑی جس سے آپ کا ایکسٹنٹ ہوا تھا، میری ہی تھی، اور مجھے بے حد افسوس ہے۔“

وہ اس کی نگاہوں کی اجنبیت کو پا کر ہی تفصیلی تعارف کرانے لگا تھا۔ ایمان نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں موند لیں۔ جبکہ ہارون کا دوانی کی نگاہیں اس کے چہرے کے ساحرانہ نقوش میں بھٹکنے لگی تھیں۔

تینتیس سالہ ہارون کا دوانی کا دل اس نازک پھول جیسی لڑکی کو ایک نگاہ دیکھ کر ہی خود پہ ایک بار پھر اختیار کھو بیٹھا تھا۔ وہ جس کا خیال تھا، اب وہ کبھی زندگی میں دوبارہ ضویا جیسی محبت کسی اور کو نہ دے سکے گا، جیسی تو اس نے ماں جی کی منتوں، سماجیوں کے باوجود شادی سے انکار کر دیا تھا کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کا خواہاں نہیں تھا۔ وہ بہت صاف گو، کھرا اور سچا انسان تھا۔ دوغلی زندگی سے نفرت تھی، جیسی شادی نہ کرنے کا عہد خود سے باندھ لیا تھا۔

ضویا اس کی محبت تھی۔ دس سال قبل وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گئی تھی اور دس سالوں سے ہی ہارون کا دوانی نے خود پہ ہر قسم کی خوشی کو حرام کر لیا تھا۔ موسیٰ اور ماں جی کی بے حد خواہش کے باوجود، موسیٰ جو اس کا چھوٹا بھائی تھا، دونوں کی عمروں میں آٹھ سال کا فرق تھا، وہ موسیٰ کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ موسیٰ کی بھی اس سے محبت دیوانگی کی انتہاؤں کو چھوٹی تھی۔ موسیٰ کی ہر بات ماننے والا ہارون کا دوانی اسے یہ خوشی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ جب بھی شادی پر اصرار کرتا، ہارون چپ سادھ لیتا۔ ابھی کل ہی دونوں کی ایک بار پھر شدید بحث ہوئی تھی۔ موسیٰ کا موقف تھا کہ وہ کسی لڑکی کو زندگی میں شامل کر لے، محبت خود بخود ہو جائے گی۔

پرو گئی میری پلکوں پہ آج شبنم پھر
وہ نرم لہجے میں کچھ کہہ رہا ہے پھر مجھ سے
چھڑا ہے پیار کے کوئل سروں مدھر پھر
تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الٹھ رہا ہے میرے فیصلوں کا ریشم پھر
نہ اس کی بات میں سمجھوں نہ وہ میری نظریں
معاملات زبان ہو چلے ہیں مبہم پھر
بہت عزیز ہیں آنکھیں اسے میری لیکن
وہ جاتے جاتے نہیں کر گیا ہے پر نم پھر

وہ نڈھال سی بستر پر پڑی تھی۔ آج اس کا دل عجیب دشتوں میں گھرا ہوا تھا

ایک بار پھر اسے لگا تھا جیسے واقعی وہ خوش گماں تھی۔ ورنہ وہ واقعی اس میں انٹرنڈ نہیں تھا۔ صبح شام
تاؤ جی کی زبردست ڈانٹ سن کر وہ مارے بندھے ہی اس کی بینڈج پہنچنے کرنے آیا کرتا تھا، مگر انداز ایسا
اجنبیت سے بھرپور اور لاطعلقی لئے ہوئے ہوتا کہ وہ بھی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ جاتی۔
”آج ابھی تک ولید نہیں آیا۔ دیکھنا کہیں چلا نہ جائے۔ اتنے تو کام ہیں بیچارے کی جان کو لگے
ہوئے، یاد بھی بھول سکتا ہے۔“

اسے ان لایعنی سوچوں سے ماما کی آواز نے نکالا تھا جو فضا سے مخاطب تھیں۔

”نہیں ماما.....! ناشتہ کر رہے ہیں دلی بھائی.....! ویسے میں نہیں جا کر یاد کراتی ہوں۔“

فضہ ان کے آگے ناشتے کی ٹرے رکھ رہی تھی۔ ماما اس کی بیماری کی وجہ سے مستقل اس کے ساتھ رہتی
تھیں۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے زحمت کی، ان سے کہہ دینا، جو وہ دن رات یہ احسان کرتے ہیں، بڑی
مہربانی ہوگی جو اسے اٹھالیں گے۔“

وہ جو پہلے ہی بے مائیگی کا شکار تھی، اس قسم کی باتیں سن کر جیسے حواسوں میں نہیں رہی تھی۔ جیسی تو
دروازے سے اندر آتے ولید کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ ماما نے بے اختیار گھبرا کر اس کا ہاتھ دبا کر گویا ولید کی موجودگی
سے آگاہ کرنا چاہا مگر وہ کچھ اور بھڑک گئی تھی۔

”ہاں تو سن لیں، جو بھی سنتا ہے سن لے، میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔“
وہ ضبط گنوا تی چیخ پڑی تھی۔ ولید کچھ کہے بغیر آگے بڑھ آیا۔ پلنگ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ کر ہاتھ
بڑھا کر بینڈج اتارنا چاہی تو ایمان نے بہت شدت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”آپ تو مجبوراً بھی وہ کام نہیں کرتے جو آپ کا کرنے کو جی نہ چاہے، پھر یہ مجبوریاں کیوں نبھا رہے

ہیں.....؟“

وہ بے حد زور سے چیختی تھی۔ ولید نے ہونٹ بھیج کر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

تب سے اب تک جو پریشانی اسے گھبراہٹ، تشویش اور شرمندگی میں مبتلا کرتی رہی تھی، بے اختیاری
میں وہی الفاظ ٹوٹے پھوٹے انداز میں اس کی زبان سے پھسل پڑے تھے۔ رونے کی شدت میں اور اضافہ ہو گیا
تھا۔ ولید گہرا سانس بھر کے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ پاپا اسے ساتھ لگائے نرمی و محبت سے تھپکتے رہے تھے۔ جبکہ
تاؤ جی اس کی بات پہ سخت مضطرب ہو کر سرعت سے اس کے قریب آئے تھے، پھر اس کے دوسری جانب بیٹھ کر
بڑی شفقت اور سہاؤ سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر ڈھارس بندھاتے ہوئے بولے تھے۔

”کاہے کو فکر کرتی ہے پتری.....؟ ایسی دس گاڑیاں تیری جان کا صدقہ سمجھ کر وار دیں تیرے
تاؤ جی.....! اللہ سونے کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری جی صبح سلامت ہے۔“

”السلام علیکم.....! آئی ایم ہارون کا دوانی، فکر نہ کریں، انہیں زیادہ چوٹیں نہیں آئی ہیں۔ بائیں ٹانگ
کا فریکچر ہوا ہے، میری ڈاکٹر سے بات ہوگئی ہے۔“

ہارون کا دوانی آگے بڑھ کر ولید سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا تو ولید جو کسی قدر روتی بلکتی ہوئی ایمان
کو مضطرب سا دیکھ رہا تھا، چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوا۔

”بہت بہت شکریہ جناب.....! آپ کے اتنے تعاون کا۔“

ولید واقعی مشکور ہوا تھا کہ ہارون نے نہ صرف ایمان کو ہاسپٹل پہنچایا تھا، بلکہ ایمان کے سیل فون میں
جتنے بھی نمبرز تھے، سب پہ کال کر کے اس حادثے کی اطلاع پہنچا کر ہاسپٹل آنے کا کہا تھا، اور ان کے پہنچنے تک
خود بھی وہاں موجود رہا تھا اور یہ آج کے اس مفاد پرست دور میں کسی کی اچھائی و بھلائی کا غماز تھا۔

”نو ٹھینکس سر.....! یہ تو میرا فرض تھا، کوئی احسان تھوڑا ہی کیا ہے آپ پر.....؟ اگر سچ پوچھیں تو مجھے
یہ سب بہت اچھا لگا ہے۔ اس حادثے کے سبب اتنے اچھے لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔“

کچھ ایسا تھا انوکھا ہارون کا دوانی کے لہجے میں کہ ولید نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی نگاہوں کو
ایمان کے چہرے کا مرکز پائے اس کا فشار خون ہی نہیں بڑھا، چہرے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی سرخیوں اتر
آئی تھیں کہ ہارون کا دوانی کی نگاہوں کا انداز ہی ایسا تھا۔ پھر ولید نے اس سے جان چھڑانے کی بہتری کوشش
کی، مگر وہ تو گویا جان کو چپک گیا تھا۔ ایمان کو ڈس چارج کروا کے جب وہ لوگ آنے لگے، تب بھی ہارون نے
اپنی گاڑی میں انہیں گھر تک چھوڑنے کی آفر کی اور اس کے انکار کے باوجود منوا کر ہی دم لیا۔ اس کا یہ التفات
ولید کے اعصاب پہ بوجھ بن کر گر رہا تھا۔

اور جس کی وجہ سے یہ سب ہو رہا تھا، وہ ہر بات سے بے نیاز پاپا کے کاندھے سے لگی کتنی مطمئن اور
سرشار نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر ہی ولید کو اندازہ ہو گیا، اس کی جان جل کر خاک
ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

”سکون بھی خواب ہوا نیند بھی ہے کم کم پھر
قریب آنے لگا دُوریوں کا موسم پھر
بنا رہی ہے تیری یاد مجھے سلگ گھر

”کیا ہو گیا ہے ایسی! کام ڈاؤن!“

فضہ نے گھبرا کر اسے کاندھوں سے تھاما، مگر وہ پھرے ہوئے انداز میں اسے بھی جھٹک کر سرک کر دور ہو گئی۔

”پلیز فضہ! انہیں کہہ دو، اپنی ہمدردیوں کی بھیک لے کر یہاں سے چلے جائیں۔“

وہ چیختے ہوئے نڈھال ہو کر ماما کی گود میں منہ چھپا گئی۔ ولید کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ماما سسکتی بگتی ایمان کو سنبھال رہی تھیں۔ فضہ بھاگ کر ولید کے پیچھے آئی جو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سیڑھیوں کی سمت جا رہا تھا۔

”آئی ایم سوری ولید بھائی! وہ آپ سیٹ ہے۔“

”کس وجہ سے؟“

اس نے گہری کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھا۔

”اور پلیز! آپ اس کی بدسلوکی کی مجھے سے معافی مت مانگا کریں، مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

وہ زندگی میں پہلی بار فضہ سے بھی تلخ کلامی کر گیا۔ فضہ نے متحیر ہو کر اسے دیکھا، مگر وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔ وہ پریشان سی ہو کر اس کے پیچھے آئی تھی، مگر تب تک وہ ڈیوڑھی میں کھڑی اپنی بائیک گھسینا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ وہ ہونٹ بھیجنے کر اسے جاتے دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

وہ حیرانی و تحیر کے عالم میں کوریئر سروس کے ذریعے آنے والے فریش پھولوں کے ٹکے کو دیکھ رہی تھی جو ابھی کچھ دیر قبل ہی فضہ نے اسے لا کر دیا تھا۔

”یہ کہاں سے آیا ہے؟“

اس کے استفسار پر فضہ نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔

”پڑھ لو، کارڈ پہ نام بھی لکھا ہوا ہے بھیجنے والے کا۔“

وہ اپنی حیرانی کے باعث فضہ کے لمبے پر غور ہی نہ کر پائی جو خاصا خفا خفا سا تھا۔ اس نے خوب صورت مومی چکنے پیپر کے اندر احتیاط سے ہاتھ ڈال کر کارڈ باہر کھینچ لیا۔ ننھے سے کارڈ پہ مویہ کی ادھ کھلی کلی پہ شبثی اوس کے قطرے اتنے اور جیٹل محسوس ہو رہے تھے کہ اس نے بے اختیار انہیں چھوا اور پھر اپنی بے وقوفی پہ مسکرا کر کارڈ کھولا۔

”پت جھڑ کے موسم میں اس کو

کون سے پھول کا تحفہ بھیجوں

میرا آنگن خالی ہے

لیکن میری آنکھوں میں

نیک دُعاؤں کی شبنم ہے

شبنم کا ہر تارہ

تیرا آنچل تھام کے کہتا ہے

خوشبو، گیت، ہوا، پانی

اور رنگ کو چاہنے والی لڑکی

جلدی سے اچھی ہو جا

صبح بہار کی آنکھیں کب سے

تیری نرم ہنسی کا رستہ دیکھ رہی ہیں

ہارون کا دوانی!.....“

اس کا استعجاب کچھ اور بڑھ گیا۔

”کس نے بھیجا ہے یہ؟“

اس کی سوالیہ نگاہیں پھر سے فضہ کی سمت اُنھیں۔

”میں کہہ چکی ہوں، کارڈ پہ نام لکھا ہے بھیجنے والے نے۔“

”میں پڑھ چکی ہوں، مگر یہ ہارون کا دوانی ہے کون؟“

وہ بری طرح سے جھلائی۔ فضہ کا انداز اس کا خون کھولا گیا تھا۔

”تم واقعی ہارون کا دوانی کو نہیں جانتی ہو؟“

فضہ کا انداز اب کی مرتبہ خوب استعجابی ہو گیا تھا۔ ایمان نے خون خوار نظروں سے اسے گھورا۔

”پاگل ہو گئی ہو فضہ! یا مجھے کرنے کا ارادہ ہے؟ اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دوں کہ میں نہیں

جانتی؟“

وہ بے طرح جھنجھلائی تو فضہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔

”ہارون کا دوانی وہی شخص ہے جس کی گاڑی سے تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ ہاسپٹل ٹریٹ منٹ

کے بعد تمہیں گھر بھی چھوڑنے کے لئے آیا تھا۔“

”تو؟“

”تو یہ کہ وہ ہر روز ولید کے، عاقب کے سیل فون پر کال کر کے تمہاری خیریت دریافت کرتا ہے۔“

فضہ کے لمبے میں ایک ہیجان سا تھا۔ ولید نے جب سے اسے بتایا تھا سب کچھ وہ بھی ایمان سے خفا

ہوئی تھی۔

”تو؟“

ایمان کا انداز ہنوز تھا۔ فضہ پاگل ہونے لگی۔

”تو یہ کہ وہ آج اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ تمہاری عیادت کو بھی آ رہا ہے۔“

”تو اس میں ایسی کیا بری بات ہے فضہ! کہ تم مجھ سے اس طرح روڈی بات کر رہی ہو؟“

وہ پھٹ پڑی تھی۔

”تمہیں واقعی کچھ نہیں پتا؟ اس نے تم سے کوئی بات نہیں کی؟“

اب کے فضا ٹھک کر اسے تنکے لگی تھی۔

”کون سی بات.....؟ فضا.....! کوئی خاص بات ہے کیا.....؟ وہ مجھ سے کیوں بات کرے گا بھلا.....؟ بتاؤ مجھے، میرا سیل فون اسی روز سے ایکسپائر ہے، تم کیا سمجھ رہی ہو آخر.....؟“

اب کے وہ خود بھی ٹھک گئی تھی اور روہانی ہونے لگی۔ فضا نے ہونٹ بھیج کر سر تھام لیا تھا۔ کل شام جب اس نے ولید سے اس کے رویہ کی شکایت کی تو وہ جو خود ضبط کرتے ہوئے پاگل ہو رہا تھا، اس کے سامنے پھٹ پڑا۔

”اب کی بار آپ مجھے قصور وار نہیں ٹھہرا سکتی ہیں فضا.....!“

”ہوا کیا ہے آخر.....؟ کچھ مجھے بھی پتا چلنا چاہئے نا.....؟“

فضا کو اب اس پہ غصہ آنے لگا تھا۔ دونوں بچوں کی طرح فضول حرکتیں کر کے سب کو پریشانی میں مبتلا کر بیٹھے تھے۔

”ایمان کو میں پسند نہیں تھا، یہ بات تو کلیئر ہے نا.....؟“

وہ اس کی تصدیق چاہنے لگا جو فضا چاہنے کے باوجود نہ کر سکی۔

”اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہارون کا دونی ہر لحاظ سے بہتر ہے مجھ سے۔“

”کیا مطلب.....؟ تھرڈ پرسن کا کیا ذکر یہاں بھلا.....؟“

فضا نے ہونٹ ہو کر اسے دیکھا تو ولید کے چہرے پر زخمی سی مسکان بکھر گئی تھی، جس میں کرب تھا، اذیت تھی۔

”انہی کا تو ذکر ہے محترمہ.....! اور تھرڈ پرسن وہ نہیں، میں ہوں۔“

وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگا۔

”کیا کہہ رہے ہیں دلی بھائی.....! مجھے بتائیں پلیز.....! میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا ورنہ۔“

وہ ڈوبتے دل سمیت وہیں بیٹھ گئی۔

”ہارون کا دونی آپ کی سسر سے شادی کے خواہاں ہیں۔ ہر روز جانے کتنی بار کال کر کے مجھ سے ان کی خیریت دریافت کی جاتی ہے۔ آج اپنی آمد کا بتا رہے تھے کہ کل والدہ اور بھائی کے ساتھ باقاعدہ پرپوزل لے کر آئیں گے۔“

فضا کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

”آپ نے منع کیوں نہیں کیا انہیں.....؟“

وہ ہول کر بولی تو وہ گہرے طفرے سے بولا تھا۔

”کس بیس پر.....؟“

”وہ آپ سے انگلیڈ ہے دلی بھائی.....! اور آپ یہ بات جانتے ہیں۔“

”مگر آپ کی بہن اس بات کو نہیں مانتی اور شاید ایسی بات ہو تو وہ انکار بھی کرے، اور آپ جانتی ہیں کہ مجھے اپنی یہ تذلیل گوارہ نہیں، اور اس بات کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہارون صاحب یہ اتنا بڑا قدم

آپ کی سسر کی ایماء پر نہیں اٹھا رہے ہیں.....؟“

اس کی پور پور زہر ہو رہی تھی، اور فضا سے اس سے آگے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔ اس نے اپنے تئیں پر فرض کر لیا تھا کہ ہارون کا یقینا ایمان کے ساتھ فون پہ کانٹیکٹ ہوگا، مگر اب وہ اپنی حماقت پہ بے حد خفت زدہ تھی۔

”کیا بات ہے.....؟ تم کچھ بتا کیوں نہیں رہی ہو.....؟“

ایمان اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو حیرت کی نگاہ سے تک رہی تھی۔ طویل خاموشی پہ اکتا کر بولی۔ فضا نے چونک کر اسے دیکھا، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دباتے ہوئے بولی تھی۔

”ہارون کا دونی کی حیثیت مستقبل میں تمہاری زندگی میں بہت بڑھ جائے تو کیسا لگے گا تمہیں.....؟“

”کیا مطلب.....؟“

ایمان نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم خفگی در آئی تھی۔

”مطلب یہ کہ وہ شاید تمہیں بہت پسند کرنے لگا ہے۔ آج آرہا ہے اپنی فیملی کے ساتھ تم سے ملنے۔“

”دماغ ٹھک ہے اس کا.....؟“

وہ بھڑک اٹھی۔

”ایک ذرا سا احسان کر کے وہ مجھے اپنا زر خرید بنا لے گا.....؟“

”یہ بات نہیں ہے ایکی.....! وہ پراپر.....“

”اس کی فیورمت کرو فضا.....!“

وہ چیخ پڑی۔

”میں اس کی فیور نہیں کر رہی ہوں۔ یہ جزل بات ہے ایکی.....! کہتے ہیں، جہاں بیری ہو، وہاں

پتھر آیا ہی کرتے ہیں۔“

”تم لوگوں کا یہ فرض تھا کہ اسے پہلے ہی منع کر دیا جاتا کہ میں انگلیڈ ہوں۔“

شدید غیض میں کہی گئی بات پہ شاید اس نے خود بھی دھیان نہیں دیا تھا یا محبت کو کھونے کے ڈر سے انا

نو سائیڈ پر ڈال دیا تھا، جو کچھ تھا، بہر حال فضا کو شاک لگا تھا۔ وہ قطعی سمجھ نہیں پائی اپنی فیلنگ کو کہ وہ ایمان کی

بات پہ خوش زیادہ ہے یا حیران.....؟

”انگلیڈ ہو.....؟ مگر کس سے.....؟“

معاً فضا نے خود کو سنبھالا اور کسی قدر طنز سے یہ سوال کیا تھا۔ ایمان جو اپنی بے اختیاری پہ جیسے خود

سے بھی نظریں چرا رہی تھی، ہونٹ بھیج کر اسے تنکے لگی۔

”تمہیں نہیں پتا.....؟“

اس کے بے بسی کے مظہر آنسو گالوں پر اتر آئے۔ فضا کے اندر جیسے کلیاں چننے لگی تھیں۔ بے اختیار

۶۸ اسے گلے لگا لیا۔

وہ بے حد مضطرب تھا۔ آج گویا اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی بھی ہار دی تھی۔ پتا نہیں اس نے اُنا کو محفوظ رکھ کر دل کو کیوں دار پہ لٹکا دیا تھا، جو سک سک کر کہے جاتا تھا۔

”اک بار تو کوشش کی ہوتی

شاید وہ مل جاتی

قسمت یاوری بھی تو کر سکتی تھی

نار سائی نصیب نہ ہوتی“

”بھلے ہو بھی جاتی مگر تم تو یہ ظلم نہ کرتے۔“

سوچیں اسے اضطراب بخش رہی تھیں۔ وہ بے طرح تھک گیا تھا۔ بے مقصد بایک کوسروں پر دوڑا

دوڑا کر گھر جانے سے خائف تھا۔ حقیقت سے فرار چاہ رہا تھا جو تلخ تھی، مگر کب تک.....؟

اب جبکہ یہ فیصلہ کیا تھا تو پھر اس پہ ڈٹ جانا بھی ضروری تھا۔

وہ ہارا تھا پر اپنی ہار کسی پہ آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا، جیسی خود کو مضبوط بناتا گھر چلا آیا تھا۔ گھر میں

مہمانوں کی آمد کے آثار نمایاں تھے۔ خصوصی صفائی کی گئی تھی۔ کچن سے اشتہا انگیز خوشبوؤں کا ایک طوفان سا

اُٹھ رہا تھا۔ وہ ایک اچھی فیملی تھی، اس کے مطابق شاید تاؤ جی اور تائی ماں نے اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے تو

ایمان پہ کئے گئے احسان کے پیش نظر یہ عزت افزائی دینا تھی کہ یہ اصل بات تو صرف ولید کو ہی پتا تھی، اور ولید

کے بعد فضا کے علم میں آئی تھی۔ مگر اب وہ بھی ایمان سے بات کلیئر کر لینے کے باعث بے حد ریلیکس تھی۔

مگر ولید کے سر کا درد شدید ٹیسوں میں ڈھل گیا تھا۔ بایک ڈیڑھ سی میں کھڑی کر کے وہ سرعت سے

اپنے کمرے کی سمت جا رہا تھا، جب تائی ماں نے اسے دیکھ کر پکار لیا تھا۔

”بیٹا.....! کب تک آرہے ہیں مہمان.....؟ کوئی فون آیا تمہیں.....؟“

اور اس کی جان جل کر خاک ہو گئی تھی، ان کے لہجے کی بے تابی و اشتیاق پہ۔

”جی نہیں.....!“

اصل بات وہ اگل نہیں سکا کہ اپنا سیل آف کر رکھا ہے۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ فریش

ہونے اور چینج کرنے کی بجائے، تھکے ماندے انداز میں بستر پہ ڈھے گیا۔ بھی دروازہ ناک ہوا اور کوئی اندر چلا

آیا۔ مگر اس کی پوزیشن میں فرق نہیں آیا تھا۔

”ولی بھائی.....!“

فضا کی آواز پہ وہ اپنی سرخ دہکتی آنکھیں ذرا کی ذرا کھول کر اسے تنکے لگا۔

”چائے لے لیجئے.....!“

وہ جھک کر کپ تپائی پہ رکھ رہی تھی۔

”تھینکس.....!“

ولید کی آواز بے حد بوجھل تھی۔

”چائے پی لیں تو ایمان کی بینڈج چینج کر دیجئے گا یاد ہے۔“

”مجھے تو پتا تھا، شاید تمہیں یاد نہیں رہا تھا۔“

فضا یوں ہی اس کے گلے لگی گنگنائی تو ایمان نے مسکرا کر اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

”وہ بہت انا پرست ہے، اور شاید کسی اور سے محبت کرتا ہے۔“

”وہ صرف تم سے محبت کرتے ہیں ایسی.....! انا پرست وہ واقعی ہیں، اپنی عزت نفس بہت عزیز ہے

انہیں۔“

”مجھ سے بھی زیادہ.....؟“

ایمان نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تو فضا ہلکی پھلکی ہو کر بولی تھی۔

”یہ سوال تم مجھ سے نہیں، انہیں سے کرنا۔“

فضا نے اسے چھیڑا اور وہ بے طرح سرخ ہو گئی۔ فضا نے بہت دلچسپی سے اس کا یہ حسین روپ دیکھا

تھا۔

”ویسے اب بات کر لو گی ان سے.....؟“

ایمان نے تکیے سے سر نکا کر آنکھیں موندھ لیں اور کچھ توقف سے بولی تھی۔

”جب وہ آئیں، تب میرے پاس بھیج دینا۔ خود خدمت میں حاضر ہوتی، مگر لا چاری ہے۔“

اس نے اپنے بیکر کی سمت اشارہ کیا تھا، جس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔

”اوکے میم.....!“

فضا ہنسی ہوئی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

”اب وہ میری ضرورت بن گیا ہے

کہاں ممکن رہا اس سے نہ بولوں

تیری خوشبو بچھڑ جانے سے پہلے

میں اپنے آپ میں تجھ کو سمو لوں“

”اور فضا پوچھتی ہے، میں اس سے بات کر لوں گی.....؟ میں تو اس سے آج بھی جھگڑوں گی۔

مگر آج کی لڑائی کا انداز اور ہوگا۔ میں اس سے پوچھوں گی۔ اس نے مجھے کسی اور کو سوچنے کی گستاخانہ جرات

لیسے کی.....؟ کہ وہ انا کا قیدی تو ہو، مجھے اپنی محبت کی بقاء عزیز ہے۔“

وہ اپنی سوچوں پہ خود کو داد دیتی رہی، مسکراتی رہی۔

☆☆☆

”کن کن لکیروں کی نظر سے تیرا رستہ دیکھوں

نقش معدوم ہوتے جاتے ہیں ان ہاتھوں کے

تو سمجھا ہے بدن تک ہے تیری چارہ گری

تیرے امکان میں کہاں زخم کڑی باتوں کے“

ولید حسن کے اعصاب کو گویا ہزار دو لچ کا کرنٹ لگ گیا تھا۔ اس نے چونک کر، ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں غیر یقینی استعجاب تھا، خیر تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے کچھ دیر یوں ہی تکتا رہا تھا۔ کئی لمحے یوں ہی چپ چاپ ان کے بچ آئے، ٹھہرے اور گزر گئے۔ ایمان اسے تکتی رہی، ان آنکھوں میں کیا کچھ نہ تھا.....؟

شکوہ، رنج، غفلت، محبت، ناراضگی۔

”یہ کیسا مذاق ہے.....؟“

معاذہ خود کو سنبھال کر کسی قدر ناگواری سے بولا۔

”ماسٹر اٹ.....! یہ مذاق نہیں ہے۔ مذاق تو وہ ہے جو آپ نے کیا ہے میرے ساتھ۔ ولید.....!“

کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا.....؟“

اب کے وہ بھڑک اٹھی تھی۔

”آپ نے کبھی مانا تھا اس رشتے کو.....؟ کبھی اعتراف کیا تھا.....؟“

وہ بھی جیسے شاکی ہوگی۔

”اگر اعتراف نہیں کیا، کبھی تسلیم نہیں کیا تو آپ نے اپنا حق کیوں استعمال نہ کیا.....؟ محبت کرتے

تھے ناں مجھ سے.....؟“

وہ کچھ اور بھی تلخ ہوئی، بلکہ آنکھوں میں آنسو چل اٹھے۔

”آپ کو مجھ سے زیادہ اپنی انا کی فکر تھی۔ میں بھلے آپ کے پاس رہتی نہ رہتی.....“

آنسو اب پلکوں کی ریشمی باڑیوں پھیلا گئے گالوں پہ اتر آئے تھے۔ ولید تو بھونچکا تھا، ششدر تھا۔

”ایمان.....! آئی کانٹ بلیواٹ.....! یہ تم ہو.....؟“

”مجھے یہ بات کبھی نہیں بھولے گی ولید.....! کہ میری حیثیت آپ کے نزدیک.....“

”بے وقوف مت بنو.....! کتنی عزیز ہو مجھے، کبھی نہیں بتا سکتا۔ دیکھو.....! کیا حال ہو گیا ہے چند

دنوں میں میرا.....؟ کانٹوں پر گزرا ہے ہر اک لمحہ۔“

وہ بے چین، مضطرب ہو کر اسے اپنی دھشتوں کے بارے میں بتانے لگا۔ معا پھر ایک دم رُک گیا اور

اس کے زخموں پہ بستے آنسوؤں کو اپنی پوروں پر سمیٹتے ہوئے کسی قدر شونی سے بولا تھا۔

”اگر مجھ سے محبت کرتی تھیں تو پھر وہ سب کیا تھا.....؟ بے رُخی.....؟ بے نیازی.....؟ جھگڑا.....؟

”اس بار کی کیا گارنٹی ہے کہ اب وہ مجھ سے جھگڑیں گی نہیں.....؟“

اس نئے آرڈر پر ولید کے اندر جیسے صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔

”یہ آپ سے اس کی آخری لڑائی ہوگی، آئی تھنک.....! سو پلیز.....! اسے معاف کر دیجئے گا۔“

فضہ نے آہستگی سے کہا اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔ وہ چاہتی تھی ولید ہر بات ایمان کے منہ سے بے تاکہ ان کی زندگی کے یہ لمحے یادگار ٹھہریں۔ مگر تازہ ترین صورت حال سے بے خبر ولید حسن فضہ کی بات پہ جیسے پل صراط سے گزر گیا۔ اس نے ہونٹ اتنی سختی سے دانتوں سے کانٹے کہ منہ میں لہو کا ذائقہ گھلنے لگا۔

اس کی چائے جس کی کچھ دیر قبل اسے شدید طلب تھی، پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی۔ تب اس نے خود کو کمپوز کیا تھا اور اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔ برآمدے اور صحن کو عبور کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا آیا۔ البتہ اس کے کمرے کے سامنے رکھ کر اسے ایک بار پھر اپنے حوصلے جوڑنے پڑے تھے۔ دروازہ ناک ہونے پر ایمان جو دل و جان سے اس کی منتظر تھی، بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی۔

”فضہ نے بھیجا تھا مجھے کہ آپ کی بینڈ پیج چینیج کر دوں۔“

اس سے نظریں چار کئے بنا وہ کسی قدر خشک انداز میں بولا۔ ایمان نے بہت دھیان سے اس اسے

دیکھا تھا۔

”جی.....! میں نے کہا تھا اسے۔ آپ کھڑے کیوں ہیں.....؟ پلیز.....! تشریف رکھئے ناں.....!“

اس درجہ عزت افزائی پہ ولید چونک کر متوجہ ہوا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں چار ہونے پر دلکشی سے مسکرائی۔ ولید نے ہونٹ بھیجنے ہوئے نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا اور کرسی گھسیٹ کر ذرا تکلف سے بیٹھا۔ ایمان اس کی ایک ایک جنبش کو بغور تکتی رہی۔

”میرا پلاسٹر کب تک کھل جائے گا.....؟“

”پتا نہیں.....! اپنے معالج سے پوچھئے.....!“

وہ ناگواری سے بولا اور ایمان نے مسکراہٹ چھپائی۔

”میرے معالج تو آپ بھی ہیں۔“

”مگر یہ پلاسٹر میں نے نہیں چڑھایا تھا۔“

وہ بد مزگی سے بولا تو ایمان نے منہ پھلایا تھا۔

”آپ کا موڈ کیوں اتنا بگڑا ہوا ہے.....؟“

”آپ کا موڈ جو خوش گوار ہے۔“

وہ کالج کی طرح سے تڑخا۔

”حالانکہ خفا ہونے کا حق تو میرا تھا۔ آپ نے کس حساب میں ہارون کا دوانی کو پر پوزل لے کر آنے

کی اجازت دی تھی.....؟ کیا آپ جانتے نہیں کہ میں آل ریڈی انگیجڈ ہوں.....؟“

☆☆☆

اور ایمان بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔

”حسن کو سمجھنے کو عمر چاہئے جاناں.....!
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں“

”اوہو.....!“

وہ بے ساختہ ہنسنے لگا، کھلی کھلی روشن خوب صورت ہنسی۔

”پھر اب کیسے کل گئیں ہیں محترمہ.....؟“

اس کا لہجہ شوخ تھا، معنی خیز تھا، انگ انگ سے جیسے سرور چھلک رہا تھا۔

”کتر کے جال بھی صیاد کی رضا کے بغیر

تمام عمر نہ اڑتی اسیر ایسی تھی

بس اک نگاہ مجھے دیکھتا چلا جاتا

اس آدی کی محبت فقیر ایسی تھی“

اس نے پھر شاعری کی زبان میں اپنے احساسات بیان کئے اور یوں ہی مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی تو تھا.....؟“

”کیسا مسئلہ.....؟“

ولید چونکا۔

”تیرے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے مگر

جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے“

”یار.....! اتنا خوب صورت اظہار، مگر اتنے فاصلے سے بیٹھ کر اچھا نہیں لگ رہا کچھ، یہاں آؤ

ناں.....! نہیں ٹھہرو.....! میں آتا ہوں۔“

وہ ایک دم ہی شوخ ہو گیا تھا۔ ایمان بری طرح سے بوکھلا گئی۔

”تمیز سے، خبردار جو تہذیب سے ماورا حرکت کی۔“

اسے ایک دم ہی اپنی پوزیشن کا خیال آیا تھا۔ اس کی شوخ نگاہوں کی جنوں خیزی سے گھبرا کر وہ بے

ساختہ چپ ہوئی۔ جسم و جاں میں پڑھت سی سنسنی پھیلتی چلی گئی تھی۔

”بہت غلط موقع پر یہ سارے انکشاف ہوئے ہیں۔ کاش اس پل تم پر مکمل اختیار حاصل ہوتا مجھے۔“

دھیما دھیما سرگوشی کرتا ہوا لہجہ، نظروں کی شوخ تپش، اسے اپنے زُخار دیکھتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”اٹھیں.....! چلتے پھرتے نظر آئیں۔ اٹھیں شاباش.....!“

وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے گھبرا کر بولی، وہ ہنسنے لگا۔

”بینڈ تچ نہیں کراؤ گی کیا.....؟“

”جی نہیں.....! دوسرے لفظوں میں مجھے آپ پہ اعتبار نہیں ہے۔“

اس کے لہجے میں شرارت کا عکس تھا، وہ چیخ پڑا۔

ایمان نے ہنستے ہوئے اسے باہر نکال کر دم لیا تھا اور خود بے حد ریلیکس ہو کر آنکھیں موندھ لیں۔

☆☆☆

”اس نے چوما میری آنکھوں کو سحر دم اور پھر

رکھ گیا میرے سرہانے میرے خوابوں کے گلاب

کون چھو کے انہیں گزرا کہ کھلے جاتے ہیں

اتنے سرشار تو نہ تھے ہونٹوں کے گلاب“

فضہ دوبارہ کمرے میں آئی تو وہ بند آنکھوں کے ساتھ گویا کسی تصور میں گم مسکرا رہی تھی۔ وہ دانستہ

شرارتا کھٹکھاری۔

”ہائے میم.....! کیسی گزری دل و جان پر.....؟“

ایملن نے آنکھیں کھولیں اور مسکرا دی۔

”وہ خوب صورت تو ہے ہی مگر جب محبت سے دیکھتا ہے تو اور بھی دل کو بھاتا ہے۔“

اس کی حسین آنکھوں میں فتح کر لینے کا خمار تھا۔ فضہ خوش گواریت میں گھرتی مسکرا دی۔

”انہیں پتا ہے کہ محترمہ شاعرہ ہو گئی ہیں عشق میں.....؟“

”سارا اظہار ہی شاعری کی زبان میں کیا ہے۔“

وہ سوچ کر ہنس دی۔

”آپ کے مہمان آگئے ہیں، نیچے تشریف لے کر آئیں گی یا انہیں اوپر لایا جائے.....؟“

”کیا ہے فضہ ڈارلنگ.....! میرا موڈ خراب مت کرو، وہ بھی آج کے دن۔“

اس نے منہ بسور لیا تو فضہ نے جھک کر اس کا گال چوم لیا تھا۔

”میں تو تمہاری دائی خوشیوں کے لئے دعا گو ہوں اپنے رب سے۔ مگر سوینی.....! بھلے انہیں انکار کر

دیا جائے گا۔ مگر.....“

”مگر کچھ نہیں.....! تم انہیں ٹال دو کسی بھی طریقے سے۔ میں ملنا نہیں چاہتی۔“

وہ بے زار ہونے لی۔ فضہ سوچ میں پڑ گئی۔

”یار.....! ویسے ایک بات ہے، اگر ولید حسن سے ہٹ کر سوچا جائے تو بندہ یہ بھی گڈ لکنگ ہے۔“

”ولید حسن سے ہٹ کر سوچا ہی کیوں جائے بھلا.....؟“

اس نے نخوت سے کہا اور فضہ کھلکھلا اٹھی۔

”گڈ.....! یہی تو سننے کی خواہش تھی مجھے، ویری نائس.....!“

وہ اس کا گال چھوتی وٹش کرنے کے بعد چلی گئی۔ جس پل وہ نیچے آئی، مہمان چائے پی چکے تھے۔

”ایمان نہیں آئی ابھی تک.....؟ ہم اس سے تو ملنے آئے ہیں۔“

ہارون کا دوانی کی والدہ جو بے حد سو برسی خاتون تھیں، ماما سے مخاطب ہوئی تھیں۔ اس سے قبل کہ ماما

اپنے ہارون بیٹے کے لئے ایمان بیٹی کا ہاتھ مانگنا ہے۔ ہمارا بچہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ آپ جس قسم کی چاہیں تسلی کرا لیں۔ ہم انتظار کر لیں گے، مگر بات اصل یہ ہے کہ ہمیں بس ہاں سننی ہے۔“

خاتون نے بہت رواداری اور سہاؤ سے بات کی تھی، مگر بیٹھک میں موجود تمام نفوس ایک دم ٹھنک گئے، سوائے ولید حسن کے کہ وہ پہلے سے ہی آگاہ تھا۔ تاؤ جی سب سے پہلے حواسوں میں لوٹے اور لاڈلے سپوت پہ ایک قہر بھری نگاہ ڈالی تھی اور گلا کھنکار کر کچھ کہتے کہتے ہونٹ بھیجنے لگے کہ بیٹے کا شدید انکار دھیان میں آ گیا تھا۔

”آپ سوچ کر ہمیں جواب دے دیجئے گا۔ میں نے کہا ناں کہ ہم انتظار کر لیں گے۔“

خاتون نے اس معنی خیز خاموشی سے اپنی مرضی کا مطلب اخذ کر کے گویا ان کی مشکل آسان کرنا چاہی۔ ولید اپنی جگہ بری طرح سے جڑ بڑھا۔ غلطی یہ ہوئی تھی کہ مختصر افسی، وہ باپ کو اپنے نئے فیصلے سے آگاہ نہیں کر پایا تھا اور اب جان پہ بنی ہوئی تھی۔

پاپا نے اس عجیب جھوٹ میں گرفتار ہو کر پریشانی سے بڑے بھائی کو دیکھا، مگر وہ سر جھکائے ہوئے تھے۔ عجیب بحرمانہ سا انداز تھا۔ ان کی نگاہ ولید حسن کی سمت اٹھی جو انہی کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہ میں اضطراب تھا، التجا تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرائے اور نگاہوں ہی نگاہوں میں گویا جھنجھکے کو تسلی دی تھی۔

”اس عزت افزائی کے لئے تھینکس محترمہ.....! مگر مجھے افسوس ہے کہ ہم آپ کو مایوس لوٹا رہے ہیں۔ ایکچو کلی میری بیٹی تو بہت سال قبل سے ہی میرے بھیجے سے منسوب ہے۔ ولید حسن، آپ ملے ہیں اس سے۔“

انہوں نے انگلی سے اس کی سمت اشارہ کر کے کہا۔ اس کی سمت سب نے دیکھا تھا۔ وہاں تو یک لخت گویا سوگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ پھر وہ لوگ زیادہ دیر زکے نہیں تھے۔

”مجھے ایک بار پھر افسوس ہے۔ پلیز.....! آپ مائنڈ مت کیجئے گا۔“

پاپا نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا تھا اور ہارون کا دوانی ان کا ہاتھ تھپک کر بہت ضبط سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆

ایک بار پھر وہ رات کو اسی جگہ پہ اکٹھے ہوئے تھے۔ بیچ میں الاؤ بھی روشن تھا، مگر آج ان کے بیٹھنے کی ترتیب بہت خوب تھی۔ عاقب کے ساتھ فضلہ کی چیئر تھی، جبکہ ولید کے پہلو میں وہ فروکش تھی۔ البتہ اشعر اکیلا تھا اور خوب بسورا بھی تھا۔

”میں چاچو سے سخت خفا ہوں۔ آخر ایک اور بیٹی کا اضافہ کر لیتے تو میرا بھی بھلا ہوا ہوتا۔ میری باری پہ آ کر ہی انہیں خاندانی منصوبہ بندی کا خیال آنا تھا.....؟ آئے ہائے.....! نہ کوئی اور چاچو، اور نہ اس چاچو کی اور بیٹی.....؟ ارے ظالم.....! میں کیا کوارہ ہی رہوں گا.....؟“

”اچھا.....! بس بھی کرو یار.....! کیا رونا پینا ڈالا ہوا ہے.....؟ ہماری شادیاں ہو لینے دو، تمہارا بھی انتظام کرتے ہیں۔“

”ایکچو کلی آنٹی.....! ایی کا پاؤں.....“

”ہاں بیٹا.....! میں جانتی ہوں۔ ابھی پلاسٹر ہے اس کے پیر پہ، آپ ہمیں لے چلو ناں بچی کے پاس.....!“

ان کے کہنے پہ فضلہ کو سمجھ نہیں آ سکی، بزرگ خاتون کو کیسے صاف انکار کرے.....؟ اس نے کچھ بے چین سی ہو کر دیکھا تو ولید اس کی سمت متوجہ تھا۔ آنکھ کے اشارے سے گویا انہیں ایمان کے پاس لے جانے کا عندیہ دیا۔

”جی بہتر.....! آئیے پلیز.....!“

فضلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساتھ میں آنٹی سے بھی پہلے ان کا چھوٹا بیٹا اٹھا تھا، جسے وہ موسیٰ کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔

”میں تو ضرور چلوں گا ایمان صاحبہ سے ملنے کے لئے۔“

وہ بیس بائیس سال کا نوخیز مگر خوب رو سلاڑ کا تھا۔ پاپا اس کی بات پر مسکرا دیئے۔ یہ گویا اجازت دی گئی تھی۔ فضلہ نے کاندھے اچکا دیئے اور دونوں کے ہمراہ جب وہ ایمان کے کمرے میں آئی تو وہ دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی ہوئی تھی۔

”ایی.....! آنٹی تمہیں ملنے آئی ہیں۔“

فضلہ نے دانستہ اسے پکارا۔ وہ ایک دم سیدھی ہوئی تھی اور کسی قدر خفگی سے اسے دیکھا۔

”ماشاء اللہ.....! چشم بد دور.....! بہت پیاری بچی ہے۔ خدا نصیب اچھا کرے، ہمیشہ خوش رکھے۔“

آنٹی صاحبہ تو گویا ایمان کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئیں۔ البتہ وہ چمک دار آنکھوں والا لبا لڑکا بس مسکراتی نظروں سے اسے تکتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی واضح ستائش تھی۔

”پڑھتی ہو بیٹا.....؟“

آنٹی اس کے پلنگ پہ ہی بیٹھ گئیں تھیں۔ فضلہ نے کرسی اٹھا کر بیڈ کے نزدیک رکھ دی تھی۔

”بیٹھے موسیٰ.....! آپ بھی۔“

وہ بھی اطمینان سے بیٹھ گیا۔

”جی.....! بی ایس سی کر رہی ہوں۔“

کچھ دیر مزید ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”او کے بیٹا.....! خدا نے چاہا تو دوبارہ ملاقات ہوگی، اب اجازت.....؟“

ایمان محض مسکرا دی اور ان کے جانے کے بعد طویل سانس بھر کے پھر سے نیم دراز ہو گئی۔ خاتون واپس بیٹھک میں آئیں تو لبوں پہ ایک مستقل مسکان تھی۔ موسیٰ نے سب کی نگاہ بچا کر کٹری کا نشان بنا کر ہارون کو دکھایا۔ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

”بھائی صاحب.....! ہم ایک خاص مقصد کے تحت آئے تھے۔ بچی کی عیادت کے ساتھ ساتھ ہمیں

ولید نے مسکرا کر کھڑا لگا دیا تھا۔

”تو میں کیا تب تک ایسے ہی بے رنگ زندگی گزارتا رہوں جس میں کسی باد صبا کا جھونکا نہ ہو.....؟“
 ”ہم بھی اب تک کوئی رنگوں سے نہیں کھیلے رہے ہیں.....؟ سو پلیز.....! بکواس بند کرو۔“
 ولید نے جھڑکا تو وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔
 ”باہ ہائے.....!“

مطلب نکل گیا ہے تو پہچانتے نہیں
 یوں جا رہے ہیں جسے ہمیں جانتے نہیں
 وہ لہک لہک کر ڈھائی دینے لگا۔ ایمان کا ہنستے ہنستے برا حال ہونے لگا۔
 ”کبھی تو روئے گا وہ بھی کسی کی بانہوں میں
 کبھی تو اس کی ہنسی کو زوال ہونا ہے
 ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
 بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے“
 وہ دانت پیس پیس کر گویا بدوعائیں دینے لگا۔

”ایمی.....! وہ ایک مثل مشہور ہے ناں.....! کوؤں کی بدوعاؤں سے بیل نہیں مرا کرتے۔“
 ولید کو سب سے زیادہ مزہ آ رہا تھا اسے جلا کر۔ اشعر نے آہ بھری پھر فضا کی طرف رخ کر کے رو ہانسا
 ہو کر بولا۔

”بعد مرنے کے میرے تم جو کہانی لکھنا
 کیسے برباد ہوئی میری جوانی لکھنا
 یہ بھی لکھنا میرے ہونٹ ہنسی کو ترسے
 کیسے دن رات بہا آنکھوں سے پانی لکھنا“
 ”یہ نہ بھی لکھے میں لکھ دوں گا، تم مرو تو سہی.....!“
 ولید نے پھر اسے زچ کیا۔ ان سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔
 ”حد ہے یعنی بے حسی کی۔“

وہ چلبلائے لگا، پھر جیسے موڈ بدل کر بولا تھا۔

”میں ایک شعر پڑھوں گا، آپ چاروں میں سے کسی ایک نے جواب دینا ہے۔ ویسے عاقب
 بھائی.....! پچھلی بار کا ایوارڈ ولی بھائی نے جیتا تھا، اس بار آپ بازی لے جانے کی کوشش کیجئے۔ جی.....! تو شعر
 ہے..... آہم آہم.....!“

بکنے والے اور بھی ہیں جا کر خرید لو محسن!

ہم لوگ قیمت سے نہیں، قسمت سے ملا کرتے ہیں“

ولید نے عاقب کی سمت دیکھا، وہ خجالت سے مسکرا دیا۔

”یار.....! تم ہی دے دو، مجھے نہیں آتے شعر دیر۔“

ولید نے کاندھے اچکا دیئے، پھر آہستگی مگر گنہگار لہجے میں بڑے جذب سے گویا ہوا تھا۔
 ”اگر چاہوں تو اک نگاہ میں اس کو خرید لوں فراز
 جس کو ناز ہے بہت کہ بکتا نہیں ہوں میں“

”ویل ڈن.....!“

فضہ اور ایمان نے بے ساختہ اسے داد دی۔ اشعر کا البتہ منہ اتر گیا تھا۔

”اب میں کچھ سناتی ہوں۔“

”کھری کھری سنائیں، وہ بھی ولی بھائی کو۔“

ایمان کے کہتے ہی اشعر نے لقمہ دیا۔ وہ ہنسنے لگی۔ پھر بڑے انداز سے بولی۔

”دل اس راہ پہ چلتا ہی نہیں

جو مجھے تم سے جدا کرتی ہے“

”گڈ.....!“

ولید نے اس کے کان میں مدھر سرگوشی کی جس کے نتیجے میں اس کے گلابی ہونٹوں پہ مسکراہٹ کی
 کلیاں کھل اٹھیں۔

”زندگی میری تھی مگر اب تو

تیرے کہنے میں رہا کرتی ہے“

”امیرنگ.....! یہ دن بھی ہم نے دیکھنے تھے.....؟ خدایا.....! یہ خواب تو نہیں.....؟“

اس کی شرارت عروج پہ پہنچنے لگی۔ ایمان کی آنکھوں کی روشنیاں جگمگانے لگیں۔

”اس نے دیکھا ہی نہیں ورنہ یہ آنکھ

دل کا احوال کہا کرتی ہے“

”اب تو خیر یہ شکوہ بے جا ہے۔ ہم دل و جان سے فدا ہیں محترمہ.....!“

وہ پھر سے بھاری آواز میں گویا ہوا۔ ایمان نے گویا اس مداخلت پہ گھورا تھا۔ وہ سمجھنے کی اداکاری

کرنے لگا۔

”دیکھ تو آن کے چہرہ میرا

اک نظر بھی تیری کہا کرتی ہے“

”ابھی تو کچھ بھی نہیں جناب.....! شادی کے بعد ہم دکھائیں گے آپ کو، آپ کے چہرے کی قوس و قزح۔“

اس کی بوجھل سرگوشی میں سراسر شرارت کا عکس تھا۔ ایمان کا چہرہ حیا آمیز خفگی سے رنگین ہونے لگا۔

اس نے جھینپ کر اس کے کاندھے پہ ہاتھ دے مارا تھا۔

”شام پڑتے ہی کسی شخص کی یاد

کوچہ جاناں میں صدا کرتی ہے“

”یار.....! شام نہیں، دوپہر کہو.....! شام کو تو میں گھر آجاتا ہوں ناں.....!“
وہ بسور، مگر ایمان نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

”مجھ سے بھی اس کا ویسا ہی ہے سلوک

حال جو تیرا انا کرتی ہے“

”چھوڑو ڈارلنگ.....! پرانے قصے ہیں۔“

وہ آنکھیں بند کر کے گنگنایا۔ سبھی اس کی حاضر جوابی اور برہنہ جھگی پہ مسکرا رہے تھے۔

”ڈکھ ہوا کرتا ہے کچھ اور بیان

بات کچھ اور ہوا کرتی ہے“

”کریکٹ.....! یہ بالکل درست کہا آپ نے.....! واقعی ہم نے ہمیشہ اپنا ڈکھ لپیٹ سمیٹ کر رکھا۔“

وہ داد دینے والے انداز میں جھوم کر بولا تو ایمان نے کسی قدر خفگی سے اسے گھورا تھا۔

”ہم کامیغہ استعمال مت کریں آپ.....! میں نے ایسی حماقت نہیں کی۔“

”افوہ.....! یار.....! یہ لڑکی ساری زندگی مجھے اسی بات پہ رگیدے گی.....؟“

اس نے منہ لٹکا کر گویا عاقب سے شکایت کی۔

”ہاں.....! تو رگیدنا بھی چاہئے۔ حماقت ہی کر رہے تھے تم.....!“

عاقب نے بھی ایمان کی سائڈ لی تو ایمان اسے انگوٹھا دکھاتے ہوئے ہنسنے لگی۔ وہ جھل سا ہو کر سر پر

ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

”حاضرین.....! ہم یہ پھر آمد ہو رہی ہے، بہتر ہے فافٹ بہرہ ور ہو جائیں۔“

اشعر نے ایک دم شور مچا دیا۔ سب نے تالیاں بجا کر آمد کو خوش آمدید کہا تو وہ باپھیں چیر کر ”آداب

آداب“ کرنے لگا۔

”تھی گر آنے میں مصلحت حائل

یار انا کوئی ضروری تھا

دیکھئے ہوگئی غلط فہمی

مسکراتا کوئی ضروری تھا

لیجئے بات ہی نہ یاد رہی

گنگناتا کوئی ضروری تھا

گنگنا کر میری جواں غزلیں

جھوم جانا کوئی ضروری تھا

مجھ کو پا کر کسی خیال میں گم

چھپ کے انا کوئی ضروری تھا

اُف! وہ زلفیں وہ ناگنی وہ ہنسی

یوں ڈرانا کوئی ضروری تھا

اور ایسے اہم مذاق کے بعد

روٹھ جانا کوئی ضروری تھا

کیسی لگی.....؟“

وہ دانت نکوس کر پوچھ رہا تھا۔

”زبردست.....! سب سے زیادہ داد ایمان نے دی سی، پھر ای ہی بخیدگی سے بولی تھی۔

”ویسے اشعر.....! بالفرض تمہاری بھی کوئی گرل فرینڈ ہو تو کیا تم اسے بھی ایسی ہی چغند..... میرا

مطلب ہے، مزاحیہ شاعری میں تعریفیں کرو گے.....؟“

”جی کیوں نہیں..... میں اسے ایسی چغند..... میرا مطلب ہے، مزاحیہ شاعری سنانا کراتنا ہنساؤں گا کہ

اس کے پیٹ میں مسلسل ہنسنے سے درد ہو جائے گا۔“

”بہت اچھے خیالات ہیں آپ کے، جیسی میرا خیال ہے کہ کسی لڑکی نے آپ کو دوستی کا شرف نہیں بخشا

کہ پیٹ کا درد کوئی انورڈ نہیں کر سکتا۔“

فصہ نے ہنسنے ہوئے کہا تھا۔ اشعر نے کاندھے اچکا دیئے۔ پھر بے رخی سے بولا تھا۔

”کر لو آپ لوگ جتنی باتیں مجھے کرنی ہیں۔ آج میں اکیلا ہوں ناں.....! اس لئے۔ میری والی کو بھی

آلینے دیں، پھر میں اس کے ساتھ مل کر آپ لوگوں پہ پھبتیاں کسا کروں گا۔“

”اور انشاء اللہ وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔“

”ہائیں.....؟ آپ مجھے بدو عا دے رہے ہیں.....؟ میں اماں کو بتاؤں گا۔“

اشعر نے منہ بنا کر کہا۔ ولید نے بے نیازی سے کاندھے جھٹک دیئے تھے اور مسکرا کر بولا تھا۔

”ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے

جس سے ملنے سے اے خفا کیجئے

ہے تقاخر میری طبیعت کا

ہر اک کو چراغ پاء کیجئے“

وہ ہنسا، پھر بولا۔

”خیر.....! یہ مذاق تھا۔ اب ذرا حال دل بھی عرض ہے۔ پلیز.....! آداب کہئے۔“

وہ شوخ ہوا۔ وہ سب جھٹک کر فرشی سلام کرنے لگے۔

”یہ تھوڑا سا جیون

اُدھورا سا موسم

یہ رنگوں کی چاہت

گلابوں کی حسرت

یہ روشن سورج

یہ مدہم اندھیرے
کسی روز تنہا ملو تو بتائیں
خیالوں کی راہیں
چمکتی نگاہیں
وفائیں نبھانا
ادائیں دکھانا
یہ ایک سلسلہ ہے
مگر فیصلہ ہے
اگر جان جاؤ
تو احساس رکھنا
اسے راز رکھنا
کرو ایک وعدہ
بنالو گے اپنا
ملاقات کو تم
نیا نام دو گے
کسی روز تنہا ملو تو بتائیں
ہماری محبت ہماری ادائیں
”ویری ویل ڈن.....!“

فضہ اور عاقب نے دل کھول کر داد دی جبکہ ایمان روشن مسکراتی نگاہوں سمیت اسے دیکھ رہی تھی۔
تب ہی تاؤ جی شاید واش روم میں آئے تھے، انہیں وہاں دیکھ کر خفا ہونے لگے۔
”چلو.....! جا کے سو دو اپنے اپنے کمروں میں۔ اتنی رات گئے درختوں تلے بیٹھے ہو بے وقوف.....!“
اور وہ سب اپنی اپنی مسکراہٹ دباتے رفو چکر ہو گئے۔ مگر آسمان کے سیاہ تھال پہ چمکتے ستارے محبت
کے ان سنہری لمحات کا کچھ عکس محفوظ کر چکے تھے۔

☆☆☆

تاؤ جی تک جیسے ہی ولید کی رضا مندی پہنچی، انہوں نے اگلے ہفتے کی ہی مگنی کی تاریخ طے کر دی
تھی۔ مگر ولید مگنی کی بجائے نکاح کا خواہاں تھا۔
”ہے ہے.....! باؤلا ہوا ہے لڑکا.....! کہاں سرے سے نہیں مان رہا تھا.....؟ اب مگنی پہ بھی صبر
نہیں، نکاح پر زور ڈالا دیا ہے.....؟ پھر کہے گا زنجستی بھی کریں ساتھ.....!“
تاؤ جی نے اس کے لتے لئے تھے، مگر اس نے چالاکی یہ کھیلی کہ ددا کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ پھر انہوں نے
ہی انہیں منایا تھا۔ پایا کو تو خیر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”تو بھی بتا دے پتر.....! تجھے بھی نکاح کروانا ہے تو.....؟“
تاؤ جی نے عاقب حسن سے پوچھا تو وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔
”نہیں بابا.....! آپ مگنی ہی کر دیں۔ میں ہر دور کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں، مگنی کا الگ چارم
ہے۔“
اور تاؤ جی نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ایمان نے جانا تو ایک بوکھلا اٹھی۔
”کیا ضرورت تھی یہ شوشہ چھوڑنے کی.....؟“
”ضرورت تھی ناں.....! یہ میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔“
اس کی نگاہیں پھر بے لگام ہونے لگیں تو ایمان کو راہ فرار ڈھونڈنا پڑا تھا۔ تیاریوں میں بیچ کے دن گویا
پڑ لگا کر اڑ گئے۔ حرا آپا بھی کئی دن پہلے ہی اپنے بچوں کے ہمراہ آگئی تھیں۔ گھر میں ہر روز ہلہ گلہ ہوتا، رات کو
ڈھولک بجائی جاتی اور اشعر اپنے خود ساختہ گیتوں سے سب کو خوب ہنساتا، مگر اس رات آپا نے اچانک ولید سے
فرمائش کر دی تھی۔

”ولید.....! تو سنا کوئی اچھا سا گانا.....!“
وہ بھی جانے کس موڈ میں تھا کہ فوراً ہی تیار ہو گیا۔ اشعر بھاگ کر سب کو بلا لایا۔
”ولی بھائی.....! اپنی شادی کی خوشی میں گانا سنانے لگے ہیں۔“
وہ چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کرتے ہوئے کہتا رہا تھا۔
”میں یہ گیت ڈیڈیکٹ کروں گا اپنے چاچو کی بیٹی ایمان ارتضیٰ کو جو چند دنوں میں میری منکوحہ ہو
جائیں گی، یعنی ایمان ولید حسن.....!“
اس نے تاؤ جی اور تائی کے سامنے جب یہ بات کہی تو ایمان ایک دم بری طرح سے شرما گئی۔ جبکہ
ولید ڈھٹائی اور اعتماد کے ساتھ بڑی دلچسپی اور شوق کے عالم میں اس کا حیا آلود گلاب چہرہ تکتے ہوئے خوب
صورت آواز میں گنگلتا نے لگا۔

”ہمیں تم سے ہوا ہے پیار

ہم کیا کریں

آپ ہی بتائیں

ہم کیا کریں

آپ سے بھی حسین ہیں

آپ کی یہ ادائیں

ہم کسی ادا پہ

کیوں نہ مریں

ہمیں تم سے ہوا ہے پیار

ہم کیا کریں

آپ ہی بتائیں

ہم کیا کریں

وہ اس کے گھورنے کی پرواہ کئے بغیر مسکراتے ہوئے اس گانے کو وہیں چھوڑ کر دوسرا گانا گنگنانے لگا۔

”تیرے چہرے سے نظر ہٹتی نہیں

ہم کیا کریں

ہم تو دیوانے ہوئے ہیں صنم

ہم کیا کریں

تیرے چہرے سے نظر ہٹتی نہیں

ہم کیا کریں

تب ہی فضا چائے لے آئی۔ وہ سب جو مدھر سُرور میں تالیاں بجا رہے تھے، مسکراتے ہوئے چائے کی سمت متوجہ ہو گئے۔ جبکہ اس کی افسانے کہتی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”تیری آنکھوں کو دیکھ کر دلبر

کتنے نغمے لکھے ہیں چاہت کے

اپنے نازک لبوں سے کہہ دو ناں

ہم ہی الفاظ دو محبت کے

دل کی یہ پیاس کبھی بجھتی نہیں

ہم کیا کریں

تیرے چہرے سے نظر ہٹتی نہیں

ہم کیا کریں

وہ خاموش ہوا تو سب نے تالیاں بجا کر اسے داد دی تھی۔ لیکن جب تاؤ جی نے اسے پانچ سوکانوٹ نکال کر دیا تو اشعر اٹھ کر بھنگڑا ڈالنے لگا تھا۔

”شادوا شادوا

شادی تاں سجدی

جے نچے منڈی دی ماں

وہ تائی ماں کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی کھینچنے لگا۔ تائی ماں نے ہنستے ہوئے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

☆☆☆

ولید کی خواہش تھی، ایمان کا براہیڈل ڈریس وہ خود پسند کر کے لائے۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا.....؟ مگر جب یہ اجازت مل گئی تو اس نے ایک اور خواہش ظاہر کر دی، ایمان کو ساتھ لے جانے کی۔ جس کی کچھ تامل سے سہی، مگر بہر حال اجازت مل گئی تھی۔

”اٹھو فافٹ.....! تیار ہو جاؤ.....!“

وہ اپنی فتح پہ سرشار مسکراتا ہوا اس کے پاس آکر چٹکی بجا کر بولا۔ ایمان مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے اپنی وارڈروب کھولی تو کوئی بھی لباس اس قابل نہ لگا کہ آج کے دن پہن کر جاسکے۔ بہت دیر تک اسی الجھن میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے بلیو جینز کے ساتھ آف وائٹ چکن کا ٹاپ اور جینز کا اپر سلیکٹ کیا تھا۔ چیخ کرنے کے بعد اس نے لائے بالوں کو سلجھا کر کچر میں جکڑ دیا۔ آئینے میں خود کو دیکھا اور مطمئن ہو کر باہر آگئی۔ یقیناً ولید اسی تاخیر کی وجہ سے اوپر آیا تھا، اس سے ٹکراؤ برآمدے میں ہی ہو گیا۔

”سوری.....! آپ کو ویٹ کرنا پڑا۔ اچھو کلی مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی، کون سے کپڑے پہنوں.....؟“

”یہ کپڑے پہن کر جاؤ گی.....؟“

ولید نے ایک نگاہ اس کے سانچے میں ڈھلے دلکش وسڈول سراپے پہ ڈال کر سنجیدگی سے سوال کیا تو ایمان قدرے کنفیوز ہو گئی تھی۔

”کیا اچھے نہیں لگ رہے.....؟“

”ایمان.....! یہاں بیٹھو.....!“

ولید نے اسے واپس کمرے میں لا کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

”ایک بات کہنے لگا ہوں، بہت دھیان سے سننا ہے، اوکے.....!“

وہ اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا ہوا اسی سنجیدگی سے بولا تو ایمان اس کی سنجیدگی سے خائف ہونے لگی۔

”اگر ہم اپنے ارد گرد غور کریں تو دیکھیں گے کہ دنیا میں موجود ہر انمول اور قیمتی چیز کو اللہ نے سب کی نظروں سے دور، بہت چھپا کر ڈھیروں پرتوں کے نیچے بہت پیار سے رکھا ہوا ہے۔ چاہے وہ پہاڑوں کی چٹانوں کے تلے چھپے جواہرات ہوں یا پھر سمندر کی تہ میں موجود سیپ کے اندر چنپتے نادر و نایاب موتی۔ ہر پیش قسمت چیز ہمیں بہت حفاظت سے دنیا کی آلائشوں سے پاک محفوظ رکھی نظر آئے گی۔

بالکل ایسا ہی ایک قیمتی اور گراں قدر خزانہ عورت کی ذات بھی ہے جس کا وجود اتنا ارزان ہرگز نہیں کہ ہر نظر بآسانی اس تک رسائی حاصل کر سکے۔ لہذا خود کو نایاب اور انمول بناؤ۔ تاکہ ہر اُنھنے والی نگاہ از خود تمہارے احترام میں عزت سے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔“

کس قدر گہری بات اس نے اس قدر شائستگی، نرمی اور خوب صورتی سے کہی تھی کہ ایمان کو برا بھی نہیں لگا اور ایک اہم خامی کی سمت اشارہ بھی کر دیا گیا۔ وہ آہستگی سے مسکرا دی۔

”آپ چلے.....! میں دوبارہ چیخ کر کے آتی ہوں، اور اس مرتبہ آپ کو انتظار کی زحمت بھی نہیں اٹھانا

پڑے گی۔“

اس کے لہجے میں خفیف سی شوخی تھی۔ ولید جیسے ہلکا پھلکا سا ہو کر مسکراتا باہر نکل گیا۔ ایمان نے دوبارہ کپڑوں کی الماری کھولی اور بلوچی کڑھائی کا وہی گولڈن براؤن سوٹ نکال لیا۔ اسے اپنی نیچر سے سنی وہ بات یاد آگئی تھی جو انہوں نے یکپہر کے دوران کہی تھی۔

”دیکھ لو.....! آدم و حوا علیہم السلام کا لباس شیطان نے اُتروا دیا۔ جب وہ بے لباس ہوئے تو خدا نے انہیں زمین پر بھیج دیا۔ اب وہی شیطان پھر تمہارا لباس چھین رہا ہے۔ ابن آدم و بنت حوا کا لباس مختصر سے مختصر، لباس کم نظر آتا ہے، جسم زیادہ۔ یا اگر لباس پورا ہے بھی تو ایسی شیب میں کہ وجود کے خدخال کو نمایاں و اُجاگر کرتا ہے۔ ذرا سوچیں.....! آدم علیہ السلام تو جنت سے نیچے زمین پر آگئے تھے۔ تم زمین سے کدھر جاؤ گے.....؟ اس سے نیچے تو دوزخ ہے۔“

وہ دوبارہ چیخ کر کے نیچے آئی تو ولید حسن کی نگاہیں اسے تکتے لودینے لگی تھیں۔
”تھینکس فار دس آفر.....!“

”مائی پلزر.....!“

تائی ماں نے اسے گلے سے لگا کر بہت ساری دُعاؤں کے ساتھ فی امان اللہ کہا اور وہ خوب صورت احساسات کے ساتھ پہلی بار اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔

”ماشاء اللہ.....! اس فرمانبرداری کے مظاہرے سے تو مجھے لگ رہا ہے محترمہ ساری عمر مجھے سر آنکھوں پہ بٹھائیں گی۔“

پرشوق نظریں، آنچ دیتا ہوا لہجہ، وہ پھر سے اپنی ٹون میں واپس آ گیا تھا۔

”لیکن صرف اچھی اور جائز بات.....!“

اس نے اُنکی اُٹھا کر تصحیح کی اور ولید حسن مسکرانے لگا۔

”تمہیں پتا ہے، جب تم نے بابا سے میرے ساتھ کالج جانے سے انکار کیا تو مجھے کتنا غصہ آیا تھا.....؟“

اور میں نے کون سی بددعا تمہیں دی تھی.....؟“

گاڑی کی اسپید بڑھاتے ہوئے اس نے گفتگو کا رخ پھیرا۔ ایمان نے نفی میں سر ہلا کر دلچسپ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا دیا تھا۔

”وہ بددعا تمہیں لگی ہے، جیسی تم اس وقت میرے ساتھ بیٹھی ہو، یعنی عمر بھر میرے ہی ساتھ سفر کرنے کی۔“

ایمان نے جھینپ کر اسے ایک گھونسا دے مارا تھا۔ شاپنگ کے دوران ولید نے اپنی نہیں، اس کی پسند کو اولیت دی تھی۔ مگر جب لہنگے کے انتخاب کا مرحلہ آیا، تب ولید نے اس کی رائے بھی گوارہ نہیں کی تھی اور گولڈن کلر کا لہنگا پیک کرنے کا کہا تھا۔ ایمان نے منہ بنا لیا۔

”کوئی اور کدھر دیکھ لیں ناں.....! یہ فیشن میں اتنا ان نہیں ہے۔“

”ڈونٹ وری.....! ہم پینڈ و لوگ ہیں، فیشن کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہتے ہیں۔“

اس نے کاندھے جھٹک دیئے تو ایمان نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر جب نکاح کے بعد اسے فوٹو سیشن کے لئے ولید کے ساتھ لا کر بٹھایا گیا، تب وہ ہی نہیں، جتنے لوگوں نے بھی اسے دیکھا، کئی ٹاپے پلکیں جھپکانا ہی بھول گئے تھے۔ سر اٹھاتی حسین جوانی کا رو پہلا قیامت خیز حسن اس جج دجج اور آرائش کے ساتھ ہوش ربائی کے جلوؤں کی بجلیاں گراتا دیکھنے والی نگاہوں کو چکا چون کر رہا تھا۔

ولید تو اس کے جلوؤں کی تاب نہ لاتے ہوئے گویا گنگ رہ گیا تھا۔ اس کے محفل میں آنے سے قبل وہ ہر کسی پہ چھایا ہوا لگ رہا تھا، مگر جب ایمان کو لا کر بٹھایا گیا تو گویا قدرت کی کوئی حسین تخلیق مکمل ہو گئی تھی۔
”اگر میری محبت روشنی کی صورت ہوتی تو تم اتنی روشن ہو جاتیں کہ جہاں بھی اندھیرے میں قدم رکھتیں، اُجالا ہو جاتا۔“

ولید حسن نے اس کی سمت جھک کر بوجھل سرگوشی اس کی سماعتوں میں اُتاری، جس نے اس کے چہرے کو حیا بار کر دیا۔

”اگر میری محبت خوشبو کی صورت ہوتی تو تم اتنی معطر ہو جاتیں کہ جہاں بھی جاتیں، ساری فضا میں مہک اُٹھتیں۔“

دھیمے، مخمور سرگوشیاں انداز میں اپنے دل میں سنبھالے بے تاب اظہار کو اس کی سماعتوں کی نذر کیا۔ ایمان کچھ اور جھینپ گئی اور لرزتی پلکیوں کی جھالیں اُٹھا کر اسے دیکھا، مگر وہ چند لمحوں سے زیادہ دیکھ نہیں پائی۔ اس کی نگاہ کی وارنکیوں نے اسے پلکیں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اگر میری محبت خوشی کی صورت ہوتی تو دُنیا تمہیں دیکھتے ہی مسکرانے لگتی۔ مجھے دُنیا میں ایسا کوئی پیانا نظر نہیں آتا جو میری محبت کی گہرائیوں کی شدتوں کو ناپ سکے۔“

اس سہانے سے جب سب ہی مہمان پنڈال سے اُٹھ کر کھانے کے لئے چلے گئے تھے، تب ولید نے اپنا شرعی حق استعمال کرتے ہوئے پہلی بار اس کے ہاتھ پہ اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے بہت گہمیر لہجے میں ایک اور اقرار کیا تھا۔

”تمہیں پتا ہے، میں کبھی دوست نہیں بنا پایا۔ ایسا دوست جو مجھے محسوس کر سکے، میں بارش میں چل رہا ہوں، میرا چہرہ پانی سے تر ہو مگر وہ میرے آنسوؤں کو پہچان لے، میرے مسکراتے چہرے کی آڑ میں چھپے غم کو پہچان لے، میری خاموشی کے پیچھے بولتے لفظوں کو سن سکے، میرے غصے میں چھپی میری محبت کو دریافت کر سکے۔“

ایمان.....! تمہیں پتا ہے۔ ایسا میرا صرف ایک ہی دوست تھا، اور وہ ہے اللہ.....! میں نے اللہ سے تمہاری محبت تمہاری دوستی مانگی تھی۔ کروگی مجھ سے دوستی.....؟“

وہ اپنا ہاتھ پھیلائے عہد چاہ رہا تھا۔ ایمان نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ کر عہد نبھانے کا عزم کیا تھا۔

☆☆☆

جس روز نکاح ہوا، اسی شام فضہ اور عاقب کی منگنی کا بھی اہتمام تھا۔ ایمان نے ہر ہر لمحہ سے خوشی کشید کی تھی۔ شام کی تقریب کے لئے اس نے الگ سے تیاری کی تھی۔ شارٹ سلک کا پاؤڈر، پنک شلوار سوٹ جس پر پرلز اور اسٹون کا انتہائی نازک اور خیرہ کن کام جھلمل جھلمل کر رہا تھا، اس کی سفید اجلی رنگت پہ بے حد ججج رہا تھا۔ زرقون سے جی جیولری نے اس کی خوب صورتی کو اور بھی دلربا بنا دیا تھا۔

اشعر سے اس نے تازہ گہرے منگوائے تھے جو فضہ کے کمرے میں تھے کہ بیوٹیشن وہیں اسے تیار کر

”مطلب.....؟“

ولید نے سر کھجایا تھا اور پھر بھاری مگر شوخ لہجے میں اسے دیکھ کر گنگنا نے لگا۔

”ابھی گھر نہ جانا

یہ بکھری سی زلفیں

یہ پھیلا سا کاجل

یہ بے چین آنکھیں

یہ سنا سا آنچل

تیرے حال سے لوگ

پہچان لیں گے

تجھے دیکھ کر

سمجھ جان لیں گے

یہ ہنکے قدم لڑکھڑاتی جوانی

یہ بے تاب دل اور محبت دیوانی

شفق جیسے گالوں پہ

اُبھری ہوئی ہے

میرے ہونٹوں کی

اک مہکتی نشانی

تیرے جسم سے اُڑتی

میری یہ خوشبو

سنا دے گی ہر اک

کو ساری کہانی

نہ بن جائے اپنا

ملن اک فسانہ

سنو جان جاناں!

ابھی گھر نہ جانا

سچ کہہ رہے ہیں“

وہ بے حد حراساں و متوحش ہو کر پوچھنے لگی، اور ولید حسن کا قہقہہ ہوا میں گونج اُٹھا۔ وہ جان گئی اسے نہیں رہا ہے، جیسی فحشگی سے اسے گھور کر اس کی پکاروں کو نظر انداز کرتی ہوئی کمرے سے نکل بھاگی تھی۔

☆☆☆

حرا آپا نے دونوں نئے جوڑوں کی وجہ سے ایک بار پھر پوری فیملی کی دعوت کی تو، ولید اس کے لئے

رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تیار ہو کر نیچے جانے کو جیسے ہی دروازے سے نکلی، ساتھ والے کمرے سے کسی آہنی ہاتھ نے ایک دم اس کی کلائی تھامی اور ایک جھکے سے اپنی جانب گھسیٹ گیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ کا گامناہ منہ پہ جمادینے جانے والے ہاتھ نے گھونٹ دیا۔

تقریب کا اہتمام نیچے تھا، اس وقت اوپر شاہی کسی کی موجودگی کا امکان ہو۔ اپنے ہی گھر میں ہونے والی اس واردات نے ایمان کے روٹکے کھڑے کر دیئے۔ وہ حواسوں میں لوٹتے ہی تھرا کر پٹلی اور اپنے بے حد نزدیک کھڑے ولید حسن کو دیکھ کر صحیح معنوں میں بھونچکی ہو گئی۔

”مائی گاڈ.....! یہ کیا حرکت تھی.....؟“

وہ بے طرح جھٹکی۔

”جب تم پہنچ سے دور تھیں، تب بھی فاصلے پہ تھیں۔ اب جبکہ جائز رشتہ ہے، فاصلے تب بھی برقرار

ہیں.....؟ اس کی وجہ.....؟ یہ خوب صورت سی واردات اسی احتجاج کا ایک انداز ہے۔“

وہ جو بے خود سا کھڑا اس کا یہ دلکش روپ نگاہ کے رستے دل میں اُتار رہا تھا، اس پر جھک کر مخمور لہجے میں کہتے ہوئے اسے ایک دم اپنی بانہوں کے حصار میں جکڑ لیا۔ ایمان کو کہاں اس سے ایسی بے مچالی کی توقع تھی.....؟ اس کے لودیتے حصار میں چند ثانیے گم سم کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی گرم سانسوں، آنچ دیتی قربت نے اپنا احساس بخشا تو وہ اگلے ہی لمحے کرنٹ دکھانے والے انداز میں اسے دھکیل کر سرعت سے فاصلے پہ ہوئی تھی۔ وہ تمام تر توجہ، تمام تر شوقی سے اس کے حیا سے دیکھے خفا خفا چہرے کو دیکھ کر سرشاری انداز میں ہنس دیا۔

”بہت بدتمیز ہیں آپ.....!“

اس کی گستاخ نگاہوں کی آنچ سے پکھلتی وہ سرعت سے باہر جانے کو پسلی تھی، جب ولید نے براہِ کر

اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”مانند کیا.....؟“

وہ جواب دینے بنا ہونٹ کاٹتی رہی۔ وہ اس کی پٹلوں کے سایے کو گالوں پر نقش دیکھتا رہا۔ پھر کسی

قدر شریر انداز میں بولا۔

”یار.....! ساری دُنیا نے ہمیں گلے لگا کر نکاح کی مبارک باد دی، جبکہ میں سمجھتا ہوں، اس مبارک

باد اور گلے ملنے کا حق سب سے زیادہ ہم دونوں کا تھا۔“

سرشاری کی حدت سے اس کا لہجہ پھر سے بیکنے لگا۔ ایمان نے حیا بار خفگی سے اسے دیکھا تھا۔

”اگر کوئی دیکھ لیتا، کیا سوچتا ہمارے بارے میں.....؟“

اس کے خوف پہ ولید نے شوخ سا قہقہہ لگایا تھا۔ پھر ایک بار اس کا راستہ روکتا ہوا وہ بولا تھا۔

”جیسی تو کہہ رہا ہوں، ابھی مت جاؤ، ابھی اس خوب صورت حادثے کے تمام آثار تمہارے چہرے

پر سجے ہوئے ہیں۔“

اس کے بھاری لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ایمان کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

”کیا مطلب.....؟“

پہننے کو اپنی پسند کا سوٹ خرید کر لایا۔ ڈبہ اس کے سامنے پھینک کر وہ بے نیازی سے بولا تھا۔

”شام کو یہی کپڑے پہن کر تیار ہونا۔“

فضہ اتنی تجسس ہوئی کہ فوراً پیکٹ کھولنے لگی۔ میرون کلر کا بہت اسٹائلش سوٹ تھا۔ فضہ نے بے ساختہ تعریف کی۔

”لیکن ولید.....! میرے اور فضہ کے لئے تو تائی ماں نے سوٹ اپنی پسند سے پہلے ہی نکال دیئے ہیں۔“

ایمان نے واٹس میسن کے آگے کھڑے ہو کر پانی کے چھپاکے منہ پہ مارتے ولید سے کہا تھا۔ تائی ماں نے بہت شوق سے دونوں کے ایک جیسے لباس دیکھے تو پہننے کی فرمائش کر دی تھی۔ گو کہ ایمان کو وہ سوٹ اتنا خاص پسند نہیں تھا، لیکن وہ محض تائی ماں کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی، جیسی وہی سوٹ پہننے کا ارادہ کر لیا تھا۔

”نہ نہ میری دھی.....! تو یہی سوٹ پہن جو تیرے سر کا سائیں لے کر آیا ہے۔ میں نے تو یوں ہی اک بات کہہ دی تھی۔ اسے پھر کسی دن پہن لینا۔“

تائی ماں اس کی اس سعادت مندی پہ نہال ہی ہو اٹھیں تھیں۔ اچھا تو ولید کو بھی بہت اچھا تھا، مگر اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اماں کی طرح نہ اس کی بلا میں لینے کی پوزیشن میں تھا نہ ہی ماتھا چوم کر گلے لگانے کی۔ البتہ آئینے میں دکھائی دیتے اس کے عکس پہ نظریں جما کر جتانے والے انداز میں بولا تھا۔

”بس.....! ہوگئی تسلی.....! اب رات کو اسے ہی یہ اعزاز بخش دیجئے گا۔“

ایمان کچھ جھینپ سی گئی، جیسی اسے منہ چڑھا کر وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ مگر شام کو جب وہ تیار ہو کر آئی تو ولید مکمل تیاری کے ساتھ صحن میں کرسی پہ بیٹھا چائے پیتے ہوئے ساتھ ساتھ فضہ کو بھی زوج کر رہا تھا۔ کرنڈی کے وائٹ لٹراٹھلوار پہ میرون دھسا اپنے چوڑے شانوں پر ڈالے وہ اتنا وجیہ لگ رہا تھا کہ اسے اپنی دھڑکنیں منتشر ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

”اچھا لگ رہا ہوں ناں.....؟“

وہ میڑھیاں اتر کر آنگن میں اس کے پاس آئی تو ولید کے سوال پہ آنکھیں پھیلا کر رہ گئی۔

”اب یہ مت کہنا کہ مجھے کیا پتا.....؟ محترمہ.....! ہم آپ کا ٹھکانا ملاحظہ کر چکے ہیں۔“

اس کے جتلانے پر وہ کھسیا گئی۔

”بہت خوش فہم ہیں۔“

”خوش فہمی نہیں محترمہ.....! اسے خود آگاہی کہتے ہیں۔“

”وہ اتر آیا۔ پھر کسی قدر نخوت سے بولا تھا۔“

”ویسے اگر تعریف کر دیتیں تو انا کے اونچے مینار کی بلندی میں کچھ خاص فرق نہ پڑتا۔ میں بھی تو کرتا

ہوں تمہاری تعریف۔“

”یہ آپ کا کام ہے، کرتے رہیں۔“

وہ بے نیازی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ ولید اسے دیکھ کر رہ گیا۔ راستے میں جب ان کی گاڑی حرا

آپا کے گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی تو ولید نے عاقب سے کہہ کر گاڑی رکوادی تھی۔

”خیریت.....؟ کچھ بھول آئے ہو.....؟“

عاقب نے گردن موڑ کر اچنبھے سے اسے دیکھا اور وہ گہرا سانس کھینچ کر بولا تھا۔

”یار.....! مجھے اس وقت ایک جوک یاد آ رہا ہے۔ میں اسے شیئر کرنا چاہتا ہوں، تم لوگوں سے۔“

”ہاں تو کرو.....! گاڑی رکوانے کی کیا ضرورت تھی.....؟“

عاقب نے تحیر سے ایسے دیکھا اور پھر سے گاڑی کو اشارت کرنا چاہا، مگر ولید نے اسٹیئرنگ ڈنبل پہ رکھے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھ کے گویا یہ کوشش ناکام بنا دی تھی، پھر کسی قدر سنجیدگی سے بولا تھا۔

”ایک آدمی اپنے ہمسائے کے گھر چار پائی مانگنے گیا تو صاحب خانہ نے دروازے پر ہی اسے روک لیا مدعا سن کر بولے۔

بھائی.....! ہمارے گھر میں بھی صرف دو ہی چار پائیاں ہیں۔ ایک پہ میں اور میرے ابا سوتے ہیں،

جبکہ دوسری چار پائی پر میری اماں اور بیوی سو جاتے ہیں۔“

اس آدمی نے ہمسائے کی بات سنی اور جوابا بولا۔

”بھائی.....! چار پائی نہیں دینی تو نہ دو۔ لیکن اپنی ترتیب تو صحیح کر لو۔“

اس نے جتنی سنجیدگی سے جوک سنایا تھا، ان تینوں کا مشترکہ قبہہ اسی قدر بلند تھا۔

”بات صرف ہنسنے کی نہیں ہو رہی ہے جناب.....! ہمیں بھی اپنی ترتیب صحیح کرنی چاہئے۔ اگر یہاں

آپ کے پہلو میں فضہ جی اور میں اپنی زوجہ کے ساتھ ہوتا تو ذرا تصور کریں، یہ سفر کیسا سہانا ہو سکتا تھا.....؟“

وہ کچھ توقف سے بولا تو لہجہ ہنوز شرارتی تھا۔ عاقب نے اب کی بار اپنی مسکراہٹ چھپالی تھی۔

”تو گویا آپ نے یہ ترتیب صحیح کرنے کی خاطر گاڑی رکوادی تھی.....؟“

عاقب نے گہرا سانس بھر کے اس کی صورت دیکھی تو وہ کاندھے جھٹک کر بولا تھا۔

”یہ قیاس آدھا صحیح کیا جاسکتا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

عاقب حیران ہوا۔

”گاڑی اس لئے رکوادی ہے کہ فضہ جی کو آپ کے پہلو میں بٹھا دیا جائے اور ہم یہاں آپ کو تنہا

چھوڑ دیں تاکہ آپ کو بھی تھوڑا رومانس کا موقع مل سکے۔“

اس نے کسی قدر شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا اور حیران نظر آتی

ایمان کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

”ہائے.....! ہم آپ سے آپا کے گھر پہ ملاقات کرتے ہیں۔“

وہ انہیں ہاتھ ہلانے لگی۔ عاقب سر جھٹک کر رہ گیا، جبکہ فضہ جھینپ گئی تھی۔

”کیا کر رہے ہیں.....؟ میں اتنی دور تک مارچ پاسٹ نہیں کر سکتی۔“

ایمان نے گاڑی کو بڑھتے دیکھ کر بے اختیار احتجاج کیا تو ولید نے جواباً اسے بے حد خاص لگا ہوں

سے دیکھا۔

”نہیں چل سکتیں تو ہم ہیں ناں.....! بخوشی اٹھالیں گے آپ کو.....!“
ایمان اس کی نگاہوں کی بہکتی چمک پہ اسے ڈھنگ سے گھور بھی نہ سکی۔

”آپا کا گاؤں بہت خوب صورت ہے۔ میں یہاں کچھ یادگار وقت گزارنے کا متمنی تھا۔“
سیاہ تارکول کی سڑک پر ہوا خشک پتے اڑا رہی تھی۔ وہ ان ہی خشک پتوں کو روند کر چلتا ہوا مزے سے بولا۔ سڑک کے دونوں جانب کھیت تھیں۔ وہ سڑک کنارے سفید پھولوں کے جھنڈ کو دیکھ کر زک گئی اور جھک کر کچھ پھول توڑ کر مٹی میں قید کر لئے۔ موڑ مڑتے ہی سنبل کے درختوں کا سلسلہ تھا۔ بھیگی ہوا کی شرارت سے لائے درخت ذرا سا جھکتے اور روئی کے سفید گالوں سے فضاء بھر جاتی۔ ایمان نے مبہوت ہو کر روئی کے ان گالوں کو دھیرے دھیرے زمین پر اترتے دیکھا تھا اور ولید حسن نے اس نازک بے حد حسین لڑکی کو۔
”ایمی.....!“

وہ ہنوز اسی منظر میں گم تھی جب ولید حسن نے اسے پکارا۔
”جی.....! وہ چونکی اور سوالیہ نگاہوں سے اسے تنگے لگی۔
”وہ دیکھو ادھر.....!“

اس نے اونچی نیچی پگ ڈنڈی کی سمت اشارہ کیا جو شہبوت اور سفیدے کے درختوں کے بیچ سے گزرتی نہر تک جا رہی تھی۔

”آؤ.....! دوڑ لگاؤ بھئی.....! جو پہلے نہر تک پہنچا، وہی وز.....! ٹھیک ہے.....؟“

اس کے لہجے میں بچوں کی سی معصومیت اور جوش تھا۔ ایمان نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر لی۔
”اوکے.....! سٹارٹ.....! اون.....! ٹو.....! تھری.....! گو.....!“

ولید نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور اگلے ہی لمحے دونوں بھاگ پڑے تھے۔ ولید تمام تر کوشش کے باوجود اس سے پہلے رینگ اسٹینڈ تک نہیں پہنچ پایا جبکہ اس کا سانس بھی پھول چکا تھا۔
”میں جیت گئی.....! میں جیت گئی.....!“

وہ بچوں کی طرح اچھل اچھل کر تالیاں بجاتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ ولید نے زک کر اس کے اس انداز کو بہت دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اس کے دل کی بے ایمان ابھرتی دھڑکنوں نے اسے شرارت پر اکسایا اور اس نے آگے بڑھ کر ایک دم سے بازوؤں میں لے کر گھما ڈالا۔
”تم ہنستی اچھی لگتی ہو، ہمیشہ ہنستی رہنا۔“

وہ اس پہ جھک کر بے حد شوقی سے گنگنایا۔ اس کی چمکدار آنکھ میں بلا کی شرارت تھی۔ ایمان کا چہرہ کچھ غصے، کچھ شرم سے سرخ پڑا تھا۔ حیا کے غلبے اور لمس کی میٹھی میٹھی دہکتی ہوئی مدہوشی اپنی جگہ تھی مگر اسے ولید کی یہ جسارت خفت زدہ کر گئی تھی۔

”بٹیس چھوڑیں.....! آپ کو شرم نہیں آتی ہے.....؟“

زبردستی اس سے الگ ہو کر وہ بے ترتیب دھڑکنوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے لرزتی آواز میں بولی۔

”جس نے کی شرم
اس کے پھونے کرم“

وہ جواباً اسی ڈھٹائی سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر وارفتگی سے بولا۔

”میں ان لمحات کو یادگار، حسین اور خوب صورت بنا دینا چاہتا ہوں ایمی.....! تاکہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تو پھر اپنے بچوں کو یہ قصے سنا کر خود بھی محظوظ ہوں اور انہیں بھی کریں۔“

دھیما، جذباتی، بے قابو سا لہجہ ایمان کو کانوں کی لوؤں تک سرخ کر گیا۔

”یہ بچے کہاں سے آگئے بیچ میں، حد ہے بھئی.....!“

وہ بے طرح جھینپتی جزیزی ہوتی اس سے نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”میں بھی بڑھاپے کی بات کر رہا ہوں، ابھی کی نہیں.....! ویسے میں بچوں کے بعد بھی تمہیں یوں ہی

چاہتا رہوں گا۔ وہ ایک شعر سنا ہے تم نے.....؟“

معاذہ زک کر سر کھانے لگا جیسے ذہن پر زور ڈال رہا ہوں۔

”میں وہ عاشق ہوں جو اپنے بچوں سے حسد کرتا ہے

اپنی ماں سے لپٹ جاتے ہیں جب وہ پیار کے ساتھ“

اس نے بڑے ہی شوخ و شگ سے انداز میں شعر پڑھا تھا، پھر اسے دیکھ کر ایک آنکھ دبا کر بولا تھا۔

”ایسا ہی شوہر ثابت ہونے والا ہوں میں تمہارے لئے.....!“

”بہت شکریہ جناب.....! اب گھر چلیں، آپ انتظار کر رہی ہوں گی۔“

وہ اس کے رومٹیک موڈ سے خائف، کترائے ہوئے انداز میں بولی تو ولید نے منہ لٹکا لیا تھا۔

”ابھی تو جان چھڑا رہی ہوں ناں مجھ سے، کبھی سر پہ ہاتھ رکھ کر یاد کرو گی مجھے۔“

”کیوں.....؟ آپ کہیں تشریف لے جانے والے ہیں کیا.....؟“

ایمان کو اس کی بات چھی تھی، جیہی نخوت سے کہہ ڈالا۔

”ہاں.....! جانا تو ہے۔“

وہ جیسے ایک دم سنجیدہ ہوا۔ ایمان نے قدرے چونک کر اسے دیکھا تھا اور وہ مضطرب ہوا بھئی۔

”کہاں جانا ہے آپ کو.....؟ بتائیے.....!“

”یار.....! ابھی تو نہیں جا رہا، بتا دوں گا۔“

وہ جیسے صاف ٹال رہا تھا، بلکہ اپنے منہ سے پھسل جانے والی بات پہ خود کو کوس رہا تھا۔

”جانا کہاں ہے.....؟ ولید.....! بتائیں مجھے ابھی اسی وقت۔“

ایمان نے بے اختیار اس کا بازو پکڑ کر روکا۔ وہ یوں گہرا سانس بھر کے رہ گیا گویا بارمان لی ہو۔

”جس کمپنی میں پارٹ ٹائم جاب کر رہا ہوں ناں میں، اس کی طرف سے چار چھ ماہ کے لئے فارن

کنٹری بھیجا جا رہا ہے مجھے۔ یہ تقریباً ایک سال قبل کی بات ہے، تب میں نے بھی اپنا نام لکھوا دیا تھا۔ اب میری

سلیکشن ہو گئی ہے تو بس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہوں۔ میرے اس ٹور اور وہاں حاصل کئے جانے والے

تجربے کی بدولت نہ صرف میری سیلری میں اضافہ ہوگا، بلکہ میری پروموشن بھی ہو جائے گی۔ میں نے مگنی کی بجائے نکاح کا آئیڈیا بھی اسی لئے دیا تھا کہ اس بندھن کو پاسدار کرنا چاہتا تھا۔

”آپ نہیں جا رہے ہیں ولید.....!“

اس نے گویا پوری بات سنی ہی نہیں تھی۔ ولید نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب واضح ہے۔ آپ نہیں جائیں گے۔ آپ کے لئے یہاں بھی ترقی کے چانسز ہیں۔“

وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولی تو ولید نے سرکوفی میں جنبش دی تھی۔

”میرے خواب بہت اونچے ہیں ایمان.....! ان تک رسائی کی خاطر مجھے مستقل جدوجہد کرنا ہے۔“

”آپ سب کچھ یہاں رہ کر بھی تو کر سکتے ہیں ولید.....؟“

”صرف چند ماہ کی تو بات ہے۔“

وہ زچ ہوا۔

”مہینے صدیاں بن جاتے ہیں ولید.....! جب یہ انتظار میں گزارنے ہوں۔ بس.....! میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔“

اس کا لہجہ دو ٹوک اور قطعی تھا۔ ولید نے ہونٹ بھیج کر اسے دیکھا تھا، پھر نرمی سے بولا۔

”اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔“

”میں بڑی ہو چکی ہوں، اب بچی نہیں ہوں۔“

وہ نروٹھے پن سے بولی تو ولید ہنس پڑا۔

”اوکے.....! اچھی بیویاں ضد نہیں کرتیں۔ اب ٹھیک.....؟“

”ولید.....! بحث مت کریں۔ میں کہہ چکی جو مجھے کہنا تھا۔“

اس نے اب کے کسی قدر غصے سے کہا تو ولید کو بھی تاؤ آ گیا۔

”تم بھی ضد مت کرو، مجھے جانا ہے اور ہر صورت جانا ہے، انڈر اسٹینڈ.....!“

اس نے کسی قدر برہمی سے کہا اور قدموں کی اسپیڈ بڑھا دی۔ ایمان اس سے پیچھے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”یہ اب جو موڑ آیا ہے

یہاں رُک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے

سنا ہے ایک صحرا کے سفر میں

راستے میں دو قدم بھٹکیں

تو منزل تک پہنچنے میں

کئی فرنگ کی دُوری نکلتی ہے

سواب جو موڑ آیا ہے

یہاں رُک کر

کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے“

وہ تب سے بے حد خاموش تھی، گم سم، حیران، پریشان۔ فضا کو تو اس کی کیفیت نے پریشان کر ڈالا۔

آپا اور عاقب الگ وجہ پوچھتے رہے۔ وہ ”ہوں، ہاں“ کر کے چپ ہو گئی۔ ولید البتہ نارمل تھا۔ ویسے ہی شوخ

جملے، ویسی ہی ہنسی، مذاق در برجستگی۔

”کتنا آسان ہوتا ہے مرد کے لئے کسی بھی بات کو کہہ دینا، اسے منوالینا۔“

اس نے مگن سے انداز میں آپا کے بچوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ولید کو دیکھ کر سوچا تھا۔

”تم نے کچھ کہا ہے ایمان سے.....؟“

عاقب کے سوال پہ وہ صاف منکر ہو گیا تھا۔

”میں کیا کہوں گا.....؟ سارے راستے ہنساتا لایا ہوں۔ پوچھ لیں جو کوئی بھی نازیبا حرکت کی ہو۔“

کیوں ایسی.....؟“

اسی بہانے ولید کو بھی اسی سے براہ راست بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ مسکرا کر اس کی آنکھوں میں

جھانکا، مگر ایمان نے کوئی تاثر دیئے بغیر نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔ عاقب کو جیسے اپنی بات کا ثبوت مل گیا۔ جیسی ولید

کھسیا ہٹ کا شکار ہوتا سر کھانے لگا تھا اور دعوت سے واپسی پر جب آپا نے انہیں تحائف دے کر رخصت کیا،

تب تک ولید کی بھی تمام خوش مزاجی جیسے مفقود ہو چکی تھی۔

”اب ترتیب صحیح نہیں رکھنی ہے کیا.....؟“

ایمان کو پچھلی سیٹ پہ فضا کے ساتھ بیٹھتے دیکھ کر عاقب نے شرارت سے کہا تھا۔

”فضہ آگے نہیں آئے گی، عاقب بھائی.....! آپ گاڑی چلائیں، جسے بیٹھنا ہے، بیٹھے۔ ورنہ مرضی

ہے۔“

وہ نروٹھے پن سے بولی تو ولید گہرا سانس کھینچ کر دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ پر آئندہ سیٹ کرنے کی۔“

وہ بھڑک کر بولی تھی۔ ولید کا بڑھا ہوا ہاتھ اسی زاویے پہ ساکن ہو گیا۔ چہرے پہ ایک رنگ سا آ کے

گزر گیا۔ عاقب نے مسکراہٹ چھپائی تھی۔ جبکہ فضا الجھن زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ولید نے ایک

کیسٹ سلیکٹ کی اور ٹیپ آن کر دی۔

”مجھے تم چپکے چپکے سے ایسے جب دیکھتی ہو

اچھی لگتی ہو

کبھی رُفوں سے کبھی آنچل سے جب کھیلتی ہو

اچھی لگتی ہو“

وہ دانستہ ساتھ ساتھ گنگنا نے لگا۔ ایمان کا پارہ چڑ رہا تھا، مگر ہونٹ بھیچنے ضبط کرنے لگی۔

”مجھے دیکھ کے جب تم ٹھنڈی آہیں بھرتے ہو

اچھے لگتے ہو

مجھ کو جب لگتا ہے تم مجھ پہ ہی مرتے ہو

اچھے لگتے ہو

تم میں اے مہرباں ساری ہیں خوبیاں

بھولا پن، ساوگی، دلکشی، تازگی

تم ہوتے ہم نشیں میں ہوتی اور حسین

تعریف جو سن کے تم شرما جاتی ہو

اچھی لگتی ہو

کبھی ہنس دیتی ہو اور کبھی اتر جاتی ہو

اچھی لگتی ہو

جب اس نے ذرا سا رخ پھیر کے اسے براہ راست مبہم شوخ نگاہوں کی زد پہ رکھا تو ایمان کا ضبط جواب دینے لگا۔

”عاقب بھائی! ذرا ٹیپ تو آف کریں پلیز!“

اس نے ماتھے پہ تیوریاں ڈال کر کہا تو ولید چل اٹھا تھا۔

”کیا ہے بیوی! دیکھنے پہ پابندی؟ ساتھ بیٹھنے پہ پابندی؟ اب میوزک سے دل تو بہلا لینے دو!“

”میں آپ کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔“

وہ نردنگے پن سے کبھی ہوئی منہ بگاڑ کر بولی تو ولید نے جواباً آج دیتی بے لگام نظروں سے اسے دیکھا اور ذومعنی لہجے میں بولا تھا۔

”اے منہ لگنا تو نہیں کہتے ولید! اتنے فاصلے سے یہ ممکن ہے بھی نہیں!“

ایمان خفت، حیا اور شرمندگی سے اپنے چہرے سے بھاپ نکلتی محسوس کرنے لگی۔ اس نے دیکھا، فضلہ کھڑکی سے باہر دیکھتی گویا دونوں کو انگور کئے ہوئے تھی، جبکہ عاقب گاڑی ڈرائیور کرنے میں محو۔ مگر کیا انہوں نے اس کی فضول بات کو نہ سنا ہوگا؟

امپابل!

اس نے ہونٹ بھیجنے لئے اور باقی کا راستہ خاموشی سے کٹا، جبکہ ٹیپ ہنوز چل رہا تھا۔

”سوچتا ہوں کہ میں کیا پکاروں تمہیں

دلشیں، ماہ رو، نازنیں، ماہ جبین

میرے اتنے سارے نام میں جب تم یہ کہتے ہو

اچھے لگتے ہو اچھے لگتے ہو“

ایمان نے اس کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کرنے کے باوجود نظریں نہیں اٹھائیں۔ گاڑی گھر کے

سامنے رکی تو سب سے پہلے وہی اتر کر اندر گئی تھی۔ ولید نے ہونٹ بھیجنے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کے متفکر رنگ گہرے ہوتے چلے گئے تھے۔

رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو اشعرٹی وی کے آگے بیٹھا نیوز سن رہا تھا۔

”سب لوگ کدھر ہیں؟“

”سب سے مراد اگر آپ کی ایمان سے ہے تو وہ اوپر ہیں۔“

اشعر نے کسی قدر شرارت سے جواب دیا تو وہ کچھ سوچتا ہوا کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی سمت آگیا۔ ابھی دو تین اسٹیپ ہی اوپر آیا تھا کہ عاقب سیڑھیاں پھلاکتا ایک دم اس کے سامنے آگیا۔

”آؤ یار! بیٹھتے ہیں کچھ دیر اور!“

ولید کے کہنے پہ عاقب نے سر کونئی میں جنبش دی تھی۔

”میرا دل نہیں لگے گا۔ فضلہ گئی ہے ناں!“

اس نے شرارتی انداز میں کہا تو ولید مسکرایا تھا۔

”اور میری والی محترمہ؟“

”جاگ رہی ہیں، جاییے جاییے!“

عاقب اسے پیش کرتا خود سائینڈ سے ہو کر باقی ماندہ سیڑھیاں پھلانگ گیا۔ وہ اوپر آیا تو ایمان کتابیں کھولے بیٹھی تھی، نی وی بھی چل رہا تھا۔

”اس طرح کرو گی تو پھر ہو چکی پڑھائی؟“

ولید نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا، مگر ایمان کی لائق اور بے نیازی میں کمی نہیں آئی۔

”اے لڑکی! شوہر آیا ہے تمہارا، اس سے چائے کا ہی پوچھ لو۔“

مقصدا سے چھیڑنا، زچ کرنا، کسی طور بولنے پہ اکسانا تھا۔ مگر وہ صاف انگور کر گئی۔

”مجھے بات کرنا ہے تم سے۔“

ولید نے کہتے ہوئے اس کی کتاب بند کی تو ایمان نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”بدتمیزی مت کریں اور جائیں یہاں سے۔“

ولید نے کچھ دیر اسے دیکھا، پھر بہت آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

”تم ردھ جاؤ مجھ سے ایسا کبھی نہ کرنا

میں اک نظر کو ترسوں ایسا کبھی نہ کرنا

میں پوچھ پوچھ ہاروں سو سو سوال کر کے

تم اک جواب نہ دو ایسا کبھی نہ کرنا

مجھ سے ہی مل کے بننا مجھ سے ہی مل کر رونا

مجھ سے بچھڑ کے جی لو ایسا کبھی نہ کرنا

تم چاند بن کے رہنا میں دیکھتا رہوں گا

اگر کوئی بغض کا مارا
فلک سے ٹوٹا ہوا ستارہ
تمہارے سینے میں دوسوں کے
کیسے خنجر اُتارتا ہو
تو اس سے پہلے کہ رو پڑو تم
تو اس سے پہلے کہ جل بجھو تم
تو اس سے پہلے کہ یہ کہو تم
وہ عہد و پیاں سب غلط تھے
سحر کے امکاں سب غلط تھے
تو اپنی انگشت ماہ و ش پر
گلاب چہرہ جھکا کے کہنا
سنو وہ سچ سچ ہی بے وفا ہے
تمہارا روتا سوال سن کر
وہ شوخ رنگ مسکرا پڑے گا
تمہاری پلکوں پہ ہونٹ رکھ کر
تمہارے گالوں کو تھپتھا کر
حسین انگشتی کہے گی

سنو.....! محبت تو خوش گماں ہے

وہ خاموش ہوا اور پھر اس کے خاموشی سے بہتے آنسو بہت توجہ، محبت اور دھیان سے اپنی پوروں پہ
سمیٹ لئے۔

”سنو.....! کروگی نا ایسا.....؟“

اور ایمان کے پاس سر کو اثبات میں ہلا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
”گڈ.....!“

وہ بے طرح خوش ہو گیا۔

”میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

وہ اٹھ گئی تھی۔ ولید وہیں بیٹھے بیٹھے نیم دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے وقت کے سہانے
پنہ تو آنے والا وقت جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا، سوائے رب کے۔

☆☆☆

”میرے دیران کمرے کی کھلی کھڑکی سے

جب ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا

کسی روز تم نہ نکلو ایسا کبھی نہ کرنا
تم چلے جاؤ جب بھی دیکھوں تمہارا راستہ
تم لوٹ کے نہ آؤ ایسا کبھی نہ کرنا“
اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ایمان کو اپنی ناراضگی زائل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ جوب بھیجے
ہوئے تھی، اسے دیکھ کر کچھ کہنے لگی تھی کہ ولید نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا۔

”پہلے بتاؤ.....! اب بھی خفا ہو کیا.....؟“

”ولی.....! میں آپ سے کب خفا رہنا چاہتی ہوں.....؟“
وہ عاجز ہونے لگی۔

”پھر کیا تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے.....؟“

اور ایمان نے نظریں چرائی تھیں۔ ولید نے ٹھنڈا سانس کھینچا، پھر کچھ توقف سے بولا تھا۔

”میں تمہارا اسیر ہو چکا ہوں جان من.....! اب کہیں نہیں جاسکتا۔ ٹرسٹ می.....!“

”ٹھیک ہے.....! اب جائیں.....!“

ایمان نے غصے سے کہا تو ولید نے منہ بنا کر اسے دیکھا تھا۔

”ایسے نہیں.....! مسکرا کے اجازت دو.....!“

”کوئی زبردستی ہے کیا.....؟“

وہ تملنائی۔

”ہاں.....! زبردستی ہے.....!“

ولید نے بے نیازی سے کاندھے اُچکائے تو ایمان ہونٹ بھیج کر اسے دیکھنے لگی۔

”بتا نہیں کیوں ولی.....! میرا دل ڈر رہا ہے۔ کوئی انجانے سے خدشات ہیں جو وہمی بنا رہے ہیں۔

پلیز.....! مت جائیے ناں.....!“

وہ ہانپتی ہونے لگی۔ ولید نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے پڑھت مضبوط ہاتھوں میں لے لئے۔ کچھ دیر

اس کی آنکھوں میں ڈولتے آنسوؤں کی نمی میں اپنا عکس سکتا رہا، پھر آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

”تمہاری انگشتی کے نگ میں

میری محبت چمک رہی ہے

اگر کبھی یہ گماں بھی گزرے کہ

میں تمہیں بھولنے لگا ہوں

تو اس نگیں کو دیکھ لینا

میری نگاہوں کی جگہ گاہٹ

تمہاری نگاہوں سے یہ کہے گی

سنو.....! محبت خوش گماں سے

میری آنکھوں سے تیری یاد کے آنسو چراتا ہے
تو میرے سرد کمرے میں سچی ہر چیز کے اندر
تمہارے ہونے کا احساس پھر سے جاگ اٹھتا ہے
یہاں جب شام ڈھلتی ہے
میری ہر نظم کی بائیں

تیرے احساس کو خود میں سمو لینے کی خواہش میں
جودا ہوتی ہیں تو صبح تک گرتی نہیں تھک کر

وہ کسی کام کی غرض سے وہاں آیا تھا۔ ہارون کمرے میں نہیں تھا۔ بیٹر آن تھا۔ اسنڈی ٹیبل پر کھلی
ڈائری کے صفحے کے اندر پین یوں پڑا تھا، جیسے وہ ابھی لکھتا ہوا اُنھ کے گیا ہو۔ موسیٰ کی نگاہیں اس کے لکھے
الفاظ پہ ٹھہریں اور ڈھیروں پیش سمیٹ لائیں۔

☆☆☆

اس نے یوں ہی بھیجنے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ نگاہوں کو پھر سے صفحے پہ جمایا تو آنکھوں کی حدت
بے تحاشہ بڑھ چکی تھی۔

”میری بک شلف میں رکھی ہوئی ساری کتابوں پر

تمہاری انگلیوں کا لمس اب بھی دل کو چھوتا ہے

تیرے ملبوس سے اُنھٹتی ہوئی مدہوش کن خوشبو

میرے کاندے پہ اپنے ہونٹ رکھتی ہے

میری ہر سوچ کے ہر خواب کو

خود میں جکڑ کر توڑ دیتی ہے

یہ کیسی مختلف سی بے بسی ہے کہ

میں جب بھی جینے لگتا ہوں

یہی خوشبو، یہی آہٹ

چھڑا کے ہاتھ مجھ سے

مجھ کو اس انجان دنیا میں

اکیلا چھوڑ دیتی ہے“

موسیٰ نے ڈائری واپس نہیں رکھی تھی۔ شدید طیش کے عالم میں دیوار سے کھینچ ماری۔

”ایمان ارتضیٰ شاہ.....! ہارون کا دوانی کے سوا ہر نام کو بھول جاؤ۔ میں تمہیں کسی اور کا نہیں ہونے

دوں گا۔ یاد رکھنا.....! اگر اس روئے زمین پر تم کسی مرد کی ہونیں تو وہ صرف میرا بھائی ہوگا۔“

اس کی سوچوں میں بھی آگ بھڑک اُنھٹتی تھی۔ دروازے کو ٹھوکر سے بند کرتا وہ راہ میں آئی ہر شے کو

کراتا ہوا آندھی طوفان کی طرح باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

چند لمحوں کے توقف سے داش روم کا دروازہ کھول کر ہارون کا دوانی تو لیے سے گیلے بال خشک کرتا

اندرا آیا تھا۔ تولیہ صوفے پہ اُچھال کر ڈانٹنگ ٹیبل کی سمت بڑھتے ہوئے اس کی نگاہ ہی نہیں، قدم بھی ٹھٹک گئے

تھے۔ کچھ ٹاپے وہ یوں ہی متحیر سُن نگاہ سمیت غیر یقینی کے عالم میں دیوار کے ساتھ کارپٹ پر آندھی پڑی اپنی

مہر از جان ڈائری کو دیکھتا رہا تھا، پھر آہستگی سے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے ڈائری اٹھالی۔

”بہر حال یہ جرأت کسی ملازم کی نہیں ہو سکتی تھی۔“

ڈائری واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے انٹرکام کا ریسپورڈ اٹھایا تھا۔

”صابر.....! ابھی کچھ دیر قبل میرے کمرے میں کون آیا تھا.....؟“

”چھوٹے صاحب.....!“

”یعنی موسیٰ.....؟ تم کفرم ہو صابر.....؟“

وہ کچھ دیر خاموش کھڑا دوسری سمت کی بات سنتا رہا، پھر مزید کوئی ایک لفظ بھی کہے بغیر ریسپورڈ رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اُتری حیرت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”ستم سہنے کی عادت ہو گئی ہے

کہ مجھ کو بھی محبت ہو گئی ہے

تجھے ہے فکر دُنیا اور مجھ کو

فقط تیری ہی خواہت ہو گئی ہے

ستم گر! کیا خبر تجھ کو محبت

عبادت تھی اذیت ہو گئی ہے

ہمارے دل پہ اپنا ہاتھ رکھ دو

بہت بے تاب حسرت ہو گئی ہے

بہلنے سے بہلتا ہی نہیں اب

دل کی کیسی حالت ہو گئی ہے“

سوچوں نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔ وہ تنہائی سے گھبراتے نیچے چلی آئی۔ ولید کے جانے کی خبر اب پورے گھر کو ہو چکی تھی۔ تائی ماں کے سوا اور کسی نے بھی احتجاج نہیں کیا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ دُھوپ آنگن کے فرش سے ریٹکتی دیوار کے اوپر چڑھ رہی تھی۔

صحن میں لگی ٹوٹی قطرہ قطرہ ٹپکتی تھی اور جس جگہ یہ پانی کا قطرہ گرتا تھا، وہاں ایک ننھا سا گڑھا بن گیا تھا۔ ایک پھولے پروں والی چڑیا اس گڑھے میں اپنی چونچ ڈال کر پانی پی رہی تھی۔ چڑیا نے سیراب ہو کر اپنے پر زور سے پھڑپھڑائے، تب وہ جو خالی الذہن کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی، چونکی اور سر جھٹک کر نیچے چلی آئی۔ آنگن میں بچھی دونوں چار پائیاں خالی تھیں۔ سکھ چین کے درخت سے ہر دم گرنے والے پتے سسے ہوئے تھے، یوں جیسے کسی نے کچھ دیر قبل ہی جھازو لگائی ہو۔ وہ آہستگی سے چلتی کچن میں آگئی۔ فضا وہیں مصروف تھی۔ وہ چھلے ہوئے آلوؤں کو میٹھ کر کے مختلف مصالحے ملانے میں مصروف اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”کیا بنا رہی ہو.....؟“

وہ دروازے کی چوکھٹ میں ہی تھم گئی۔

”آلو کے کباب.....! عاقب کو بہت پسند ہیں ناں.....!“

”میں تمہاری ہیلپ کروں.....؟“

اس کے سوال پر فضا کو اتنی ہی حیرت ہوئی چاہئے تھی جتنی اس کی آنکھوں سے چھلکی تھی۔ یہ وہ ایمان تھی جو بنی ہوئی چائے بھی خود سے کپ میں نہیں نکالتی تھی۔ فضا یا پھر ماما کو اس کے لئے ٹی پاٹ سے چائے نکالنا پڑتی تھی۔

”شیور.....! وائے ناٹ.....! تم ایسا کرو، لڑاچی میں تیل ڈال کر چولہے پر رکھو۔“

اپنی حیرت چھپا کر اس نے نارٹل سے انداز میں اسے کام سونپا۔ ایمان عمل کرنے لگی۔

”فضا.....! آپ کا فون ہے۔“

ولید حسن اپنے دھیان میں تیزی سے کچن میں آیا تھا، مگر اسے وہاں فضا کے ساتھ لگے دیکھ کر ٹھنکا۔

”کس کا ہے.....؟“

فضا جو بیسن گھول رہی تھی، متعجب ہو گئی۔

”شاید آپ کی کوئی فرینڈ ہیں۔“

فضا کی بات کا جواب دیتے ہوئے بھی وہ ایمان کی سمت ہی متوجہ تھا جو فضا کا چھوڑا ہوا بیسن خود گھولنے لگی تھی۔

”یہ ہماری گنہگار آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں.....؟“

فضا سیل فون سمیت کچن سے نکل گئی، تب ولید نے کسی قدر شونہی سے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ جواب دے بغیر اپنے کام میں محو رہی تو ولید نے آگے بڑھ کر محض اس کی توجہ حاصل کرنے کو پیچھے سے آکر اپنے بازو اس کے کاندھے پر پھیلادینے۔ اس کے خوش رو سے چہرے کے تاثرات میں خوش گواریت کا تاثر تھا۔

”معدے سے ہو کر دل کا راستہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے مادام.....؟ آپ تو یہ معرکہ بہت پہلے سے مار چکیں۔“

دھیما، مخمور، سرگوشیا نہ انداز، وہ سرعت سے سمٹ کر فاصلے پر ہوئی۔ ولید نے بہت دلچسپی سمیت اس کے گالوں پر اُتری شفق کو دیکھا تھا۔

”پریکٹس کر رہی ہوں۔ ظاہر ہے، مجھے اسی گھر میں رہنا ہے۔ اب کاموں کی عادت بھی ڈال لینا چاہئے۔“

جواباً وہ بڑی سنجیدگی سے گویا ہوئی تو ولید نے تھیر آئیز مسرت سمیت اسے دیکھا تھا۔

”ریٹلی.....؟“

وہ ہنسا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ولید نے اس کے چہرے کو تکتا ہوا سرگوشی سے مشابہ آواز میں بولا۔

”میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے میری محبت مل گئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر خوش نصیبی یہ کہ تم میری محبت میں ہر مشکل کو فیس کرنے کو بھی تیار ہو۔“

”میں سب کچھ کروں گی ولید.....! بس آپ باہر مت جاییے۔“

وہ ایک دم ہلکتی ہوئی تو ولید کا سارا خوش گوار موڈ ایک دم گہری سنجیدگی کی دیز چادر میں گم ہو گیا۔

”میں تمہیں آزمائش میں ہی تو نہیں ڈالنا چاہتا۔ ایمان.....! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ میں تمہاری پرکھ کیوں کروں.....؟ جبکہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ یہ چند ماہ محض چند ماہ ہوں گے۔ پلیز.....! میری خاطر.....؟“

اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر اپنی گرفت میں لیتا ہو وہ اتنی لجاجت سے کہہ رہا تھا کہ ایک بار پھر ایمان کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

☆☆☆

”کاش ہم سمجھ لیتے
راہ میں بھٹکنے سے منزلیں نہیں ملتیں
بے سبب اُداسی میں رونقیں نہیں ملتیں
لوگ لوگ رہتے ہیں ہاتھ تھام لینے سے
ساتھ ساتھ چلنے سے ہم سفر نہیں بنتے
درد بانٹ لینے سے
کوئی چارہ گر نہیں ہوتا
اعتبار کرنے سے کوئی معتبر نہیں ہوتا
کاش ہم سمجھ لیتے
شہر جب اُڑتے ہیں
ان کے دیراں کھنڈر میں
داستاں تو ملتی ہے آتما نہیں ملتی
جگنوؤں کو مٹھی میں قید کر بھی ڈالیں تو
روشنی نہیں ملتی
کاش ہم سمجھ لیتے
آس آس رہتی ہے
پیاس پیاس رہتی ہے
سراب تک پہنچنے سے تشنگی نہیں مٹتی
وفاؤں کو لوٹانے سے
جان سے بھی جانے سے
زندگی نہیں ملتی“

وہ ناشتے کی ٹیل پہ آیا تو معمول سے زیادہ خاموش تھا۔ ماما نے بغور اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھا جس کی خوب صورت آنکھوں میں پچھلے کچھ دنوں میں کیسی زندگی سی لوٹ آئی تھی۔ ان کا دل جانے کیا کچھ سوچ کر ملول ہونے لگا۔ انہوں نے سلاکس پر بٹرنگ کی اور پلیٹ میں رکھ کر اس کی سمت بڑھا دیا۔ وہ فرلش جوس کے سپ لیتا

”پلیز ایکی.....! ہم اس ٹاپک کو مزید ڈسکس نہیں کریں گے۔ میں تمہیں قائل کر چکا تھا ناں.....؟“

ایمان نے کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی اس کے جھکے سر کو دیکھتا رہا، پھر اس کا موڈ بدلنے کی غرض سے بولا تھا۔

”ویسے تمہارے لئے ایک گڈ نیوز بھی ہے۔“

آپ نہیں جا رہے ہونا.....؟“

وہ بچوں کی طرح پڑ جوش ہو کر اشتیاق سے بولی۔ ولید نے سنجیدہ قسم کی نگاہ اس پر ڈالی اور سر کونٹی میں جنبش دی تھی۔

”چاچو نے آپ لوگوں کو واپس شہر والے گھر بلوایا ہے۔“

ولید کی بات پہ ایمان نے کسی قسم کا تاثر نہیں دیا اور سر جھکائے کڑا ہی میں کڑکتے تیل کو دیکھتی رہی۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی.....؟“

ولید کو واقعی اچنبھا ہوا تھا۔

”اب میری خوشیوں کی نوعیت بدل گئی ہے۔“

ایمان نے جواباً سرد انداز میں کہا تو ولید گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

”فصہ کی شادی بھی انہی چند دنوں میں متوقع ہے۔ بابا چاہتے ہیں میری رواجی سے قبل اس قصے کو کوئی حتمی موڑ دے دیا جائے۔ چاچو کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

اس نے ایک اور اطلاع دی تھی۔ ایمان نے محض ایک نگاہ اسے دیکھا تھا اور رُخ پھیر کر میٹھ کئے ہوئے آلوؤں کے آمیزے سے ہالز بنانے لگی۔

”یار.....! کیا ہے.....؟ ایسے بی ہیو کرو گی تو میں وہاں اطمینان سے کیسے رہ پاؤں گا۔ تمہاری یہ بی بسورتی ہوئی شکل ہی تصور میں آیا کرے گی۔“

ولید نے اس کے کاندھے کو انگلی سے ٹھک ٹھک بجا کر روٹھے ہوئے انداز میں کہا تو ایمان نے گہرا سانس کھینچا اور خود کو محض اس کی خاطر کمپوز کر کے بولی تھی۔

”اچھا ہے ناں.....! شاید اس طرح ہی واپس جلدی آجائیں.....؟“

”میں تمہارے خوابوں کی تکمیل کی غرض سے جا رہا ہوں ایکی.....!“

اس نے جیسے باور کرایا تھا۔ ایمان نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”مگر میرے خواب تو..... ولید.....! میں نے کب آپ سے اپنی خواہشات کا اظہار کیا ہے.....؟“

”تم نے نہیں کیا تو کیا ہوا.....؟ میں خود کیا تمہارا طرز زندگی نہیں جانتا۔“

وہ نظریں کترا کر کہہ رہا تھا۔ ایمان نے تڑپ کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

”طرز زندگی تو فصہ کا بھی.....“

”فصہ کی بات مت کرو ایمان.....! وہ ہر طرح کے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اور میں.....؟ ولید.....! محبت تو انسان سے سب کچھ کروا لیتی ہے۔ آپ مجھے آزما.....“

ہوا چونکا اور ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

”بیٹا.....! ناشتہ تو اچھی طرح کر لیا کرو.....!“

آفس جا کے ناشتہ کر لیتا ہوں ماما.....! ڈونٹ دری.....!“

وہ کوئی دنیا کی آخری لڑکی نہیں تھی، میں تمہارے لئے.....“

”نو ماما.....! وہی لڑکی دنیا کی آخری لڑکی ہے بھائی کے لئے۔ بس.....! کچھ ویٹ کریں، میں سب کچھ پاسپیل بنا لوں گا۔“

اسی پل ڈاننگ ہال میں داخل ہونے والے موسیٰ نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اتنے یقین سے کہا تھا کہ دونوں ماں بیٹے نے چونک کر اس کی شکل دیکھی تھی۔

”واٹ یو مین.....؟“

ہارون نے کسی قدر پزیرش نگاہ اس کے فریش چہرے پر ڈالی تھی۔ وہ اپنے لئے چائے نکال رہا تھا، اطمینان سے اس کام سے فارغ ہوا تھا، پھر منگ ہونٹوں سے لگا کر ایک سب لیا تھا۔

”آپ موسیٰ کو ابھی تک بچہ سمجھتے ہیں لالہ.....! مگر موسیٰ اب بچہ نہیں رہا۔“

اس کا لا پرواہ، بے فکر سا لہجہ اطلاع پیش لئے ہوئے تھا۔

”آئی نو.....! کہ تم بچے نہیں ہو۔ مگر تم کیا کرنے والے ہو.....؟ مجھے بتاؤ.....!“

ہارون نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جوس کا گلاس بھی واپس رکھ دیا تھا۔

”ابھی تو نہیں بتانے والا۔“

وہ بے نیازی سے کاندھے جھٹک کر بولا تو ہارون کی پیشانی شکن آلو ہو گئی تھی۔

”کل تم میرے روم میں آئے تھے.....؟ اس کے بعد میں نے دیکھا میری ڈائری.....“

”اوہ.....! سوری لالہ.....! وہ میں.....“

”موسیٰ.....!“

ہارون نے کرسی دھکیلی اور اٹھ کر دونوں ہاتھ نیل کی سطح پر جما کر ہلکا سا جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

”میں اپنی فیورٹ چیزوں کے متعلق بہت ایووشنل ہوں۔ تم یہ بات جانتے ہو۔ اس کے باوجود میں تمہیں دوبارہ بتا رہا ہوں تو اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے.....؟ تم سمجھ سکتے ہو۔“

ہارون کا لہجہ معمول سے ہٹ کر تنبیہی انداز لئے بے حد سرد تھا۔ ورنہ موسیٰ کو یاد نہیں پڑتا تھا اس نے کبھی موسیٰ سے اس طرح بھی بات کی ہو۔ وہ موسیٰ کے لئے مشفق، محبت کرنے والی ہستی تھی اور بس۔

”جی لالہ.....! آئی ایم سوری.....! آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“

موسیٰ نے آنکھیں چرا کر کہا تو ہارون کچھ کہے بغیر پلٹ کر کمرے سے چلا گیا۔ ماما خاموش بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

”تیرے پیلے ہوں گے ہاتھ کڑے! تیری ہو گئی کچی بات کڑے!“

تیرے من ہی من لڈو پھوٹیں اور آنکھوں سے برسات کڑے!“

تاریخ طے ہو گئی تو گھر میں شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ دوا کی خواہش تھی کہ شادی اسی گھر میں ہو۔ یوں پاپا نے فی الحال شہر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شادی کی ساری رسومات یہیں ہونا تھیں۔

ایسے میں جہاں سب کے حصے میں مصروفیت آئی تھی، اشعر نے بھی ایک کام ذمے لیا تھا۔ وہ تھا، فضلہ اور عاقب کو تنگ کرنے، زچ کرنے کا، جسے وہ بہت خوبی سے نبھا رہا تھا۔ ابھی بھی اس نے فضلہ کو دیکھتے ہی کچن میں ہی کھڑے ہو کر راگ الاپنا شروع کیا تھا۔ فضلہ نے ایسے گھورا مگر اس پہ خاک اثر ہونا تھا، سوگمن رہا۔

”ہے سانولا رنگ، نقش ٹیکھا، قد کا بڑا، منس مکھ، سوہنا سب دیکھ بھال کے ڈھونڈا ہے اب آگے تیری برأت کڑے!“

اک نند اور دو نٹ کھٹ دیور تینوں اسکول میں پڑھتے ہیں“

”یہاں تھوڑا مضائقہ ہے، مگر شاعری میں چلتا ہے۔“

وہ ذرا ساز کا اور دانت نکوس کر پھر سے کہنے لگا۔

”تیرے سر ساس کے ناں تھاں کو مانے سارا کڑے!“

سب اپنا آپ بھلا رکھنا سائیں سے خوب نبھا رکھنا

مردوں کے سر نہ نویں کچے کڑیوں کی کچی ذات کڑے!“

ہر وقت نماز، قرآن پڑھیں کم کالج کبھی بیچ نال کریں

میٹھا بولیں کہ اب ماں باپ کی ہے لاج تمہارے ہاتھ کڑے!“

کہتے ہیں پیدا ہوتے ہی بیٹی پردیسن ہوتی ہے

ہو اک دیوار ادھر چاہے یا پار سمندر سات کڑے!“

مت آنکھیں بھر بھر تک بیٹی تیرا جانا ہے برحق بیٹی

یہ حکم ہے اس کا اور اس کی ذات صفات کڑے!“

فضلہ کی آنکھیں جھپکتی دیکھ کر وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بزرگانہ انداز میں بولا تو فضلہ نے جھلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”بہت بدتمیز ہو.....! جیسے جیج میرے ابا ہونا.....؟“

فضلہ کی رنگت دھک گئی، وہ دانت نکالنے لگا۔ پھر کچن سے منہ نکال کر ایمان کو آوازیں دیتے ہوئے ہانک لگائی۔

”آئیں.....! ہم وہ والا گانا گاتے ہیں،

ساڈا چڑیاں دا چنبا اے
بابل اسان اڈ جانا“

”یہ گانا مجھے تو نہیں آتا، ویسے ضروری بھی نہیں ہے۔“

ایمان کمرے سے نکل کر چلی آئی تھی۔ ہاتھ میں زیور کا ڈبہ تھا۔ جولا کر فضلہ کے آگے رکھ دیا تھا۔
”تائی ماں کہہ رہی ہیں، یہ گلو بند پہن کر دکھا دو۔“

”کیوں بھئی.....؟ کیا ضرورت ہے.....؟ ایسے ہی ٹھیک ہے ناں.....!“
فضلہ گھبرائی اور اشعر کو ایک اور موقع مل گیا، اسے زچ کرنے کا۔

”ہاں تو کیا ضرورت ہے.....؟ ابھی تو عاقب بھائی بھی گھر پہ نہیں ہیں۔ وہ ہوتے تو کوئی فائدہ بھی ہوتا.....؟ کوئی افسانوی بچہ آتا چوایشن میں.....؟ خیر.....! آپ کوشش تو کریں، ابھی بھی ایسا حسین واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔ ادھر آپ اپنی مرمریں گردن سے اس گلو بند کو لپیٹیں، ادھر ٹھک سے عاقب بھائی کمرے میں آجائیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے ناں کہانیوں میں ایکی بھائی.....؟“

وہ شرارتا بولا تھا۔ آنکھیں شوخی کے احساس سے جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ فضلہ بے تحاشہ جھل ہو گئی۔
اسے مارنے کو دوڑی تھی مگر وہ ہاتھ آنے والا کہاں تھا.....؟

☆☆☆

فضلہ کی مہندی کی تقریب بہت شاندار رہی تھی۔ ایمان نے بلڈ ریڈ کلر کا بہت اسٹائلش سوٹ پہنا تھا جو اس کی دہکتی ہوئی رنگت پر بہت چمکا تھا۔ میچنگ کی ہلکی پھلکی جیولری اور مہک نے اس کی چھب ہی بدل ڈالی تھی۔ جب وہ فضلہ کو رسم کے لئے پنڈال میں لے کر آئی تو ولید حسن صحیح معنوں میں مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔
پیلے جوڑے اور ہم رنگ ٹھکناتی چوڑیوں کے ساتھ فضلہ بھی غضب ڈھا رہی تھی، مگر ایمان کا سن تو گویا شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ سب اس سے گانے کی فرمائش کرنے لگے۔ اس کی نگاہ ایمان پر جا ٹھہری اور الفاظ خود بخود گویا زبان پر آٹھہرے۔

”گوری کرت سنگھار گوری کرت سنگھار
بال بال موتی چکائے روم روم مہکار
مانگ سندور کی سندرتا سے چمکے چندن دار
گوری کرت سنگھار گوری کرت سنگھار“

پروین شا کر کے کلام کو اپنے جذبات کے ہم آہنگ بنا کر گایا تو ماحول میں اک سماں بندھ گیا۔ ایمان نے اس کی نگاہوں سے چھلکتے ہوئے رنگوں سے اپنا چہرہ رنگین ہوتا محسوس کیا تھا۔

”جوڑے میں جوہی کی بنی بانہ میں ہار سنگھار
کان میں جگمگ بالی پتہ گلے میں جگنو ہار
صندل ایسی پیشانی پہ بندیا لائی بہار
گوری کرت سنگھار گوری کرت سنگھار“

اس کے لبوں پہ دل آویز مسکان تھی اور آنکھوں میں محبت کو پالینے کا خمار۔ وہ جانتا تھا، اس وقت محفل میں موجود متعدد لوگوں کی نظریں انہیں ہی فوکس کئے ہوئے ہیں۔ مگر وہ کسی کو خاطر میں لائے بغیر ایمان کے دلکش روپ کو نگاہوں کے رستے دل میں اتار رہا تھا۔

”تیز کنار اس آنکھوں میں کجمرے کی دو دھار
گالوں کی سرخی میں جھلکے پردے کا اقرار
ہونٹوں پہ کچھ پھولوں کی لالی کچھ ساجن کے کار
گوری کرت سنگھار گوری کرت سنگھار
ہاتھوں کی اک اک چوڑی میں موبہن کی جھکار
سج چلے پھر بھی پائل میں بولے پی کا پیار
اپنا آپ دامن میں دیکھے اور شرمائے نار
نارک کے روپ کو انگ لگائے دھڑک رہا سنسار
گوری کرت سنگھار گوری کرت سنگھار“

تالیوں کی گونج میں اس نے گیت ختم کیا تو ایمان کے ہونٹوں پر بھی ایک مہکی ہوئی مسکان تھی۔ اشعر جو بینڈی یکم سے ان لمحات کو محفوظ کر رہا تھا، ایمان کو فوکس کرتے ہوئے بولا تھا۔

”ایمان.....! پلیز، آپ چل کر بھائی کے ساتھ بیٹھیں۔“
”کیوں.....؟“

ایمان چونکی تھی اس حکم پہ، وہ سب کے بیچ واقعی ہی کترائی تھی۔

”بھئی.....! یہ آپ کا گجرا جو بندھ نہیں رہا ہے، اسے بھائی گرہ لگا دیں گے اور میرے کیمرے کو ایک حسین منظر قید کرنے کا موقع میسر آ جائے گا۔“

اس کی بات پر جہاں ایمان کھیلائی، وہاں باقی سب کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔
”اوہہ.....!“

ایمان نے زور سے سر جھٹکا، گویا خجالت مٹائی تھی، اور فضلہ کو وہاں سے اندر لے جانے کے ارادے سے اٹھ گئی۔ ولید ایک خوب صورت چانس مس ہو جانے پہ دل مسوس کر رہ گیا۔

☆☆☆

”مصروف ہو دن رات تمہیں وقت کہاں ہے
تم مجھ سے کرو بات تمہیں وقت کہاں ہے
بے تابی دل کا تمہیں اندازہ نہیں ہے
سمجھو میرے جذبات تمہیں وقت کہاں ہے
تم پونچھو میری آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو
دیکھو یہ برسات تمہیں وقت کہاں ہے
بھولے سے ہی تم پوچھنے آ جاؤ میرا حال
اے گردش حالت تمہیں وقت کہاں ہے
وجود میں تڑپتے ہوئے ڈوب رہا ہوں
تھامو تم میرا ہاتھ تمہیں وقت کہاں ہے“

شادی خیریت سے انجام پائی، ساتھ ولید کی رواجی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تائی ماں دل گرفتہ سی تھیں، مگر چاہتیں تھیں، سب کچھ ہی اس کے ساتھ روانہ کر دیں۔ گاجر کا حلوہ، دیسی گھی، خبیری، اور جانے کیا کچھ، فضہ اور وہ بھی ان کے ساتھ لگی رہیں، مگر کام تھا ہی اتنا کہ سنتا ہی نہ تھا۔ اس وقت بھی وہ تائی ماں کے کہنے پہ ولید کے سوٹ کیس میں پکڑے رکھنے آئی تھی، جب وہ واش روم سے نکل کر اس کے پاس آڑکا۔ شکایتی لہجہ گویا احتجاج کر رہا تھا۔ ایمان نے سر اُچھا کر کے اسے دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”یہ شکوہ تو مجھے کرنا چاہئے آپ سے۔ ہزار دن غائب رہتے ہیں۔ میری تو بات چھوڑیں تائی ماں بھی آپ کی صورت دیکھنے کو ترستی ہیں۔“

اس جوابی شکوے پہ ولید خفت زدہ سا ہو کر سر کھجانے لگا۔

”پچھتا رہا ہوں یار.....! اگر میں نے مکمل شادی کروائی ہوتی تو رات بھر کو تو سیر ہوتیں۔ پھر میں تمہیں بتاتا کہ.....“

”اچھا.....! فضول باتیں مت کریں آپ.....!“

وہ اس کی بات کاٹ کر شرٹ کو تہہ لگاتے ہوئے بولی۔ چہرے پر اس کی شوخ نظروں نے سرخی پھیلا دی تھی۔

”ایمی.....! اب میرا اپنا دل ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔ اگر نکٹ نہ آگئے ہوتے تو میں کبھی نہ جاتا۔“ وہ جیسے خود سے الجھ رہا تھا۔ ایمان نے گہرا سانس کھینچ کر بیگ بند کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اپنی طرف سے تو میں نے ہر چیز رکھ دی ہے۔ پھر بھی ایک نظر ڈال دیجئے، اگر کوئی کمی ہوئی تو.....“

”کمی.....؟ ہاں.....! کمی تو ہے۔“

”کیا.....؟“

ایمان کی سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔

”تم.....! تمہاری کمی وہاں ہر لمحہ محسوس کروں گا۔“

اس کی نگاہوں میں اتنی چمک اور بھرپور تاثیر تھا کہ ایمان نے گہرا کر پلکیں جھکا لیں، اور اس کی سائیڈ سے ہو کر جانا چاہا تو ولید نے اس کی کلائی پہ اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تھی۔

”میرے ہم سفر! تیری نذر میں میری عمر بھر کی یہ دوستی

میرے شعر میری صداقتیں میری دھڑکنیں میری چاہتیں

تجھے جذب کر لوں لہو میں، میں کہ فراق کا نہ رہے خطر

تیری دھڑکنوں میں اتار لوں میں یہ خواب خواب رفاقتیں“

اس کے ہونٹ بہت آہستگی سے، بہت جذب سے کہہ رہے تھے۔ اس کی آواز کی گہیرا نے ایمان کے احساسات کو گداز کیا تھا۔ اس مرتبہ فاصلہ ایمان نے کم کیا تھا۔ وہ اس کی ہانہوں کے حصار میں مقید اس کے سینے پہ سر رکھے اس کی دھڑکنوں کو سنتی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی تھی۔

”اس طرح مت کرو ایمان.....! پلیز.....!“

ولید نے اس کے آنسوؤں کی نمی کو اپنے سینے میں جذب ہوتا محسوس کیا تو مضطرب ہونے لگا۔ ایمان نے خود کو کمپوز کیا تھا اور آہستگی سے اس سے الگ ہو کر ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر صاف کرنے لگی۔

”دھینکس فاروس آنر جناب.....!“

اس کی نگاہیں شوخ تھیں۔ ایمان نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ ہنس رہا تھا۔

”کمال ہے جناب.....! میرا جانا معجزہ ہو گیا۔ میری جسامتوں پہ آگ بگولہ ہونے والی محترمہ از خود

میرے گلے لگ رہی ہیں.....؟“

”امیزنگ.....!“

اس کی شوخی بھری مسکان پر ایمان ایک دم حیا سے سرخ پڑی تھی، گال تپ اٹھے۔

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں.....؟“

وہ اپنی شرمندگی کو غصے میں مغلوب کر کے اُلٹا اس پر چڑھائی کرنے لگی۔

”میری مجال.....؟ میں تو جناب.....! آپ کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔“

مسکراہٹ ضبط کرتا ہوا وہ ڈرنے کی اداکاری کرنے لگا۔ ایمان جھلا کر پلٹنے لگی تھی کہ وہ لپک کر اس کے راستے میں آ گیا۔ اس کی استعجابی و سوالیہ نگاہوں کے جواب میں سر کھجا کر بولا تھا۔

”ابھی اچھا موقع ہے، اگر مزید رونے دھونے کا پروگرام ہے تو میرا کاندھا حاضر ہے۔ پھر ایسا چانس

ملے نہ ملے۔“

شریر، مبہم لہجہ، نظروں کی شوخ چمک، گستاخ ارادے۔

ایمان اتنی جھلائی کہ اسے سامنے سے دھکیل کر بھاگ نکلی۔

”افوہ.....! بے حس، مطلب پرست لڑکی.....! صرف تمہارا ہی تو جدائی سے آنسو بہانے کو جی نہیں

چاہتا.....؟ میرا بھی ایسا کوئی ارادہ ہو سکتا ہے۔“

اس نے دروازے سے نکلتے ہوئے اس کی شوخی سے بھرپور آواز سنی تھی، مگر کان دھرے بغیر دہلیز پار

کر آئی۔

☆☆☆

”قید میں گزرے گی جو عمر بڑے کام کی تھی

پر میں کیا کرتی زنجیر تیرے نام کی تھی

جس کے ماتھے پہ میرے بخت کا تارہ چمکا

چاند کے ڈوبنے کی بات اسی شام کی تھی

یہ ہوا کیسے اڑا کے لے گئی آج کل میرا

یوں ستانے کی عادت تو میرے گھٹام کی تھی“

وہ یوں بیٹھی تھی جیسے سب کچھ کو خالی ہاتھ ہو۔ عجیب سی کیفیت رقم تھی چہرے پر، عجیب خالی پن تھا

آنکھوں میں۔ کوئی دیکھ لیتا تو چونک اٹھتا مگر صد شکر کہ اس بل اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔

ولید چلا گیا تو ماما پاپا کے ساتھ وہ بھی واپس آگئی تھی اپنے گھر، جہاں اسے جاتے اور واپسی وہاں آنے کی خواہش تھی، اس نے کتنا وادیا مچایا تھا۔ مگر جب یہ خواہش پوری ہوئی تھی تو اس کی حیثیت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

”ماما.....! فضلہ کو ہی بلوالیں ناں کچھ دنوں کو، کچھ دل تو لگے۔“

اس نے گھبرا کر ماما سے کہا تھا اور وہ ہنس پڑی تھیں۔

”اگر پھر بھی دل نہ لگا تو.....؟ سویت ہارٹ.....! آپ کے دل کا اطمینان تو ولید حسن لے گیا ہے اپنے ساتھ، سات سمندر پار۔“

”ارے.....!“

وہ ماما کی بات پر اتنا جھینپی تھی کہ پھر ان سے یہ فرمائش ہی نہیں کی تھی۔ چند دن گزرے اور اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو گیا اور وہیں اس کی ملاقات موسیٰ سے ہوئی تھی۔ وہ یہاں کے ساتھ پہلی کلاس لے کر نکلی تھی جب وہ اچانک اس کے سامنے آتا اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”کیسی ہیں آپ.....؟“

اور ایمان جو پہلی نگاہ میں اسے پہچان نہیں پائی تھی، کسی قدر استعجاب سے اسے نکلتی رہ گئی تھی۔

”یقیناً آپ نے پہچانا نہیں ہوگا۔ آئی ایم موسیٰ کا دوانی.....! آپ کے گھر آئے تھے ناں ہم.....؟“

وہ اسے یاد دل رہا تھا اور وہ یاد کرنے کے باوجود الجھن و حیرت میں مبتلا تھی۔

”جی.....! مگر اس وقت اس جگہ پہ روکنے کا مقصد.....؟“

ایمان کے لہجے کی سختی نے موسیٰ کے چہرے کے تمام تر نرم تاثرات کو لحظہ بھر میں غائب کر دیا تھا۔

”سارے مقصد آپ سے ہی تو ہیں میم.....! ویسے سسر کی شادی مبارک ہو.....! ہمیں نہ بلا کر آپ نے غیریت کی انتہا کر دی۔ جہاں مستقبل میں روابط اور تعلقات قائم ہونے ہوں، وہاں ایسی بے رنجی نہیں برتی جاتی۔“

جہاں قائم ہونے ہوں وہاں ناں.....؟ یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے مسٹر.....! پاپا آپ لوگوں کو منع کر چکے ہیں، پھر اس قسم کی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی ہے۔ مائنڈ اٹ.....! آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کیجئے گا۔“

ایمان نے بے رنجی اور نخوت سے کہہ کر قدم بڑھانا چاہے تھے کہ وہ ایک بار پھر راستے میں آ گیا تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ نے بات ختم کی اور بات ختم ہوگئی.....؟ نو.....! نیور.....! ہارون کا دونی کسی عام سے انسان کا نام نہیں ہے۔ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں، وہ ان کی ہو جاتی ہے۔“

اس کی آنکھیں ایک دم دہک اٹھیں۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو ایمان کے ساتھ کھڑی یہاں کو بھی ٹھنکا گیا تھا۔ ایمان کو اس کی بات نے سر تا پا جھلسا کے رکھ دیا۔ وہ ایک دم آؤٹ ہوئی تھی۔

”لیکن ایمان ارتضیٰ شاہ بھی کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ یہ بات آپ بھی سمجھ لیں اور اپنے بھائی کو بھی سمجھا دیجئے گا۔ میں آپ سے پھر کہوں گی، آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کیجئے گا۔“

وہ بولی نہیں، غرائی تھی۔ مقابل کے لہجے کا تکبر و نخوت اسے مشتعل کرنے کو کافی ثابت ہوا تھا۔ اسے گویا ساری زندگی کا غصہ اسی لمحے میں آیا تھا۔

”ہم راستہ نہ بھی روکیں تو آپ کے ندام رستے ہماری طرف آتے ہیں۔ بہت پراؤڈ ہیں آپ.....! مگر آپ ابھی ہمیں جانتی نہیں ہیں۔ ہم ایک بار جو کہہ دیں، وہ کروانا بھی جانتے ہیں۔ یاد رکھئے گا۔“

انگلی اٹھا کر باور کرتا ہوا وہ لمبے ڈگ بھرتا پلٹ کر دُور ہوتا چلا گیا تھا۔ جبکہ وہ دونوں وہیں کھڑی رہ گئی تھیں۔ ایمان نے ہونٹ جھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں طیش کی حدتیں تھیں۔ ہوا اس کے اطراف میں خشک پتے اڑا رہی تھی، جب یہاں نے بہت تشویش بھری نظروں سے نکتے اس سے وہ سوال کیا تھا، جس سے وہ اس پل خود کترا رہی تھی۔

”کون تھا یہ.....؟ اور یہ اس قسم کی دھمکیاں کیوں دے رہا تھا.....؟“

ایمان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خائف نہیں تھی مگر ڈسٹرب ضرور ہوگئی تھی۔ جیسی باقی کی تمام کلاسز رنجیکٹ کرتی، گھر لوٹ آئی تھی۔

اور اگلے دن وہ اس بات پر سر جھٹک چکی تھی۔ مگر یہ سر جھٹکنے والی بات نہیں تھی کہ اگلے روز جب وہ اسے یکسر فراموش کر چکی تھی، تب وہ پھر اسی دھڑلے، نخوت اور اعتماد کے ساتھ اس کے روبرو تھا۔

”پھر کیا سوچا آپ نے.....؟“

ایمان کا ماتھا اسے دیکھتے ہی ٹھنکا تھا۔ اس وقت وہ کینٹین میں تھی اور ٹیبل پہ اکیلی تھی۔ اتفاق تھا کہ آج یہاں یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔

”یہ بات میرے نزدیک اتنی اہمیت ہرگز نہیں رکھتی تھی کہ میں اس پر سوچنا گوارہ کرتی۔“

اسے دیکھتے ہی گویا ایمان کا طیش اُٹھ آیا تھا۔ موسیٰ نے اس کے حقارت زدہ تاثرات کو بہت گہری نگاہ سے دیکھا تھا۔ پھر نگاہ کا زاویہ بدل کر اطراف میں نظریں دوڑاتا ہوا بظاہر بے نیازی سے بولا تھا۔

”اس طرح کا رویہ مت رکھیں کہ بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے۔“

”میں تم سے ڈرتی نہیں ہوں۔ دھمکیاں مت دو، ورنہ میں تمہاری شکایت پرنسپل صاحبہ سے کر دوں گی۔“

اس کے لہجے کی سنگین دھمکی پہ وہ غضب سے بھر کر بولی اور ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر اپنا بیگ اٹھانا چاہا تو یہ دیکھ کر اس کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں ابھر آئی تھیں کہ موسیٰ نے اپنا بھاری بھر کم ہاتھ اس کے بیگ پر رکھ کر گویا اس کی اس کوشش کو ناکامی سے دوچار کر دیا تھا۔

”بہتر ہوگا میم.....! کہ آپ سیدھے طریقے سے ہی مان جائیں۔ میرا آپ کا احترام کا رشتہ ہے، اور میں کوئی گستاخی آپ کی شان میں کرنا نہیں چاہتا۔“

اس کا کھنور لہجہ بلا کا سرد اور سفاک تھا۔ ایمان کی ریزہ کی ہڈی میں پہلی بار خوف کی لہر اٹھی۔ چند ثانیوں کو وہ حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

اگلے دن وہ دانستہ یونیورسٹی نہیں گئی۔ وہ کبھی اس بات کو لے کر اس قدر مضطرب نہ ہوئی۔ اگر جو ولید حسن اس کی زندگی میں اپنی تمام تر اہمیت کے ساتھ شامل نہ ہو گیا ہوتا۔

وہ شام کا وقت تھا، وہ ماما کے ساتھ لوگ روم میں چائے پی رہی تھی جب ملازمہ اس کا سیل فون اٹھائے چلی آئی تھی۔

”چھوٹی بی بی.....! آپ کا فون بج رہا ہے۔“

اس نے موبائل لے کر اسکرین پر نگاہ کی۔ جلتی بجتی اسکرین پر ”ولید کالنگ“ کے الفاظ دکھ رہے تھے۔
”السلام علیکم.....!“

اس نے کال ریسیو کی تو ولید کی چپکتی، پرجوش آواز جیسے اس کے اندر زندگی کا احساس بن کر اتری تھی۔
”وعلیکم السلام.....! کیسے ہیں.....؟“

وہ بے اختیار مسکرا دی۔

”آپ کے بغیر جیسے ہو سکتے ہیں، ویسے ہی ہیں۔“

جواباً وہ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگا اور وہ جھینپ کر ہنس دی تھی۔

”کیا ہو رہا تھا اس وقت.....؟ کیسے یاد آگئی.....؟“

”ہمیں تو ہر وقت آپ کی یاد آتی ہے۔ تم سناؤ جان من.....! تم کیا کرتی رہتی ہو.....؟“

”کم از کم آپ کی طرح سے ہر وقت آپ کو یاد نہیں کرتی۔“

اس کا لہجہ صاف صاف چڑانے والا تھا۔ ولید حسن نے جواباً ٹھنڈا سانس بھرا اور گویا ہوا۔
”ہاں صحیح کہتی ہیں میم کہ

کسی کا عشق، کسی کا خیال تھے ہم بھی
گئے دنوں میں بہت با کمال تھے ہم بھی
ہماری کھوج میں رہتی تھیں تتلیاں اکثر
کہ اپنے شہر کا حسن و جمال تھے ہم بھی
زمین کی گود میں سر رکھ کر سو گئے آخر
اس کے ہجر میں کتنے ٹڈھال تھے ہم بھی

اور مزید یہ کہ

کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں مجھے
تیرے سوا کسی سے محبت نہیں مجھے
رہتا ہے مجھے بس دن رات تیرا خیال
میں تجھ کو بھول جاؤں طاقت نہیں مجھے
کل شب تمہاری یاد میں آنسو چھلک پڑے
اب اور کچھ بھی کہنے کی حاجت نہیں مجھے
کس کو سناؤں جا کے میں اپنا حال دل
تو نے تو کہہ دیا ہے فرصت نہیں مجھے“

”افوہ.....! سوری بھئی.....! آپ نے تو دل پہ ہی لے لیا۔ اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میں بھی
آپ کو یاد کرتی ہوں۔“

وہ ہنسنے لگی تھی۔ ولید نے ایک اور سر د آہ بھری۔

”میں کیسے یقین کروں بھلا.....؟“

”اب آپ کو یقین دلانے کو مجھے کیا کرنا پڑے گا.....؟“

”کوئی دیوانہ نذر کرو ہماری۔“

وہ پھیلا اور ایمان پھنس گئی۔

”اُف.....! اتنی کڑی سزا.....؟“

اس نے مصنوعی خفگی سے کہا اور ولید خفا ہونے لگا۔

”یہ سزا ہوگی تمہارے لئے.....؟“

”نہیں.....! سعادت ہوگی۔“

وہ ہنس پڑی۔ بڑی خوش گوار، پیاری سی ہنسی تھی، جس میں ولید کا قہقہہ بھی شامل ہو گیا۔

”چلو پھر اس سعادت کو حاصل کرو۔ آپ فون بند کریں، میں سینڈ کرتی ہوں آپ کو۔“

”نہیں.....! خود سناؤ.....!“

ولید نے صاف انکار کیا تو وہ بسوری تھی۔

”مجھے شرم آئے گی ولید.....! ماما سامنے بیٹھی ہیں۔“

اور ولید نے خاصی دیر تک اس کا ریکارڈ لگایا تھا، پھر مانا تھا۔ اس کے فون بند کرتے ہی ایمان

مسکراتے ہوئے نظم ناپ کرنے لگی۔

”بہت یاد آنے لگے ہو

پچھڑنا تو ملنے سے بڑھ کر

تمہیں میرے نزدیک لانے لگا ہے

میں ہر وقت خود کو

تمہارے جواں بازوؤں میں پکھلتے ہوئے دیکھتی ہوں

میرے ہونٹ اب تک

تمہاری محبت سے نم ہیں

تمہارا یہ کہنا غلط تو نہ تھا کہ

میرے لب تمہارے لبوں سے ہی گلزار ہیں

تو خوش ہو

کہ اب تو میرے آنسنے کا بھی یہی کہنا ہے

میں ہر بار بالوں میں گنگھی اُدھوری ہی کر پار ہی ہوں

تمہاری محبت بھری انگلیاں روک لیتی ہیں مجھ کو

میں اب مانتی جا رہی ہوں

میرے اندر کی ساری اُمیدیں اور باہر کے موسم

تمہارے سبب سے تمہارے لئے تھے۔

اس نے ولید کے نمبر پہ یہ نظم سینڈ کی اور پھر کچھ سوچ کر مزید ناپ کرنے لگی۔

”ورق ورق یہ تیری عبارت، تیرا فسانہ، تیری حکایت

کتاب ہستی جہاں سے کھولی، تیری محبت کا باب نکلا“

اس نے یوں ہی مسکراتے ہوئے یہ شعر بھی ولید کو سینڈ کیا ہی تھا کہ اسی پل اس کے سیل پہ کسی انجان

نمبر سے کال آنے لگی۔ اس نے دیکھا، ماما اسے مصروف پا کر وہاں سے اٹھ کر جا رہی تھیں۔ اس نے چائے کا

مگ اٹھاتے ہوئے مصروف سے انداز میں کال پک کی تھی۔

”السلام علیکم.....!“

اجنبی آواز، شائستہ لہجہ، وہ قدرے چونکی۔

”وعلیکم السلام.....! جی فرمائیے.....!“

اس کے انداز میں الجھن تھی۔

”اجی.....! ہم کیا عرض کریں.....؟ فرمانا تو آپ نے ہے۔“

دوسری جانب سے بڑے ہی انداز سے کہا گیا۔ ایمان کے اعصاب کو دھچکا لگا تھا۔ اس نے سیل فون

کان سے ہٹا کر یوں دیکھا، بلکہ گھورا جیسے سیل فون نہ ہو، کال کرنے والا بدتمیز ہو۔

”آئی ایم سوری.....! میں نے آپ کو پہچانا نہیں، کس سے بات کرنا ہے آپ کو.....؟“

اب کے اس کالج لہجہ کڑا تھا۔ دوسری جانب گہرا سانس بھرا گیا۔

”موسیٰ کا دونی.....! آپ کے ہونے والے دیور۔ آج یونیورسٹی نہیں آئیں آپ.....؟ ہم انتظار کی

زحمت میں مبتلا رہے۔“

اعتماد قابل دید تھا، مگر ایمان کو اس کے الفاظ نے آگ لگا دی تھی۔

”تم ساری زندگی بھی اس زحمت میں مبتلا رہو تو میری جوتی کو پرواہ نہیں ہے لعنتی.....! پیچھا چھوڑ دو میرا۔“

شدید غصے کی لہر نے اس کا دماغ دھکا ڈالا تھا۔ وہ قہر بھرے انداز میں جو منہ میں آیا، بولتی چلی گئی۔

”دھیرج میم.....! دھیرج.....! میں نے اسی روز بھی آپ کو سمجھایا تھا کہ ہمیں آپ کی عزت کرنا اچھا

لگتا ہے۔ ایسا برہم رویہ اپنائیں گی تو کہیں آپ کو پیچھتا نا نہ پڑ جائے۔“

ایمان اتنا جھلائی کہ سلسلہ منقطع کر ڈالا۔ اس کا موڈ اتنا خراب ہوا تھا کہ ولید کے مسج بھی نظر انداز کر

دیئے اور اس کی مزید بدتمیزی سے بچنے کی غرض سے سیل آف کر کے ایک سمت ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

سڑک کنارے ایک قطار سے آگے کچنار اور سنبل کے درختوں سے ٹوٹ کر گرتے خشک پتے اس کے

پیروں تلے آکر چر جائے۔ موسم خراں آگیا تھا۔ راتیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں، لیکن سورج میں ابھی تک حدت باقی

تھی۔ بڑا سا سرخ گولامین اس کے سر پر تھمتاتا اپنی تیز اور تند شعاعیں اس کو تاک تاک کر مار رہا تھا۔

وہ چلتے چلتے بے خیالی میں رُک گئی اور درخت کے تنے سے ٹیک لگائی۔ سیاہ کھڑوں کی ایک بے

ترتیب قطار درخت کے تنے کے گرد کھودی ہوئی باریک مٹی کے ڈھیر پر کسی کام میں مصروف تھی۔ وہ بے دھیانی

میں انہیں نکلنے لگی۔ کھڑے اپنی تیز رفتاری میں اس کے پیروں کے درمیان سے گزرتے اپنا راستہ بنا رہے تھے۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی، کل اس پل اس پہ کیا آفت ٹوٹی تھی.....؟ اسے یاد آیا اور دل بھرانے لگا۔

حسب معمول وہ یونیورسٹی کے گیٹ سے نکل کر باہر آئی تھی۔ روڈ پر اپنی گاڑی کی تلاش میں نگاہیں

دوڑاتے اس کے گمان تک میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یوں دن دیہاڑے اتنے دھڑلے سے اسے اغواء بھی کیا

جاسکتا ہے۔ جس پل سفید پراڈو اس کے بے حد نزدیک آکر رُکی، تب تک بھی وہ خود پر بیت جانے والی افتاد

سے بے خبر رہی تھی۔ پراڈو کا دروازہ کھلا تھا اور اگلے ہی لمحے اسے بازو سے پکڑ کر بہت بے دردی سے اندر

گھسیٹ لیا گیا تھا۔

اسے نہیں پتا تھا اتنے بے شمار لوگوں کو اس واردات کی خبر بھی ہو سکتی تھی کہ نہیں.....؟ اسے تو یوں خبر نہ ہو

سکتی تھی کہ اسے اندر گھسیٹنے ہی کسی طاقتور دوا کے ایک پف سے ہی اس کے حواسوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

دوبارہ ہوش آیا تو وہ جس کمرے میں موجود تھی، اس میں زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ کمرے میں

خواب آور مدہم اندھیرا تھا، ریڈ کارپٹ، بادامی ہر ہرے پردے، کھڑکیوں، دروازے کے اطراف میں بہت

خوب صورتی سے سیٹھ گئے تھے۔ بادامی مخملیں صوفے جن پہ سرخ سلکی کشن بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ جس

بیڈ پہ وہ لیٹی تھی، اس پر سرخ اور گولڈن بہت خوب صورت پرنٹ کی ریشمی جھار والی بیڈ شیٹ بچھی ہوئی تھی۔

ایمان کی آنکھ کھلی تو جیسے جیسے اس کا ذہن بیدار ہوتا گیا، اسی تیزی سے وحشت اس کے اندر سرسرائی

تھی۔ بیڈ سے اُترتے ہوئے اس نے سب سے پہلے اپنے وجود کے گرد دوپٹے کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تو اس

کا دل جیسے لمحہ بھر کو دھڑکنے لگا۔ خود میں سمیٹے ہوئے اس نے دوپٹے کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو بیڈ کے

سرہانے پڑا دوپٹہ نظر آیا تو جھپٹ کر اٹھاتے ہوئے کھول کر شانوں پہ پھیلا یا۔ پھر پلو سے سر ڈھانپ کر لرزاتے

دل کے ساتھ ہر اسان نظروں سے اٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

کمرے کا دروازہ باہر سے مضبوطی سے بند تھا جس پہ دستک دیتے اس کے ہاتھ شل ہونے لگے، مگر

اس کی پکاروں اور دستکوں کے جواب میں کوئی رسپانس سامنے نہیں آیا تھا۔

”کون.....؟ کون کر سکتا ہے میرے ساتھ ایسا.....؟“

گھنٹوں کے بل وہیں دروازے کے پاس بیٹھتے ہوئے بے بسی کی انتہا پہ پہنچتے ہوئے اس نے آنسو

بہاتے ہوئے پہلی بار یہ اہم سوال خود سے کہا تھا۔ آنے والے وقت کا ہر اس اسے دہشت میں مبتلا کر رہا تھا۔

”ایک اغواء شدہ لڑکی کی معاشرے میں حیثیت.....؟“

”اس کے ساتھ معاشرے کا سلوک.....؟“

”اس کے والدین کی بے بسی.....؟“

”رشتہ داروں کی نظریں.....؟“

”سب سے بڑھ کر ولید حسن کا رویہ.....؟“

وہ ایک ایک بات کو سوچتی متوجش ہوتی ہر اس میں مبتلا ہوتی رہی تھی، جب دروازے کے باہر کھٹکا ہوا اور اگلے پل دروازہ کھول کر کوئی اندر آ گیا۔ ایمان کی نگاہیں آنے والے کے چمکدار جوتوں سے بہت سرعت سے اوپر اٹھیں، جیسے ہی اس کے چہرے پر پڑیں تھیں، اسے گویا سکتہ ہو گیا تھا۔
”قتنی بے بس لگ رہی ہیں اس وقت، قسم سے آپ کو یوں مجبور، لاچار کرنے کا تو میرا بھی ارادہ نہیں تھا، مگر مجبوری.....“

موسیٰ کا دوانی کے چہرے پر بہت جتا دینے والی مسکراہٹ تھی جو ایمان کو مکروہ لگی تھی، بے حد مکروہ۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی لمحے سکتے پہ اس کا طیش، غم و غصہ غالب آ گیا تھا۔
”اتنی جرات.....؟ تمہیں اندازہ ہے تم کیا کر چکے ہو موسیٰ.....؟“
بہر حال اسے رو برو پا کے اس کے خدشات خوف اور سراسیمگی میں کمی واقع ہوئی تھی۔
”آئی نو.....! بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے اور بتایا ہے ناں، مجبوراً.....! ورنہ آپ کچھ سننے پہ آمادہ کہاں ہیں.....؟“

وہ اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھتا ہوا بولا تو ایمان نے ہونٹ بھیج لئے تھے۔
”آپ جب تک آمادگی ظاہر نہیں کریں گی، یہیں رہیں گی، ڈونٹ دری.....! یہاں آپ کو کسی قسم کی پریشانی.....“
”کس بات کی آمادگی.....؟“

ایمان نے بھڑک کر اس کی بات کاٹ دی، تب وہ بڑے دل جلانے والے انداز میں مسکرایا تھا۔
”آپ کو پتا تو ہے۔ خیر.....! میرے منہ سے سننا چاہتی ہیں تو پھر سنئے.....!“
وہ بھنوں کو جنبش دے کر کاندھے جھٹک کر بات کرتا اس کا ضبط آزار ہا تھا۔
”آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ ہم آپ کے ہاں لالہ کا پرپوزل بھیجیں تو آپ انکار نہیں کریں گی۔ سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا کہ اس وقت آپ بہت نازک پجوائیشن میں ہیں۔ گویا آپ کی فیملی کی عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

اس نے بڑا تاک کر نشانہ لگایا تھا۔ ایمان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے ہونٹ بھیج کر جلتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔
”تم اتنے کم ظرف اور گھٹیا ہو سکتے ہو، میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔“
اس کا گلا ایک دم بھرانے لگا۔ صورت حال کی سنگینی نے اسے یوں بے بس کیا تھا جس کا تصور بھی اس کے پاس نہیں تھا۔

”مجھے جانے دو.....! میں تمہیں سوچ کر جواب دوں گی۔“
کچھ توقف کے بعد اس نے شعوری کوشش سے اپنے لہجے کے اشتعال پہ قابو پکڑ کر دھیمے انداز سے کہا
تو وہ یوں ہنسا جیسے اس کا تمسخر اڑا رہا ہو۔
”پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے.....؟ بچوں کا کھیل ہے یہ.....؟“

وہ اسے گھورنے لگا۔ پھر اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور اپنے اور اس کے بیچ حائل فیمل کے گلاس پہ اسے رکھ کر انگشت شہادت کی مدد سے اسے ایمان کی طرف اسٹرائیک کیا تھا۔
”یہ قانونی کاغذ ہے، ایگریمنٹ سمجھ لیں۔ اس پر عہد دیں مجھے کہ آپ ہارون کا دوانی سے شادی پہ خوشی رضامند ہیں۔ نیچے اپنے سائن کریں تب یہاں سے نکلنے کی صورت بن سکتی ہے، بصورت دیگر.....“
اس نے بات اُدھوری چھوڑ کر سرد و سفاک نظریں اس پر جمادیں۔ ایمان کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ بھی کہتا تو وہ جان سکتی تھی۔

”یہ پاسپل نہیں ہے۔“
وہ اس کی بات سن کر بھڑک اٹھا تو ایمان ایک دم ہراساں ہوتی ملتی ہو کر گر گرائی تھی۔
”دیکھو.....! میری بات سنو.....! میرے جس کزن سے پاپا نے آپ لوگوں کا تعارف کروایا تھا، اس سے پچھلے دنوں میرا نکاح ہو چکا ہے۔ تم خود سوچو، یہ پاسپل ہے.....؟“
موسیٰ کا دوانی نے چونک کر، ٹھٹھک کر یوں اسے دیکھا گویا اس کی بات کی صداقت کا اندازہ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگانا چاہ رہا ہو، در جب اسے یقین آیا تھا تو گویا شعلوں میں گھر گیا تھا۔ ایمان کو اس کی آنکھوں میں اتری غضب کی حدتوں سے خوف محسوس ہوا تھا۔

”اگر یہ سچ ہے تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دیسے صرف نکاح ہی ہوا ہے ناں.....؟“
اس کے سرد لہجے میں غراہٹ در آئی تھی۔ ایمان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔
”بکواس بند کرو.....!“
اس کا ضبط چھٹکا تو وہ چیخ پڑ تھی۔ موسیٰ چونک گیا، ٹھٹکے ہوئے انداز میں اس کا چہرہ دیکھا، بغور دیکھا اور پھر ایک دم زور سے ہنس پڑا۔ ایمان کو اس کی دماغی حالت پہ ایک پل کو شبہ محسوس ہوا تھا۔
”بہت محبت کرتی ہیں اس سے.....؟“
ایمان نے دیکھا، اس کی سرخ انگاروں کی مانند دہکتی آنکھوں میں ایک سردی کیفیت اتر رہی تھی۔ وہ لرزی لگی۔

”اگر چاہتی ہیں کہ وہ زندہ رہے تو پھر اس سے الگ ہو جائیں ایمان.....! یہی بہتر ہے آپ کے لئے.....! میرے لالہ دوسری مرتبہ بے مراد رہ جائیں، یہ موسیٰ کا دوانی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ میری اپروچ سے کچھ آگاہ ہو گئی ہیں، بہت زیادہ اس وقت ہوں گی جب آپ یہ جانیں گی کہ آپ کے وہ رائٹ مین، کیا نام ہے ان کا.....؟ خیر.....! جو بھی ہو، کسی دن اچانک غائب ہو گئے ہیں۔“
اس کے سفاک لہجے میں اتنی سنگینی، اتنی جنون خیزی اور تنفر تھا کہ ایمان کی روح لرز اٹھی تھی۔ مگر بظاہر خود کو مضبوط بنانے کو بولی تھی۔

”وہ آؤٹ آف کنٹری ہیں۔ تم ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے ہو۔“
اس کے لہجے میں موجود نفرت نے موسیٰ کے ہونٹوں پر زہر خند بکھیر دیا تھا۔
”یعنی آپ چیلنج کر رہی ہیں میری اپروچ کو.....؟ اوکے.....! فائن.....! اب آپ کو یہاں روکنے کا

جواز ختم ہوتا ہے۔ اسی عزت و احترام کے ساتھ آپ کو واپس چھوڑوں گا، مگر اس یقین کے ساتھ کہ آپ دوبارہ یہاں تشریف لائیں گی۔ آپ کے تمام جملہ حقوق لالہ کے نام محفوظ ہو چکے ہوں گے۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ اٹھا تو اس کے انداز میں اطمینان تھا، یہی اطمینان ایمان کو مضطرب کر گیا تھا۔ وہ بے اختیار تڑپ کر اس کے راستے میں آئی تھی۔

”کیا کرو گے تم ولید کے ساتھ.....؟“

”اچھا.....! تو موصوف کا نام ولید ہے.....؟ کچھ نہیں.....! بس آپ کو لالہ کے لئے فارغ کرنے کی خاطر راستے سے ہٹانا ہوگا، یعنی قتل.....!“

وہ تاؤ دلانے والے انداز میں کہہ کر مسکرایا تو ایمان نے فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھا۔ اسے لگا تھا جیسے اس کی ٹانگیں ایک دم بے جان ہو گئی ہوں۔

”آئیے.....! آپ کو واپس چھوڑ آؤں۔“

وہ رک کر اس کے آگے بڑھنے کا انتظار کرنے لگا، مگر ایمان نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتی رو پڑی تو موسیٰ نے نخوت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”ابھی کیسے یقین کر لیا آپ نے میری بات کا کہ جو میں نے کہا ہے، اسے پورا بھی کر گزروں گا.....؟“

ابھی میں آپ کو ثبوت پیش کر دیتا، تب آپ اپنی رائے سے نواز تیں ناں.....!“

وہ ٹھنک کر بولا تھا۔ ایمان نے آنسوؤں سے جل تھل ہوتی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ پھر گلوگیر آواز میں بولی۔

”میں نے کہا ناں، تم ایسا کچھ نہیں کرو گے، میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔“

اس کا ہر انداز ہارا ہوا تھا۔

”اچھا.....! کیا کریں گی آپ.....؟“

موسیٰ نے اس کے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے گویا بادل خواستہ پوچھا۔

”میں ان سے طلاق لے لوں گی، بلیومی.....! مگر پلیز.....! کچھ وقت دیں مجھے۔“

سارا طفلہ، سارا غرور بھلائے وہ گڑگڑا رہی تھی تو وجہ محبت کی بے بسی تھی۔ وہ بے بسی، وہ خوف، انداز بدل گیا تھا، جب اسے پتا چلا تھا کہ ولید حسن اس کے لئے اہمیت اختیار کر گیا ہے تو اس نے اسے کھونے کے خوف سے اپنی آنا سے ہاتھ چھڑا لیا تھا، اور اب جبکہ وہ اس کی زندگی کو خطرہ لاحق محسوس کر رہی تھی، تب اس نے اسے کھونے کے خوف سے اس سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔

”میں آپ کی بات کا یقین کیسے کروں.....؟“

وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے پرنخوت انداز میں بولا۔ ایمان کی شکست، ایمان کی گڑگڑاہٹ، اس کا حد سے بڑھا ہوا خوف، اس کے اندر تسکین اور تفاخر کے کتنے دروا کر رہا تھا، یہ موسیٰ ہی جانتا تھا۔

”تمہیں یقین آجائے گا، جب میں ان سے ڈائیورس لوں گی۔ لیکن مجھے تھوڑا وقت چاہئے۔“

وہ اسی بلتچی، ہارے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ تب موسیٰ نے گویا اس پہ احسان جتلاتے ہوئے کاندھے اچکا کر اس کی بات مان لی تھی اور اسے اسی راز داری اور خاموشی کے ساتھ واپس اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دیا گیا، اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو سکی کہ ان چند گھنٹوں میں اس پہ کیا قیامت ٹوٹی اور اس نے کیا کچھ ہار دیا تھا.....؟

☆☆☆

اُداس موسم میں زرد پتے

منتظر ہیں بہار تیرے

نہ جانے کتنی رزتوں سے پیاسے

یہ دشت تم کو بلا رہے ہیں

کبھی تو لوٹو، کبھی تو پلٹو

کہ زندگی میں ویرانیاں ہیں

بناتمہارے یہ موسموں کی اُداسیاں دیکھو

کبھی ہنسائیں کبھی رلائیں

تم ہی کہو، اب کیا کریں ہم

یاد رکھیں یا بھول جائیں

اس نے چپ اوڑھ لی تھی۔ ولید سے ہی تعلق نہیں توڑا تھا، یہاں سے بھی منہ پھیر لیا۔ جو فیصلہ کیا تھا، وہ جان لیوا تھا۔ اس نے سیل آف کر دیا تھا تا کہ ولید کال نہ کر سکے۔

وہ بے حد پریشان تھا۔ فون پہ فون کرتا، ماما سے، پاپا سے، نصہ سے، عاقب سے اس کی خاموشی کی وجہ

پوچھ پوچھ ہار گیا اور وہ سب اس سے۔ مگر اس کی چپ ٹوٹنے والی ہی نہیں تھی۔ سب زچ ہو گئے۔

اس وقت اس نے یوں ہی سیل فون آن کیا تو ولید کے لاتعداد میسجز تھے۔ شکوؤں سے بھرے،

شکایتوں سے بوجھل۔ وہ اس کی خاموشی اور خفگی پہ حیران تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے میسجز پڑھتی گئی، ڈیلیٹ کرتی

گئی۔ معاً اس کا ہاتھ تھما تھا۔

”ادا نظریں چرانے کی کہاں سے سیکھ لی تم نے

یہ عادت روٹھ جانے کی کہاں سے سیکھ لی تم نے

بھروسہ تھا تمہیں مجھ پہ مکمل آج سے پہلے

روایت آزمانے کی کہاں سے سیکھ لی تم نے

محبت کے علاوہ کچھ نہیں تھا تیری آنکھوں میں

یہ نفرت اب دُنیا کی کہاں سے سیکھ لی تم نے

میرے معصوم صنم تو ذرا اتنا بتا مجھ کو

جسارت دل دکھانے کی کہاں سے سیکھ لی تم نے“

وہ اس کی نظم ڈیلیٹ کرتے ہوئے گھٹ گھٹ کر آنسو بہانے لگی۔ مگر آزمائش ختم کہاں ہوئی تھی.....؟

”ذرا جو دور جاتے ہو تب احساس ہوتا ہے

کہ باقی کچھ نہیں رہتا میرے جیون کے آگن میں

میری خوشیوں کے دامن میں

تیرے بن کچھ نہیں رہتا

اُداسی چھائی رہتی ہے

سینے اُدھورے رہتے ہیں

دن صدیوں سے لگتے ہیں

ان آنکھوں کی جلتی لودہم پڑنے لگتی ہے

اُمیدیں مرنے لگتی ہیں

تیرے ہاتھوں سے میرے ہاتھ

اچانک چھوٹ جاتے ہیں

میرے ارمان روتے ہیں

تجھے آواز دیتے ہیں

تجھے واپس بلاتے ہیں

سنو.....!

تم لوٹ آؤ ناں.....!

آنسوؤں کی روانی میں شدت آگئی تھی۔ اس کے ہر لفظ سے بے قراری، اضطراب چھلک رہا تھا۔ خود

اس کی اپنی کیا حالت ہوگی، وہ اندازہ کر سکتی تھی۔ اس نے اسی وقت آنے والا نیا میچ اوپن کیا تھا۔

”کوئی سورج جاگے دھرتی پر

کچھ ایسا ہو یہ رات ڈھلے

کوئی ہاتھ میں تھامے ہاتھ میرا

کوئی لے کے مجھ کو ساتھ چلے

کوئی بیٹھے میرے پہلو میں

میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھے

اور پونچھ کے آنسو آنکھوں سے

پھر دھیرے سے یہ بات کہے

یوں تنہا سفر اب کتنا نہیں

چلو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں“

اسے جانے کیا ہوا تھا.....؟ سیل فون ہاتھ سے رکھ کر وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر بری طرح سے رونی

☆☆☆

ساحل اُداس تھا کہ سمندر اُداس تھا

لگتا تھا جیسے سارا ہی منظر اُداس تھا

لوٹی فلک سے تو بڑی دل گیر تھی دُعا

اک خواب ٹوٹنے پہ مقدر اُداس تھا

پھر چاند کو گلے سے لگا کر رو پڑی گھٹا

ایسا لگا طوفان پہ فلک بھی اُداس تھا

میری تباہیوں پر اسے بھی ملال تھا

آئینہ خود پر توڑ کر پتھر اُداس تھا

جو شخص بانٹتا پھرتا تھا دُنیا میں ہنسی

یہ دل اسی کی بزم میں جا کر اُداس تھا“

وہ یونیورسٹی سے لوٹی تو فضا آئی ہوئی تھی اور گویا اس کے انتظار میں تھی۔ وہ جتنے تپاک سے اُٹھ کر

گلے ملی، ایمان کا انداز اسی قدر لیا دیا سا تھا، جسے فضا نے جتنا بھی محسوس کیا ہو، مگر جتنا ضروری نہیں سمجھا۔

”بہت مصروف رہنے لگی ہو.....؟ کبھی ملنے کا خیال نہیں آیا.....؟“

فضا کی بات پہ وہ کاندھے اُچکا کر فائل صوفے پر پھینکتے ہوئے بولی تھی۔

”ایگزٹام نزدیک ہیں۔“

”سیل کیوں آف کیا ہوا ہے.....؟“

اس سوال کے جواب میں خاموشی تھی۔ فضا نے کچھ دیر جواب کا انتظار کیا تھا، پھر گہرا سانس بھر کے

گویا ہوئی۔

”آخر ہوا کیا ہے تمہیں.....؟ یوں ایک دم اتنی رکھائی.....؟ ایہی.....! ولید بہت پریشان ہے۔“

”میں ان کی پریشانی کی وجہ نہیں ہوں۔“

وہ جس قدر تلخی سے کہہ سکتی تھی، کہہ گئی۔

”تم اس سے بات نہیں کر رہی ہو، یہی بات اس کو پریشان کر رہی ہے۔“

فضا کے جملانے پہ اس نے ہونٹ بھیج لئے تھے۔ اسے خود پہ ضبط کرنا پڑا تھا۔ ماما پاپا اس کے رویے

کی وجہ سے اس سے خفا رہنے لگے تھے۔ اب شاید فضا کی خفگی سینے کا وقت نزدیک تھا۔ وہ خود کو اس صورت حال

کے لئے تیار کرنے لگی۔

”تمہاری خفگی کی جو بھی وجہ ہے، تم اسے بتاؤ تو سہی.....!“

”بتا دوں گی، اتنی جلدی کیوں ہے.....؟“

اس نے جتنی تلخی سے جواب دیا تھا، فضا کو اس پر اسی قدر غصہ آیا تھا۔

”ایمان.....! تمہیں اس معاملے کی نزاکت کا احساس ہے.....؟ شوہر ہے وہ تمہارا.....! اس بدلے ہوئے رویے کی وجہ پوچھے تو کوئی ریزن دے سکو گی تم.....؟“

”کوئی ایک نہیں، بہت ساری ریزن ہیں میرے پاس۔ تم فکر نہ کرو۔ میں کر لوں گی بات ولید سے بھی۔“
جواب اس نے ترخ کر کہا اور تن فن کرتی اپنے کمرے میں جا گھسی۔ فضلہ کی آنکھیں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔
رات کے کھانے کے بعد جب فضلہ ایک بار پھر اسے سمجھانے اس کے پاس آئی تو ایمان کی پیشانی اسے دیکھتے ہی سلوٹ زدہ ہو گئی تھی۔ جسے فضلہ نے دیکھا تھا اور ہونٹ بھیج لئے تھے۔

”بیٹھو.....! کھڑی کیوں ہو.....؟“

ایمان کو اپنے رویے کی بد صورتی کا احساس ہوا تو نظریں چرا کر بولی تھی۔

”ابھی کچھ دیر قبل پھر ولید کا فون آیا تھا۔ تم نے اپنا سیل آن کیوں نہیں کیا.....؟“

”کیا پوچھنا چاہتے ہیں وہ.....؟“

اس نے سرد نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”یہ سوال تو نہیں کرنا چاہئے۔ وجہ تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں تم سے، کیا ہو گیا ہے تمہیں ایک دم.....؟“

فضلہ رو ہانسی ہونے لگی۔

”کچھ نہیں ہوا.....! صحت مند ہوں، باہوش ہوں، ہاں.....! البتہ اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔“

وہ رُک رُک کر، ہٹھ پٹھ کر کسی قدر نخوت سے بات کر رہی تھی۔

”کون سی غلطی.....؟“

فضلہ نے ہونٹ ہو کر اس کی صورت دیکھی۔

”ولید کے ساتھ عمر بھر ساتھ چلنے کی غلطی.....!“

اس نے تنک کر کہا اور فضلہ کو گویا سکتہ ہو گیا تھا۔

”تم..... تم ہوش میں تو ہو.....؟“

معاف فضلہ حلق کے بل چیخ پڑی تھی۔

”میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں بھائی ہوش و حواس بات کر رہی ہوں۔“

اس نے اس قدر برہمی سے کہا کہ فضلہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”اب کیا کرنا چاہتی ہو تم.....؟“

بہت دیر کی جامد اور تکلیف دہ خاموشی کے بعد بالآخر فضلہ نے یہ سوال کیا تھا۔

”جو چاہتی ہوں، سب کو عنقریب پتہ چل جائے گا۔“

اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے اسی انداز میں جواب دیا۔ فضلہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ جان گئی تھی اب وہ مزید کوئی بات نہ کرے گی، نہ سنے گی۔

☆☆☆

تمہیں مجھ سے گلہ کیا ہے

اچانک بے رخی اتھی

بتاؤ تو ہوا کیا ہے

مناؤں کس طرح تم کو

مجھے اتنا تو بتلا دو

اگر اب ہو سکے تم سے

تو یہ احسان فرما دو

میری منزل محبت ہے

مجھے منزل پہ پہنچا دو

تمہاری آنکھ میں آنسو

مجھے اچھے نہیں لگتے

تمہارے نرم ہونٹوں پہ

گلے اچھے نہیں لگتے

تمہارے مسکرانے سے

میرا دل مسکراتا ہے

تمہارے روٹھ جانے سے

میرا دل روٹھ جاتا ہے

اس نے ولید سے حتمی بات کرنے کی خاطر سیل فون اٹھایا تو اس کا منہ پہلے سے موجود تھا۔ کچھ دیر

ساکن نظروں سے اسکرین پہ چمکتے الفاظ کو تکتے رہنے کے بعد اس کی نظریں دھندلا گئی تھیں۔ وہی رو بہکے گئی۔

جب وہ جا رہا تھا تو ایئر پورٹ پہ ڈیپارچر لاؤنج کی سمت جانے سے قبل اس نے اچانک اس کے ہاتھوں کو اپنے

مضبوط پُر حدت ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لے کر کتنے جذب سے کہا تھا۔

”کبھی ناراض مت ہونا

گلے چاہے بہت کرنا

رُلا نا اور بہت لڑنا

سنو! ناراض مت ہونا

کبھی ایسا جو ہو جائے

کہ تیری یاد سے غافل

کسی لمحے جو ہو جاؤں

بنا دیکھے تیری صورت

کسی شب جو میں سو جاؤں

تو سپنوں میں چلے آنا

مجھے احساس دلانا
سنو! ناراض مت ہونا
کبھی ایسا جو ہو جائے
جنہیں کہنا ضروری ہو
وہ مجھ سے لفظ کھو جائیں
اُنا کو بیچ مت لانا
میری آواز بن جانا
کبھی ناراض مت ہونا

کردناں پر امس.....! کبھی مجھ سے خفا نہیں ہوگی۔“

وہ اس کے لہجے کی گھیرتا اور اتار چڑھاؤ کے بحر میں گم تھی، جب ولید نے اس کا کاندھا ہلا کر کسی قدر سنجیدگی سے سوال کیا تھا، اور وہ اس کے خوبرو، فریش چہرے کو تکتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”کوئی خود سے بھی خفا ہوتا ہے بھلا.....؟“

کتنا ایقان تھا اس سے اس کے لہجے میں مگر اب..... اس کا گلہ زندہ نہ لگا، جب سیل فون پر ہونے والی ہپ پہ وہ اپنے خیالات سے چونک گئی۔

”ولید کا لنگ.....!“

اس نے کچھ دیر تک خالی نظروں سے اسکرین کو دکھا تھا۔ پھر گہرا سانس کھینچ کر کال ریسیو کرنے سے قبل گویا خود کو اس سے بات کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔

”ایمان.....! ایی.....! مائی گاڈ.....! تھینک گاڈ.....! تم نے فون تو پک کیا۔ کیسی ہو.....؟“

اطمینان اور انبساط کے ساتھ اچانک ملنے والی اس خوشی نے اسے ایک دم بے ربط کر ڈالا تھا۔

”آئی تھنک.....! ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ہمیں ٹو دی پوائنٹ بات کرنی

چاہئے۔“

اس کا لہجہ روکھا، سرد اور بے حسی لئے ہو کسی قدر اجنبی تھا۔ دوسری سمت کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔

”تم کہو تو، کیا کہنا ہے.....؟ میں سن رہا ہوں۔“

معاوہ آہستگی سے گویا ہوا تھا۔ صورت حال کی تبدیلی کا اسے اسی پل یقین آیا تھا۔

”مجھے آپ سے صرف ایک بات کہنا ہے اور وہ یہ کہ مجھے طلاق چاہئے۔“

اس نے دل پہ پتھر رکھ کر بالآخر کہہ ڈالا۔ دوسری جانب موت کی سی خاموشی چھا گئی تھی۔ ایمان کچھ

دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی، پھر سیل آف کر کے رکھا اور خود پہ ضبط کھو دیا تھا۔

☆☆☆

بہت دیر تک آنسو بہانے کے بعد اس نے ہاتھ کی پشت سے بھیگا چہرہ صاف کیا تو نگاہ ہلنک کرتی اسکرین پہ جا پڑی۔ ولید حسن ایک بار پھر کال کر رہا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھی کہ مزید بات کرتی، جیسی آہستگی سے اُنھ کے کمرے سے نکل کر ٹیئرس پر جا کھڑی ہوئی، جبکہ کمرے کی نیم تاریکی میں بہت دیر تک موبائل کی اسکرین چمکتی رہی تھی۔

☆☆☆

”اپنی ہی ذہن میں رہتی تھی

اک لڑکی شوخ اور چنچل سی

پھولوں سے باتیں کرتی تھی

تتلی کے رنگ پڑتی تھی

اک دھنک تھی اس کے آنچل پر

پھر جانے کیا طوفان آیا

تتلی کے رنگ بکھر گئے

آنچل کے رنگ اُتر گئے

جب پوچھا کسی نے اے لڑکی!

تم نے چپ کیوں سادھ لی ہے

وہ کچھ نہ بولی بس رو دی

اور خاک پہ ہاتھ کی اُنکلی سے

اک لفظ جھٹ لکھ ڈالا“

فصہ تھک کر واپس چلی گئی۔ ولید نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ ایمان جیسے اس پر خار راستے پہ چلتے خود سے پھڑکی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی آتی مگر کوئی بھی کلاس انینڈ کئے بغیر کیمپس کی نہر کے کنارے سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ کبھی کینٹین جا کے بیٹھ جاتی۔

اس وقت بھی وہ سر جھکائے خود سے بھی غفلت کی کیفیت میں بیٹھی تنکے سے مٹی کرید رہی تھی، جب کوئی آہستگی سے چلتا اس کے مقابل آن بیٹھا۔ ایمان نے سر اٹھایا اور موسیٰ کو دیکھ کر ہونٹ بھیجنے لئے۔

”واٹ از دس.....؟“

اس کا بڑھایا ہوا کاغذ کا پڑزہ لینے سے گریز کرتے ہوئے بجھے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔
 ”ولید حسن کا ایڈریس ہے، گھر کا، آفس کا۔“
 موسیٰ کے جواب پر ایمان کی نگاہوں کی الجھن بڑھ گئی تھی۔
 ”تو پھر.....؟“

”افوہ.....! اپنی اپروچ کا ایک ننھا سا ثبوت پیش کر رہا ہوں۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں محض بھڑکیں مار رہا ہوں میں۔ بس.....! ایک فون کال، اور کام ختم.....!“
 وہ اپنی بات کے اختتام پہ سفاکی سے ہنسا اور ایمان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔
 ”میں نے کہا تھا ناں.....! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔“
 وہ بولی تو اس کے حلق سے بشکل پھنسی پھنسی آواز نکل سکی تھی۔
 ”ٹھیک ہے.....! ٹھیک ہے.....! مجھے یقین ہے۔ لیکن خود کو سنبھالیں تو سہی.....! یو نو.....! آپ کی فریشنس ختم ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے لالہ کے لئے وہی فریش سی ایمان چاہئے جنہیں دیکھ کر وہ پھر سے زندگی کی طرف پلٹے تھے۔“

اسے کانٹوں پر اچھی طرح گھسیٹ کر وہ کتنے اپنائیت بھرے انداز میں گویا ہوا تھا اور جو بات کہی تھی، وہ عام حالات میں ایمان کو ہتھے سے اٹکھاڑ سکتی تھی، مگر اس بل اس کی بے بسی انتہاء پہ پہنچی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں اترے آنسو ہونٹ کچل کر پیتے ہوئے اس نے آہستگی سے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔
 ”گلد.....! ایسے ہی تعاون کرتی رہیں تو مجھ سے آپ کو انشاء اللہ کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔
 وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔ ایمان ہونٹ بھیچے آنسو صاف کر رہی تھی۔

☆☆☆

”بتاؤ کیسا لگتا ہے

کسی کو پا کے کھودینا

کسی کے ساتھ تو چلنا

مگر اس کا نہ ہو پانا

خود ہی کو کوستے رہنا

مگر اس کو نہ کچھ کہنا

خود ہی گرنا، سنبھلنا

ہنسا اور رو دینا

بتاؤ کیسا لگتا ہے

خزاں کی سخت سردی میں

بحری کی لمبی راتوں میں

کسی کی یاد میں رونا

کسی کو سوچتے آنکھیں کھودینا

اس نے سنا تھا، ولید حسن اپنا ٹرپ اُدھورا چھوڑ کر چلا آیا ہے۔ اس کے دل نے ایک ہپ سی کی تھی۔
 مگر دانستہ اس نے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا تھا۔ مگر اسی شب تب سے خاموش تماشا شائی بنے بابا اس کے کمرے میں رات کو چلے آئے تھے۔

”ولید واپس آ گیا ہے، تمہیں پتا تو ہوگا.....؟“

کوئی بھی تمہید باندھے بغیر انہوں نے مطلب کی بات کی تھی۔ وہ جو انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر ہی ان کی آمد کا مقصد سمجھ گئی تھی، خود کو ان کے سامنا کرنے کے لئے تیار کرنے لگی۔

”تمہاری زندگی کے متعلق ہر فیصلہ تمہاری رضا اور ایماء پر کیا گیا تھا ناں ایمان.....؟“

وہ پوچھ رہے تھے اور وہ انگلیاں چٹا رہی تھی۔

”اب میں تم سے کسی قسم کی حماقت کی توقع نہیں کروں گا۔ آئی ڈونٹ نو.....! کہ تم دونوں کے درمیان کیا مس انڈر اسٹینڈ ہوا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اب تم ہمیں ذلیل نہیں کرو گی، اوکے.....!“

”پاپا.....! میں یہ شادی نہیں کر سکتی، پلیز.....!“

وہ روہانسی ہو گئی تھی اور پاپا نے زندگی میں پہلی بار اسے اتنے برے طریقے سے ڈانٹا تھا کہ وہ ششدر رہ گئی۔

”میں نے جو کہنا تھا، وہ میں کہہ چکا ہوں۔“

تبھی ماما کھانے کا کہنے چلی آئیں تو میں بھی بادل خواستہ کھانا کھانے کے لئے اپنے کمرے سے نکل آئی۔ مگر کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، سو کھانا چھوڑ چھاڑ کر اپنے کمرے میں اٹھ کر واپس چلی گئی۔

ماما کی خاموش نگاہیں پاپا پر آٹھری تھیں جو اطمینان بھرے انداز میں کھانا کھا رہے تھے۔

”ایک تو اس لڑکی نے عاجز کر کے رکھا ہوا ہے۔ آپ اس سے ایک بار پھر بات کریں ناں.....!“

ہماری تو کچھ سنتی ہی نہیں ہے۔“

ماما کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔ پاپا نے چیچ واپس پلیٹ میں رکھا اور پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

”ولید آ گیا ہے۔ کی ہے بات اس نے مجھ سے۔ کل آئے گا، خود بات کرے گا۔“

ان کے کہنے پہ ماما کے چہرے پہ ایک اطمینان سا پھیل گیا۔ ایمان جب کمرے میں واپس آئی تو ٹیلی فون تسلسل سے بج رہا تھا۔ اس نے کچھ لمحے ٹیلی فون سیٹ کو گھورا، پھر آگے بڑھ کر آہستگی سے ریسپور اٹھا لیا۔

”ایمان.....! ایمان.....! میری بات سنو پلیز.....!“

”بولو.....!“

وہ جتنی بے قراری، بے تابی سے کہہ رہا تھا، جواباً ایمان کا لہجہ اسی قدر سرد اور روکھا ہو گیا تھا۔

”تم اس روز مجھ سے مذاق کر رہی تھیں ناں.....؟“

”مذاق.....؟ میرا آپ سے ایسا کوئی تعلق نہیں رہا ہے ولید حسن.....! اور عورت کبھی مذاق میں طلاق

تھی کہ وہ چابی سمیت باہر آ گیا۔

”اس وقت کہاں جا رہے ہیں بھائی.....؟“

”کچھ کام ہے، اماں کو مت بتائیے گا۔“

”لیکن آپ جا کہاں رہے ہیں.....؟ مجھے تو بتادیں۔“

فضہ کو اس کے قدموں کا ساتھ دینے کو باقاعدہ دوڑ لگانا پڑی تھی۔

”آپ کی ڈیئر سسٹر سے باضابطہ ملاقات کرنے۔“

وہ رک گیا تھا۔ فضہ نے انرجی سیور کی روشنی میں اس کے چہرے کو خائف نظروں سے دیکھا تھا۔

”اس وقت.....؟ صبح چلے جائیے گا۔“

فضہ نے آہستگی سے مگر لجاجت سے کہا۔ وہ سر جھٹک کر مسکرایا۔ بڑی زہر بھری مسکان تھی۔

”مجھ پہ ایک ایک لمحہ بھاری ہے بھائی.....! آپ صبح کی بات کرتی ہیں.....؟ کتنی لمبی رات ہے بچ

میں، اندازہ ہے آپ کو.....؟“

وہ جیسے ضبط کھو کر بکھرنے لگا اور یہی اسے گوارہ نہیں تھا، جیسی رُخ پھیر کر ہونٹ بھیج لے۔

”آئی ایم سوری.....!“

معا اسے احساس ہوا تو بھاری آواز میں بولا۔ فضہ کے چہرے پر اذیت رقم ہونے لگی۔

”ایسا مت کہیں بھائی.....! سوری تو ہمیں کرنا چاہئے آپ سے کہ.....“

”میں چلتا ہوں۔ پھر بات کریں گے۔“

وہ ایک دم اسے ہاتھ اٹھا کر ٹوک کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈیوڑھی پار کر کے باہر نکل گیا۔ فضہ وہیں کھڑی

سوچوں میں گم تھی۔ اس کے چہرے پر تفکر تھا۔

☆☆☆

”تم نے گرتے ہوئے پتوں کو تو دیکھا ہوگا

اپنی ہر سانس وہ ٹہنی پہ گنوا دیتے ہیں

کیا خوب سمجھتے ہیں وہ بہاروں میں شجر کو

کڑی دھوپ میں اپنا آپ جلا دیتے ہیں

کتنے بے رحم شجر ہیں نئے پتوں کی خاطر

پرانے پتوں کی وفاؤں کو بھلا دیتے ہیں“

ہاتھ لے نکلے تو اس کا جسم سردی محسوس کرنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے بیڑ آن کیا تھا، پھر تولیے

میں قید لانے والوں کو جھٹک کر پشت پر گرانے کے بعد ڈانٹنگ نیبل کے سامنے آ کر برش اٹھایا اور بال سلجھانے

لگی۔ اس کی آنکھوں کے زیریں کنارے اور ناک کی پینک سرخ ہو رہی تھی۔ کل شام سے اسے زکام تھا، ابھی

پچھ دیڑ قبل وہ اپنا جسم بھی گرم ہوتا محسوس کر چکی تھی۔ مگر پراوہ نہیں کی اور ہاتھ لے لیا۔

اسی کا شاید نتیجہ تھا کہ اسے یکے بعد دیگرے چھینکیں آنے لگی تھیں۔ بال سلجھ گئے تو اس نے انٹرکام پہ

کا مطالبہ نہیں کیا کرتی۔ سمجھے.....؟ احمقوں کی جنت سے نکل آؤ۔“

تینکھے لہجے میں اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا تھا اور دوسری سمت وہ جیسے بے طرح ٹوٹ پھوٹ

کا شکار ہو گیا تھا۔

”کیوں کر رہی ہو ایسا.....؟ مجھے بتاؤ.....! کیا غلطی ہوئی ہے مجھ سے.....؟“

”غلطی آپ سے نہیں.....! مجھ سے ہوئی تھی۔ جانے کیسا جال پھینکا تھا تم نے.....؟ عقل ہی ضبط کر

ڈالی میری، سب کچھ بھلا دیا، اور میں اپنے نزدیک جو بھی، جیسا بھی ملا، اسی پہ قانع ہونے لگی۔ جبکہ تم گواہ تھے کہ

میں تمہیں پسند نہیں کرتی تھی۔“

اتنے سفاک الفاظ ولید حسن کے وجود کے پرچے اڑا گئے۔

”تو تم پچھتا رہی ہو میرا انتخاب کر کے.....؟“

وہ بہت تاخیر سے خود کو سنبھال کر بولا تو لہجے میں طنزیہ کاٹ کے ساتھ ٹوٹے اعتماد کی کرچیوں کی جھین

بھی تھی۔

”ہاں.....!“

دو ٹوک، قطعی اور سرد جواب تھا جو ولید حسن کو اندر تک کاٹ کر رکھ گیا۔ مزید کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا

کہنے سننے کو۔ اس نے بے جان ہاتھوں سے سیل فون واپس جیب میں رکھ لیا۔ صد شکر کہ اماں ابھی کچھ دیر قبل اٹھ

کر وہاں سے گئی تھیں۔ وہ آہستگی سے اٹھا تھا اور دروازہ کھول کر بالکنی میں آ گیا۔

ہوا سرد تھی۔ صحن میں لگے پتیل کے درخت کے پتے ہوا کی شرارت پہ بجتے تو خاموش فضاء میں

جلترنگ بج اٹھتے۔ وہ سگریٹ کے کش لے رہا تھا، جب ہوا کے دوش پہ لہرائی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب

کھینچی۔

”تم میرے کون ہو؟ تم سے ہے تعلق کیسا؟

تم کسی دُھند میں لپٹی ہوئی تنہائی ہو

میری شہرت ہو اور دُعا ہو، میری رُسوائی ہو

تم میرے کون ہو؟ تم سے ہے تعلق کیسا؟“

اس نے جلتی ہوئی سگریٹ ہونٹوں کے درمیان رہنے دی اور رینگ سے ٹیک لگا کر جلتی آنکھوں سے

نیچے دیکھا۔ کھیتوں کے پار گلابوں کے جھنڈ میں جگنو دمک رہے تھے۔ اسے ایمان کی بے رخی پہ ایک بار پھر تاؤ

آنے لگا۔ جیسی کچھ سوچا اور پلٹ کر کمرے میں آ گیا۔ جینک اور سیل فون اٹھایا اور کمرے سے نکل کر بیڑھیاں

بھلا نکلتا ہوا نیچے آیا تو فضہ کچن میں مصروف تھی۔ قدموں کی آہٹ پہ کھڑکی سے جھانکا اور اسے دیکھ کر کچھ دیر یوں

ہی تکتی رہی۔

”عاقب کہاں ہے بھائی.....؟ مجھے گاڑی کی چابی چاہئے تھی۔“

”اندر ہیں اپنے کمرے میں۔ اس وقت کہاں جا رہے ہیں ولی بھائی.....؟“

وہ تشویش میں مبتلا ہوتی کچن سے نکل آئی تھی، ابھی صحن عبور کر کے کمرے کے دروازے تک ہی پہنچی

ملازمہ کو چائے کے ساتھ ڈسپرین لانے کا کہا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازے پہ دستک کی آواز سن کر وہ گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دروازے کی سمت آئی اور ناب گھما کر دروازہ وا کر دیا۔ مگر اگلا لمحہ اسے شاک میں مبتلا کرنے کو آیا تھا۔

کھلے دروازے کی چوکھٹ پر ولید حسن کو ایستادہ پا کے اس کے اعصاب کو دھچکا لگا تھا۔ وہ آئے گا، یہ جانتی تھی وہ، مگر یوں اس طرح رات کے وقت، اس کا اندازہ نہیں تھا۔ جیسی کچھ لمحوں کو ساکن رہ گئی تھی۔ ولید حسن کی خاموش نگاہوں نے اس کا سر تاپا جائزہ لیا تھا۔

ٹی پنک اور بلیو پرنٹ کا اسٹائلش سوٹ گیلے، کھلے بال بغیر دوپٹے کے اس کا دلکش تباہ کن حشر ساماں سراپا۔

”نظریں ہمیشہ جھونے لوگ چرایا کرتے ہیں، یونو.....؟“

وہ ہونٹ بھیجنے کر سرعت سے پلٹی، بیڈ کے سرہانے پڑا اپنا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ رہی تھی، جب ولید حسن کی کاٹ دار آواز پہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”باہر چلے.....! ڈرائنگ روم میں یا پھر ہال کمرے میں۔ آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے، میں وہیں آکر آپ کی بات سنتی ہوں۔“

اس نے جواب میں رسائی سے کہا تھا اور ولید حسن کا ضبط پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ اس نے شدید غیض بھرے انداز میں اس کی کلائی اپنی آہنی گرفت میں جکڑی تھی اور اسے ایک ہی جھٹکے میں اپنے برابر کھینچ لیا تھا۔

”اگر تمہارا مقصد مجھ پہ میری حیثیت واضح کرنا ہے تو میرا تم پہ کس قسم کا استحقاق ہے، یہ میں تم پر یہیں کھڑے کھڑے ثابت کر سکتا ہوں۔“

اس کا تحقیر آمیز انداز ولید حسن کو آتش فشاں بنانے کا باعث بنا تھا۔

”انہی حقوق کو ختم کرنا چاہتی ہوں میں بھی، میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ مجھے طلاق.....“

اس کی بات ولید حسن کے زنائے دار تھپڑ کی وجہ سے اُدھوری رہ گئی تھی۔

”آج کے بعد اگر یہ منہوں لفظ تمہارے منہ سے نکلا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ سمجھیں تم.....؟“

شدید جلال میں آتا وہ اسے گھورتے ہوئے بولا تھا۔ ایمان گال پہ ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، یوں جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ وہ اس پر ہاتھ اٹھا چکا ہے۔

”بیوی ہو تم میری.....! بے غیرت نہیں ہوں میں کہ تمہیں بے مہار چھوڑ دوں۔ جب تک تم پہ کوئی حق نہیں تھا، کبھی تمہیں ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور یہ رشتہ زبردستی طے نہیں ہوا تھا، یاد کرو.....! تم ہی مری جاری تھیں مجھ سے تعلق جوڑنے پر۔“

وہ بولنے پہ آیا تو غضب سے بھر کر بولتا چلا گیا۔ اس کی چمکدار آنکھوں میں ذوقی حد درجہ تندی اور سرد مہری میں غیض و غضب تھا، اشتعال تھا۔ ایمان نے دانستہ نگاہ جھکا لی۔

”اسی غلطی پہ پیچھتا رہی ہوں۔ رشتے زبردستی تو نہیں جوڑے جاتے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں چلنا چاہتی، پھر آپ زبردستی کرنے والے کون ہوتے ہیں.....؟“

وہ بے ساختہ چیخ پڑی تھی۔ ولید حسن نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ پھر قدم بڑھا کر اس کے بالکل سامنے آ گیا۔

”میں تمہاری غلطی کو تمہارا عمر بھر کا کچھتاوا بنا دوں گا۔ بہت مان ہے تمہیں خود پہ، جو چاہو کر لوگی.....؟“

نہیں ایمان.....! مزید تمہاری نہیں، میری مرضی چلے گی۔ تم میری پابند ہو۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اس لئے نہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، وہ محبت تو اپنی موت اسی وقت مر گئی تھی، جب تم نے اس کا مصحفہ اڑایا۔ ایک حقیر کھلونے سے بڑھ کر تو نہیں تھی ناں میری حیثیت تمہاری نظروں میں، جو ایسی کیفیت میں تمہیں بھا گیا تھا، جب زندگی کے تمام رنگ پھیکے تھے۔ تم نے میری وجود کو، میری محبت کو اپنایا، اپنا دل بہلایا اور..... اور اب اس سے جان چھڑالینا چاہتی ہو.....؟

تو ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ بساط پہ بچے مہرے ہمیشہ آپ کو فتح سے ہی نہیں، شکست سے

بھی کبھی دوچار کر سکتے ہیں۔“

احساس ذلت کے احساس نے ولید پہ جیسے خون سوار کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کا آہنی دھیانہ دباؤ ایک ایک کر کے ایمان کی ساری مدافعانہ صلاحیتوں کو بے کار کرتا چلا گیا۔ اس کا اُلجھتا ہوا پرتپش نفس اسے اپنے چہرے پہ بھاپ کی طرح محسوس ہوا تھا۔

”ایسا مت کریں، مجھ پہ رحم کریں، پلیز.....!“

وہ اس کی گرفت میں مچلتی بے ساختہ بے بسی سے رد پڑی۔

”رحم کروں تم پہ.....؟ تم ہو اس قابل.....؟“

وہ اسے جھٹک کر تحقیر آمیز نگاہوں سے گھورنے لگا۔

”اگر آپ زبردستی کریں گے تو میں خودکشی کر لوں گی، مگر آپ کو آپ کے ارادوں.....“

”تم خودکشی کرو گی.....؟ میں خود جان سے مار دوں گا تمہیں۔“

وہ بھڑک کر اس کی سمت لپکا تو ایمان بری طرح سراپیمہ ہو گئی کہ اس کی نگاہوں کی جارحیت اور سفاکی نے اسے متوحش کر ڈالا تھا۔ ولید حسن اسے قہر بھری نگاہوں سے گھورتا ہوا ایک جھٹکے سے پلٹ گیا۔ ایمان بری طرح سے سبک اٹھی۔ کون جانتا تھا ان آنسوؤں کی المناکی کا سبب.....؟

کچھ پل اس کو اور دیکھ سکتے

اشکوں کو مگر گوارہ کب تھا

ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے

اس کا قصور سارا کب تھا

☆☆☆

”لکھا ہے جو کچھ

پڑھا ہے جو کچھ

وہ کس لئے تھا

کہاں سے پوچھوں
وہ کس لئے ہے کسے بتاؤں
مجھے عقیدوں کے خواب دے کر
کہہ گیا ان میں روشنی ہے
چمکتی قدروں کی چھب دکھا کر
مجھے بتایا یہ زندگی ہے
سکھائے مجھ کو کمال ایسے
یقین نہ لائیں سکھانے والے
اگر میں انہی کو جاسناؤں
میں کہ آنکھوں کی دسترس میں
نئے مناظر کہاں سے لاؤں
کہاں میں جنس کمال رکھوں
خیال تازہ کہاں سجاؤں
زمین پیروں تلے نہیں ہے تو
کیسے تاروں کی سمت جاؤں
پرانی قدریں جو محترم ہیں
انہیں سنبھالوں یا آنے والے
نئے عقیدوں کا بھید پاؤں
وہ سب عقیدے، تمام قدریں، خیال سارے
جو مجھ کو سکے بنا کے بخشے گئے
میری حواس خمسہ سے معتبر تھے
جب ان کو رہبر بنا کے نکلا تو میں نے دیکھا
میرے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے
میں ایسے بازار میں کھڑا ہوں
جہاں کرنسی بدل چکی ہے

فضہ اس کے لئے چائے لے کر آئی تھی، کمرہ خالی تھا۔ بیڈ کی چادر بے شکن اور پائنتی کی سمت پڑا کمرے
یوں ہی تہہ لگا پڑا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں، جن سے سورج کی روشنی چمکتی کر نیں بڑی آزادی سے کمرے
میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نیبل پہ موجود ایش ٹرے سگریٹ کی راکھ سے بوجھل تھی۔ فضہ نے گہرا سانس بھرا اور بھاپ
اڑاتا چائے کا منگ نیبل پر رکھ دیا۔

گویا وہ ساری رات نہیں سویا تھا۔ اس کے دل پہ دھرا بوجھ کچھ اور بڑھا۔ ایش ٹرے اٹھا کر ڈسٹ

ن میں جھاڑی اور اس کی تلاش میں بالکنی کی سمت آگئی۔ وہ وہیں موجود تھا۔ فضہ نے وہیں تھم کر اسے دیکھا تھا۔
وہ ایک دم سے چھا جانے والی زبردست پرسنالٹی کا مالک تھا۔ کھلے دیہاتی ماحول میں پلا بڑھا، فولادی وجود
اقابل تسخیر دکھائی دیتا تھا۔ وہ جس کے انداز میں ہمیشہ بڑی شان بے نیازی اور حد درجہ استغنا چھلکتا تھا، جسے
پنی انا اپنی عزت نفس اور وقار اتنا عزیز تھا کہ اس نے ایمان کی چاہت میں بری طرح سے بے بس ہو جانے
کے باوجود جھکنا پسند نہیں کیا تھا، مگر اب جیسے بڑی طرح سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ فضہ کو ایمان پہ جتنا غصہ آیا
تھا، ولید پہ اس قدر رحم۔

”ولی بھائی.....!“

اس کے پکارنے پہ ولید جو ختم ہوئے سگریٹ سے نیا سگریٹ سلگا رہا تھا، لمحہ بھر کو جیسے اس کی سمت

متوجہ ہوا۔

”آپ کو پتا ہے ناں، اسموکنگ کتنی خطرناک ہے، انسانی صحت کے لئے.....؟“

”کچھ نہیں ہونے لگا ہے مجھے، ڈونٹ وری.....!“

وہ بے نیاز، پر نخوت انداز میں کہہ کر گہرے کش لینے لگا۔

”آپ ساری رات بھی نہیں سوئے ہیں ناں.....؟“

ولید نے کچھ کہے بغیر ہونٹ بھیچنے اور آف ہوتے موڈ کے ساتھ سگریٹ نیچے اچھال دیا۔

”اب کہاں جا رہے ہیں.....؟ آپ کی چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

اسے بالکونی سے کمرے میں اور کمرے سے نکلتے دیکھ کر فضہ بے ساختہ گڑبڑائی۔

”میں ددا کے کمرے میں ہوں، میرا اور ان کا ناشتہ وہیں لے آئیے گا، اور ہاں.....! بے فکر رہیں۔“

آپ کی ڈیئر سسٹر کے، جبر و نارسائی کے غم میں میرا بھوک ہڑتال اور راتوں کو جاگنے کا ہرگز پروگرام نہیں ہے۔“

اس کے سر دلچے میں کسی قدر ٹھہراؤ تھا۔ چہرے پہ بے نیازی اور تلخی کے تاثرات رقم تھے۔ فضہ اسے

دیکھتے رہ گئی، وہ پلٹ کر جا چکا تھا۔

”تمہیں کاش اندازہ ہوتا ایمان.....! کہ تم نے اپنا کتنا بڑا نقصان کر لیا ہے.....؟“

فضہ اس کا نیا روپ دیکھ کر افسردگی سے سوچتی نیچے چلی گئی۔ ولید ددا کے کمرے میں آیا تو وہ اپنی عینک

لگائے سیرت النبی کے مطالعے میں مصروف تھے۔ وہ کرسی پلنگ کے نزدیک گھسیٹ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ددا

نے دوران مطالعہ ایک آدھ بار نگاہ بھر کر جب بھی اسے دیکھا وہ انہیں ہر بار الجھا ہوا مضطرب ہی لگا تھا۔ انہوں

نے آہستگی سے کتاب بند کر کے اس کی سمت بڑھانے کی بجائے خود ہاتھ اونچا کر کے قرآن پاک کے ساتھ

طاق پہ رکھ دیا۔

”خیر ہے پتر.....؟ اتنا خاموش کیوں ہے تو.....؟“

ددا کی آواز پہ وہ چونکا، پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”آپ سے ایک ضروری بات کرنے کی غرض سے آیا تھا۔“

ہاں ہاں.....! بولو.....!“

ددا نے اپنی پشت پہ تکیہ رکھتے ہوئے دھیان سے اسے دیکھا۔

”ددا!.....! میں فوری طور پر ایمان کی رخصتی چاہتا ہوں۔“

”مجھے پتا ہے، میرے پتر کو جلدی ہے۔ میں بات کروں گا تیرے ابا سے، فکر نہ کر.....!“

ددا کے چہرے پر مسکان اُتر آئی۔

”ددا!.....! بہت جلدی!.....! ایک ہفتے کے اندر اندر، اگر ممکن ہو سکے تو.....؟“

اس کی بات پر ددا چونکے تھے۔

”اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں.....؟“

ان کے سوال پر ولید نے ہونٹ بھیج لئے تھے۔ کم از کم ددا کو وجہ نہیں بتا سکتا تھا وہ۔

”اچھا!.....! چل ٹھیک ہے!.....! میں تیرے ابا سے بات کروں گا اور ارتضیٰ سے بھی، ہو سکتا ہے،

مان جائے!.....!“

ددا نے ہنس کر کہتے اس کا گھٹنا تھپکا۔ اپنے اندازے کے مطابق اسی افراتفری کی جو وہ انہوں نے اخذ کی تھی، اس نے ان کا موڈ خوش گوار کر دیا تھا۔

”کوشش نہیں ددا!.....! آپ نے اپنے دونوں بیٹوں سے یہ بات منوانا ہے۔“

اس نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تو ددا نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا وعدہ بھی کر لیا، اور جب فضلہ ناشتے کی ٹرے کے ساتھ اندر آئی تو عاقب بھی اس کے ساتھ تھا۔

”مجھے پتا چلا آج محترم ددا کے ساتھ ناشتہ کرنے والے ہیں تو میں نے بھی یہ موقع گنانا مناسب نہیں سمجھا۔ عید کا چاند ہو گئے آپ تو، اتنا کم میسر آتے ہیں۔“

عاقب سوٹ بوٹ پہنے بالکل فریش تیار حالت میں بڑے خوش گوار موڈ میں بات کر رہا تھا۔ ولید نے ایک نگاہ اس کے پز و قار پولیڈ سراپے پہ ڈالی تھی اور خاموشی سے فضلہ کا بڑھایا ہوا لگ تھا۔

”اب میسر آیا کرے گا، بیوی گھر لا رہا ہے ناں، پھر دیکھنا، ہر وقت اس کے گرد چکر لاتا ہوا ملے گا۔“

ددا کا موڈ بہت ناخوش گوار تھا، گفتگو بھی اسی قدر خوش دلی سے فرما رہے تھے۔ عاقب اور فضلہ دونوں نے ایک بارگی چونک کر پہلے ددا، پھر ولید کو دیکھا تھا۔

”اچھا!.....! تو اس سلسلے میں سفارشیں لے کر تشریف لائے ہیں محترم آپ کے پاس.....؟“

عاقب کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اُتر آئی۔ جبکہ وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

”کب یہ نیک کام انجام پا رہا ہے.....؟“

وہ جب ددا کے کمرے سے نکل رہا تھا، عاقب نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”میری طرف سے آج ہی انجام پا جائے۔“

وہ جس لہجے میں گویا ہوا تھا، اس میں بے تابانی اور شوخی نہیں، سرد مہری اور پھکار کا تاثر تھا۔ عاقب ایک دم خاموش ہوا تھا۔

”خود کو ریلیکس کر دو لی!.....! آپس اینڈ ڈاؤن زندگی کا حصہ ہیں۔ ٹیپر لوز مت کرو یا!.....! زندگی کا یہ

موڈ خوش گواری اور خوشی کا متقاضی ہے، اسے اسی طرح سے.....“

”اب اس کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ میرے سینے میں الاؤد بک رہا ہے۔ اتنی تپش ہے کہ دن رات جلتا ہوں۔ یہ ساری آگ اس کے وجود میں اُتاروں گا، تب چین آئے گا مجھے۔“

کھولتے ہوئے اعصاب پہ قابو پائے بغیر وہ اس قدر تندہی اور حقارت سے بولا تھا کہ عاقب ٹھٹک کر اسے تکتا رہ گیا جبکہ وہ مزید اس کی سنے بغیر آگے بڑھتا اپنے کمرے میں جا گھسا تھا۔

☆☆☆

کبھی بھی موڈ پر یا پھر اگلے پڑاؤ پر

گر جدا ہم کو ہی ہونا ہے

تو آؤ یہیں پر اپنے آشیانوں کو الگ کر لیں

یہ جتنے زخم دل پر ہیں ادھر اپنی طرف کر لوں

کہ تم اکثر یہ کہتے تھے

یہ سب میری بدولت ہیں

مگر ٹھہرو، ذرا ٹھہرو

یہاں کچھ خواب بھی ہوں گے

جو مل کے ہم نے دیکھے تھے

سہانے خواب تم رکھ لو

ادھر سے سب مجھے دے دو

کہ میری تو یوں بھی عادت ہے

مجھے ٹوٹی ہوئی چیزوں سے اک بے نام اُلفت ہے

ڈل گولڈن مکر کے سوٹ میں وہ متورم چہرے اور درم آلود پوپٹوں کی سرخ آنکھوں کے ہمراہ جب یونیورسٹی کے لئے تیار ہو کر آئی تو ماما نے اپنی بیٹی کو بہت دھیان سے دیکھا تھا۔ جانے کیا ہو گیا تھا اسے.....؟

دنوں میں جیسے آدمی رہ گئی تھی۔ اس کی تمام تر ضد، بدتمیزی، ہٹ دھرمی کے باوجود جب وہ اس کے چہرے کو دیکھتیں تو ایک دم دل ہو لگنے لگتا۔ جی چاہتا اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیں۔

”آج یونیورسٹی مت جانا، گاؤں سے تمہارے تاؤ جی کی فیملی آرہی ہے۔“

ٹی پاٹ اپنی جانب سرکا کر وہ کپ میں چائے انڈیل رہی تھی، جب ماما نے اسے مخاطب کیا تھا اس نے ہونٹ بھیج لئے۔ آج اس کا یونیورسٹی جانا اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ موسیٰ سے مل کر اسے اپنے ساتھ کا

ایک بار پھر یقین سونپنا چاہتی تھی۔ رات بھر اسے اس خیال سے نیند نہیں آسکتی تھی کہ موسیٰ، ولید کی پاکستان واپسی سے بے خبر نہیں ہوگا۔

”اگر اس نے طیش میں آکر کوئی اُلٹا سیدھا قدم اٹھا لیا.....؟“

اس سے آگے جا کر اس کی سوچیں بھی مفلوج ہونے لگی تھیں۔ رات اس نے متعدد بار موسیٰ کا نمبر

ملایا تھا، مگر ہر بار اس کا نمبر آف ملا تھا۔

”کیا کہا ہے میں نے.....؟ تم نے میری بات سنی بھی ہے.....؟“

اما کو اس کی بے نیازی نے تپایا تھا۔ جیسی کسی قدر سختی سے بولیں۔

”سن لیا ہے، لیکن گاؤں سے آنے والے مہمانوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے.....؟ ولید نے اگر آپ کو نہیں بتایا تو میں بتا دیتی ہوں کہ مجھے اس سے طلاق چاہئے۔ کیا اس فیصلے کو کرنے کے بعد اس کی یا اس کی فیملی کی آمد میرے لئے اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ میں ان کے اعزاز میں گھر پہ رُک کر استقبال کی تیاریاں کروں.....؟“

ناخوش گوار تاثرات سے مزین چہرہ، سپاٹ نظریں اور بے حد روڈ لہجہ اور الفاظ تو کوئی بارود کے گولے تھے جنہوں نے اما کے وجود کے پر نچے اڑا دیئے تھے۔ وہ گم سم سکتے کی کیفیت میں بیٹھیں تھیں۔ ایمان ان کی جانب دیکھے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔ یونیورسٹی بھی وہ شاید نہیں آیا تھا۔ ایمان کی متلاشی نگاہیں اور اس کا نمبر ڈائل کرتی انگلیاں مایوسی اور تھکن کا شکار ہوتی چلی گئیں۔ وجود میں اسی حساب سے وحشت اپنے نچے گاڑھتی رہی تھی اور جب وہ واپس لوٹ رہی تھی تو بے بسی اور خوف کے احساس نے اس کی آنکھوں کو بھگو ڈالا تھا۔

وہ گھر آئی تو فضا سمیت تاؤ جی اور تائی ماں کے ساتھ ساتھ حرا آپا بھی آچکی تھیں۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی ان سب سے بے رخی نہیں برت سکی۔ البتہ اس کے ہر انداز سے بے دلی کا اظہار ضرور چھلکتا رہا تھا۔ حرا آپا جو ہر قسم کی تازہ صورت حال سے بے خبر تھیں، اسے ولید کے حوالے سے بار بار چھیڑتی رہی تھیں۔ تب وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرتی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ پھر فضا کے سمجھانے کے باوجود بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئی تھی۔

”ہم لوگ شادی کی تاریخ لینے آئے ہیں۔ پاپا نے اگلے ہفتے کو تمہاری رخصتی کا عندیہ دیا ہے۔“

فضا کی اطلاع پر ایمان کے اعصاب پہ کوئی بم پھٹا تھا۔ اس نے سٹپٹا کر پچھی پچھی غیر یقینی نظروں سے فضا کو دیکھا تھا۔

”کوئی بھی منفی رد عمل دینے سے قبل یہ سوچ لینا ایمان.....! کہ اب پاپا کی عزت تمہارے ہاتھ میں

ہے۔“

فضا نے جیسے اس کے متوقع اشتعال سے بچنے کی غرض سے کہا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ولید نے ہر قسم کی تیاری سے منع کیا ہے۔ وہ سادگی سے رخصتی چاہتا ہے۔ لیکن پھر بھی پاپا کوئی کمی نہیں چھوڑیں گے۔ تم خود کو ریلیکس کرو ای.....! جو غلطی کر چکی ہو، اسے دہرانے کی بجائے اس کے اثرات اپنے رویے اور محبت سے ختم کرنے کی کوشش کرو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہوگا۔“

فضا جاتے جاتے اسے سمجھا گئی تھی، مگر اس نے تو شاید سنا ہی نہیں تھا، سمجھنا اور عمل کرنا تو الگ بات

تھی۔

☆☆☆

”عشق لیلائے تمنا کا فسور،

عشق بے داری وحشت کا صحرا

عشق شہروں کا دھواں

عشق صحرا کا غبار

عشق آغوشِ لحد

عشق جذبوں کا قرار

عشق شعلوں کی لپک

عشق پتھر کا گداز

عشق اک نعمتِ جاں

عشق اک موت کا ساز

عشق یازیبِ جہا

عشق زنجیرِ سم

عشق شیریں کے سلگتے ہوئے خواب

عشق فریاد کا خونِ قیس کا رقصِ جنوں

عشق جینے کی ادا

عشق ہر دل کی صدا

عشق کے کوچے میں ہے شاہ بھی گدا“

اس کی مثال ایک سہمی ہوئی چڑیا کی مانند تھی، جسے چال باز عقاب کے بچوں کا فون ہر لمحہ لرزا ہٹ طاری کئے رکھے۔ یقیناً وہ احتجاج کرتی ایک حشر اٹھا دیتی کہ جس نقصان سے بچنے کی خاطر اس نے محبت کو کھودیا تھا، محبت بھینٹ چڑھا کر نفرت اور بدگمانی کا سودہ کیا تھا، اس نقصان کا خوف پھر سے منہ پھاڑے سامنے کھڑا تھا، اسی شام جب گاؤں سے آئے مہمان واپس لوٹ گئے اور وہ اپنا انکار اور احتجاج لے کر پاپا کے پاس جانے والی تھی، پاپا خود اس کے کمرے میں آگئے تھے۔

”آپ.....؟ پاپا.....! میں آپ کے پاس ہی آنے والی تھی۔“

وہ انہیں دیکھ کر یک لخت اپنے بیڈ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے بیٹی کی آنکھوں کے نیچے گہرے ہوتے حلقوں کو دیکھا تھا، پھر بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

”مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی بیٹا.....! اس لئے میں خود چلا آیا۔ کیا فرق پڑتا ہے.....؟“

اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ کرسی پر فروکش ہو گئے تھے۔

”تمہاری ماما بتا رہی تھیں کہ تم اب یہ شادی نہیں کرنا چاہ رہی ہو۔ مگر میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں ایمان.....! کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے، اور خالصتاً تمہاری مرضی کے مطابق۔ تمہیں یاد ہوگا بھائی جان کو فضا کی منگنی کے حوالے سے رضا مندی میں نے اپنی ایماء پر دی تھی، مگر تمہارے معاملے میں، میں خاموش تھا۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔“

”مگر پاپا! تب میں.....“

”تب تمہاری ذہنی حالت جیسی بھی تھی ایمان بیٹا! مگر میں اتنا جانتا ہوں، تم نے ایک بہترین فیصلہ کیا تھا۔“

”پاپا! وہ.....“

”اب کچھ نہیں ایسی.....! مزید کچھ نہیں.....! یونو! میں بھائی جان کو تمہاری رخصتی کی تاریخ دے چکا ہوں۔ اگر تم نے میرے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا تو ہمیشہ کی طرح میں تمہیں اب بھی کچھ نہیں کہوں گا، مگر تمہاری کسی بھی حماقت کے نتیجے میں تم اپنے باپ کو ہمیشہ کے لئے کھودو گی۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں بہر حال اس شرمندگی کو سہہ نہیں پاؤں گا۔“

انہوں نے اپنی بات مکمل کی تھی اور مزید ایک لفظ بھی کہے بغیر اٹھ کر چل گئے تھے۔ وہ اس حد تک سراسیمہ اور بے اوسان ہو گئی تھی کہ کتنی دیر تک یوں ہی بیٹھی رہی تھی۔ احتجاج آپ ہی آپ دم توڑ گیا تھا۔ اس نے خاموشی اوڑھ لی۔ دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ چپ چاپ خود کو حالات کے سپرد کر دے۔ مگر ایسا کر لینے کے باوجود چین کھو گیا تھا۔

دن جیسے جیسے گزر رہے تھے، اضطراب بڑھ رہا تھا۔ ماما نے اسے شاپنگ کے لئے ساتھ چلنے پہ اصرار کیا مگر اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ تب انہوں نے ہار کر کہنا ہی چھوڑ دیا اور فضلہ کے ساتھ خود ہی تیاری میں مگن رہی تھیں۔

☆☆☆

”محبت پھر محبت ہے

کبھی دل سے نہیں جاتی

ہزاروں رنگ ہیں اس کے

عجب ہی ڈھنگ ہیں

کبھی سحر، کبھی دریا، کبھی جگنو، کبھی آنسو

ہزاروں روپ رکھتی ہے

بدن جھلسا کے جو رکھ دے

کبھی وہ دھوپ رکھتی ہے

کبھی بن کر یہ اک جگنو

شب غم کے اندھیروں میں

دلوں کو آس دیتی ہے

کبھی منزل کنارے پر پیاسا مار دیتی ہے

اذیت ہی اذیت ہے

مگر یہ بھی حقیقت ہے

محبت پھر محبت ہے

کبھی دل سے نہیں جاتی

وہ ایک عام سادہ گھر اس دن کا سب سے اہم اور خاص واقعہ ایمان کی ولید حسن کے سنگ رخصتی تھی۔ فی پنگ خوب صورت شرارے، میچنگ کے زیورات اور پھولوں کے گہنوں سے سجی وہ اپنے سندر روپ کے ساتھ زندگی کے نئے سفر پر روانہ ہوئی تو دل میں تمام تر خدشات، خوف، واہیات کے ساتھ ساتھ ایک ڈری لکھی سی، مگر ایک خوشی کا احساس بھی تھا۔ محبت کی تکمیل کا ایک انوکھا سر اٹھاتا خوش کن احساس جس کا اسے نو، کئی احساس نہیں تھا۔ اس گھر میں اس کا بہت پڑتاک استقبال ہوا تھا۔ اشعر نے پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتے ہوئے گنگنایا تھا۔

”ساڈھے گھر آئی بھر جائی!.....!“

اشعر نے ان لمحات کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ کچھ رسموں کی ادائیگی کے بعد اسے ولید کے کمرے میں اوپر کے پورشن میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے میں کسی اضافی ڈیکوریشن کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ گولڈن اور پیچ لکڑی کے لمبی نیشن سے سجایا ہوا خوب صورت میز پر، جس کی سامنے دیوار پر ولید حسن کا ایک ساڈھا پورٹریٹ شددہ تصویر اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ دروازے کے باہر قدموں کی چابیوں کی لکڑی کی ایک سب سے سادہ متوجہ ہوئی۔ فضلہ تھی، اس نے اندر آ کر ٹرے نیل پر رکھ دی۔

دودھ کا گلاس، مٹھائی کے علاوہ فروٹ کی ٹوکری۔

”اس کے علاوہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیا جائے۔“

فضلہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو ایمان یوں ہی خالی نظروں سے اسے گزرتے لگی تھی۔

”خوش کیوں نہیں ہوتی ہو.....؟ میری جان! تم اپنے سچے ٹھکانے پر پہنچی ہو۔“

فضلہ نے اس کے نزدیک آ کر اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکا تو اس کی آنکھیں جانے کس احساس سے بھیک گئی تھیں۔

”ولی بھائی کا سوڈ بھی کچھ خاص اچھا نہیں ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے، سچ میں تم دونوں کو خوشی ہائی اور

مستمن دیکھوں گی، انشاء اللہ!.....!“

وہ اس کی دھکتی پیشانی پہ ہوسہ شربت کرنے کے بعد کمرے سے نکل گئی۔ ایمان ساکن بیٹھی تھی۔ جانے کتنی دیر مزید گزری تھی، جب وہ اندر آیا تھا۔ بیک شیر والی اس کی غضب کی دراز تھامت پر۔ بے پناہ تڑپ رہی تھی۔ مگر اس کے پڑکشش چہرے پہ جو تشرارت تھی، وہ ایمان کے دل کی دھڑکنوں کو بھان میں مہلا کرنے لگے۔

”کیوں بیٹھی ہو اس طرح.....!“

وہ اسے دیکھتے ہی پہنکا رہا تھا۔ ایمان ٹپٹا کر اسے دیکھنے لگی۔

”اٹھو!.....! چنچ کرو جا کے، جنہیں انتقام کی خاطر کج کی زنت بنایا جائے، ان کے حسن کے

قمیدے نہیں پڑھے جاتے ہیں۔“

کیا تھا اس کے طنزیہ لہجے میں.....؟ وہ اپنی جگہ لرز کر رہ گئی۔ ان نظروں کے انگارے ایمان کو اپنے

وجود میں دھکتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ خائف سے انداز میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

دوپٹے سے پنیں نکالتے زیورات سے اُلجھتے بھاری سوٹ کیس گھسیٹ کر اس میں سے رات کے لئے آرام دہ لباس منتخب کرتے ہر پہل ایمان کو اس کی مدد کی ضرورت پڑی تھی اور ہر پہل یہ گمان ہوا تھا کہ وہ سگریٹ پھونکنے ترک کر کے اس کی ہیلپ کرے گا، مگر اس کا یہ گمان حسرت میں ڈھل گیا۔

جس پہل وہ لائٹ بلیو کمر کا سادہ سوٹ پہن کر واش روم سے جھجکتی ہوئی نکلی، وہ خود بھی لباس تبدیل کئے ہنوز سگریٹ پھونکتا گویا اس کا منتظر تھا۔ وہ فطری طور پر جھجک سی گئی۔ قدم جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔

”اتنی سادہ معصوم اور باجیا نہیں ہوتی.....! جتنا خود کو شوکر رہی ہو اس وقت.....؟“

اس کا ہاتھ پکڑ کر جارحانہ انداز میں اپنے پہلو میں گھسیٹے ہوئے وہ اتنی حقارت سے بولا تھا کہ ایمان بیک وقت شرم، خفت اور غم و غصہ سے منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

”کوئی مزاحمت یا اعتراض نہیں کرو گی.....؟ حالانکہ تمہیں تو آسمان سر پر اٹھا لینا چاہئے تھا۔ شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں ناں مجھ سے.....؟“

اس پر جھک کر اس پر اپنا استحقاق استعمال کرتا ہوا، اپنے ہاتھوں کی فولادی بے حسی، سنگ دلانہ گرفت میں ساکن اس کے وجود پہ طنزیہ نگاہ ڈال کر وہ کاٹ دار تلخی سے حقارت بھرے لہجے میں پھنکارا تو ایمان کا چہرہ اس توہین آمیز سلوک اور لہجہ پر ایک دم سرخ ہو گیا۔ کچھ کہے بغیر ہونٹوں کو سختی سے بھیج کر اس نے چہرے کا رخ پھیرا تو اس کا یہ گریز ولید کو سراسر اپنی توہین سے تعبیر محسوس ہوا تھا۔ جیسی وہ کچھ اور بھی پھراٹھا تھا۔

☆☆☆

”اسے میں نے ہی لکھا تھا

کہ لہجے برف ہو جائیں

تو پگھلا نہیں کرتے

اسے میں نے ہی لکھا تھا

یقین اُٹھ جائے

تو شاید کبھی واپس نہیں آتا

ہواؤں کا کوئی طوفان کبھی

بارش نہیں لاتا

اسے میں نے ہی لکھا تھا

آئینہ جب ٹوٹ جائے

پھر کبھی جڑ نہیں پاتا

وابستہ جن سے اُمید ہوں

وہ بدل جائیں

تو جیا نہیں جاتا“

رات وہ ولید حسن کے ایک یکسر نئے روپ سے روشناس ہوئی تھی۔ بے رحم، سفاک، جارح اور وحشی، جس کے کسی بھی انداز میں نہ تو کوئی گنجائش تھی نہ احساس کا کوئی رنگ۔ اگر وہ اس کے سلوک کو سامنے رکھ کر خود کو یہ یقین دلانا چاہتی کہ ولید نے کبھی اس سے محبت کی تھی، تو اسے یقین نہیں آ سکتا تھا۔

وہ ساری نفرت، وہ ساری تلخی اور بے حسی جو اس نے ایمان کے ٹھکرانے پر محسوس کی تھی، اس کا سارا قہر اس نے ایک ہی رات میں گویا اس سے اپنی بدسلوکی سے چکا دیا تھا۔ مگر پھر بھی یہ نفرت، یہ تلخی، یہ وحشت تھی کہ ختم نہ ہوئی تھی۔

ایمان کو اس سے شکایت اس صورت ہوتی اگر جو وہ خود کو بے تصور سمجھتی، جب سارا جرم اس کا تھا تو پھر ولید حسن کا رویہ تو عمل کا رد عمل تھا۔ اس انتہا کی نفرت کو سہہ کر بھی اس کا دل تھا کہ اسی کے نام سے دھڑک رہا تھا۔ جس پہل وہ اس کے وجود سے اپنے انتقام کی آگ بجھا کر منہ پھیر کر سوا گیا تھا، ایمان اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں اس کے ساحرانہ نقوش کچھ اور بھی دلکشی سمیٹ لائے تھے۔ گہری نیند کی آغوش میں ڈوبا اس کا چہرہ کسی معصوم بچے کی طرح بے ریا، سادہ اور حسین نظر آتا تھا۔ ایمان نے دل کی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر نرمی و آہستگی سے اس کی صلیج پیشانی پر بکھرے بال سمیٹ کر بہت دیر تک جی بھر کے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک گئی تھیں۔

اور جس پہل وہ جھک کر اس کی خم دار لابی پلکوں سے جی خواب ناک آنکھوں کو اپنے ہونٹوں سے چوم رہی تھی، اس کی آنکھ میں مچلتی نمی پلکوں کی دہلیز پھلانگ کر ولید حسن کے چہرے کو نمناک کر گئی تھی۔

وہ نیند میں کسمایا تھا، جاگا نہیں تھا۔ مگر ایمان گھبرا کر سرعت سے فاصلے پہ ہو گئی تھی۔ اس نے نامم دیکھا، رات کے تین بج رہے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے بستر چھوڑ دیا اور واش روم کی سمت بڑھ گئی تھی۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا بھی تو کوئی حل ہونا چاہئے تھا۔

☆☆☆

”موم کی طرح پگھلتے ہوئے دیکھا اس کو

رُت جو بدلی تو بدلتے ہوئے دیکھا اس کو

جانے کس غم کو چھپانے کی تمنا ہے اسے

آج ہر بات پر ہنستے ہوئے دیکھا اس کو

وہ جو کائناتوں کو بھی نرمی سے چھوا کرتا تھا

ہم نے پھولوں کو مسلتے ہوئے دیکھا اس کو

جانے وہ مانگنے جاتا تھا دُعاؤں میں کسے

ہاتھ اٹھاتے ہی سسکتے ہوئے دیکھا اس کو

پھر ہاتھ دُعا کو اٹھائے ہم نے

جب مقدر سے اُلجھتے ہوئے دیکھا اس کو“

ولید حسن کی آنکھ حسب معمول فجر کے وقت کھلی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر دیکھا، اس کا پہلو خالی

وعلیکم السلام.....! جزاک اللہ.....!“
اس نے آہستگی سے اپنا رخ اس کی جانب پھیرا اور کسی قدر متانت سے جواب دیا تھا۔ فضلہ نے بہت دھیان سے اس کی جھکی، مگر بھیگی پلکوں کو دیکھا تھا اور ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔

”تم خوش نہیں ہو ای.....؟“

فضلہ نے کچھ توقف سے کہا تو ایمان ہونٹ کھلنے لگی تھی۔

”خوشی کی تلاش میں ہوں.....!“

اس نے بھیگی آواز میں سرگوشی کی تو فضلہ نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لئے تھے۔

”خوشی تمہارے ہاتھوں کی مٹھیوں میں قید ہے ای.....! دیکھو تو سہی، محسوس تو کرو۔“

ایمان نے ہونٹ بھیجنے لئے۔ وہ اسے کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھی۔

”ولید کا رڈیہ تمہارے ساتھ کیسا تھا.....؟“

اور ایمان نے اس خوف سے نظریں چرائیں کہ وہ ان آنکھوں میں چھپی تمام حکایتیں نہ پڑھ لے۔
فضلہ نے اس کی خاموشی پر رُک کر اس کے سراپے پر نگاہ کی تھی۔ دُھلا دُھلایا، نکھرا سا روپ، وہ جیسے مطمئن ہو گئی۔

”میں تمہیں نماز کے لئے جگانے آئی تھی۔ ولید کو مسجد جاتے دیکھا تھا ناں، یہاں آئی تو محترمہ نہ صرف بیدار ہیں، بلکہ از خود اپنے بہت سے کام بھی پٹنا چکی ہیں۔ بہت اچھی تبدیلی ہے میری جان.....!“
وہ کسی قدر شوخی سے کہتی ایک بار پھر اس کے ساتھ لپٹی۔ ایمان ساکن کھڑی رہی۔

”میں اب تم لوگوں کے ناشتے کا انتظام کرتی ہوں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ.....؟“
وہ اُٹھتے اُٹھتے بولی۔ ایمان نے فی الفور سر کوٹنی میں ہلا دیا۔ پھر اس کے جانے کے بعد خود کو نڈھال سا محسوس کیا تو بستر پہ جانے سے قبل پہلے الماری کھول کر کسی قدر شوخ سا لباس منتخب کیا تھا، مگر اسے پہننے کی وہ چاہنے کے باوجود ہمت نہیں کر پائی کہ سر ایک دم ہی بہت بو جھل سا ہونے لگا تھا۔

کپڑے وہیں چھوڑ کر وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی بستر تک لائی تھی، اور لیٹنے کے بعد اپنے اوپر کبل کھینچ لیا تھا۔ تب ہی اس کے سیل پر وائبریشن ہوئی تھی۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر کال ریسپونڈ کی تھی اور ایک دم سرد پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

”کہانیاں نہ سنو آس پاس لوگوں کی
کہ میرا شہر ہے بستی اُداس لوگوں کی
محبوبوں کا سفر ختم ہی نہیں ہوتا
ہمیں تو دوستی آئی نہ راس لوگوں کی
ہمیں بھی اپنے یاد آتے ہیں
چلے جو بات خاص خاص لوگوں کی

تھا۔ وہ ایک دم ایک جھٹکتے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں وہ اسے جانے نماز پہ بیٹھی، ہاتھ دُرا کو پھیلائے سسکتی ہوئی نظر آئی۔ اس کی ہچکیوں کی آواز سے پورا ماحول سو گوار سا ہو رہا تھا۔ ولید نے ہونٹ کھینچ لئے تھے اور بستر سے پیر لڑکا کر اپنے سلیپر پہننے لگا۔

اس نے الماری سے کپڑے جو بھی ہاتھ لگے، کھینچے اور واش روم میں گھس گیا۔ ہاتھ لے کر نکلا تو یہ دیکھ کر مودا کچھ اور خراب ہو گیا کہ وہ ہنوز اسی کیفیت میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ ہچکیوں، سسکیوں میں کچھ اور اصاف ہو چکا تھا۔ اس نے زور سے ہیز برش ٹیبل پر پٹخا تب وہ ہز بڑا کر اُٹھی اور جانے نماز تہہ کرنے لگی۔

”بہت شوق ہے تمہیں اپنی نام نہاد مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کا.....؟ مگر ایک بات میری کان کھول کر سن لو.....! میں اپنے پرستو تمہیں کس سے بھی شیر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ انڈر اسٹینڈ.....!“

اس کے پاس رُک کر وہ خشک و سپاٹ تحکم بھرے لہجے میں گویا تنبیہ کر رہا تھا۔ ایمان نے خاموشی سے سنا اور تہہ کیا ہوا جائے نماز میز پہ رکھنے لگی۔ اس کی یہ خاموشی ولید کو ناگوار گزری تھی جبھی وہ ہتھے سے اُٹھ گیا تھا۔

”تم نے سنا نہیں.....! میں کیا بکواس کر رہا ہوں.....؟“

اس نے ایک دم اس کا رخ پھیرا اور اس کا چہرہ اپنے فولادی ہاتھ میں لے کر ختی سے استفسار کیا۔
ایمان نے سہم کر اسے دیکھا تھا۔ پھر عافیت اسی میں سمجھی تھی کہ سر کو اثبات میں ہلا دے۔

”کسی کے بھی کمرے میں آنے سے قبل اپنے چہرے پہ چپاں اس مسکینی کو ختم کرو۔“

اسے جھٹک کر وہ اپنے مخصوص کمرے انداز میں ایک نیا آرڈر دیتا خود پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ ایمان نے اپنے جھلنے وجود کی حدتوں سے اپنا دم اُلجھتا ہوا محسوس کیا تھا تو آگے بڑھ کر کھڑکیاں کھول کر پردے بھی ہٹا دیئے۔

صبح نسیم کے سرد جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرائے تو اندر لگی آگ ذرا سی ہلکی ہوئی۔ وہ کتنی دیر وہیں کھڑی گہرے گہرے سانس بھرتی رہی۔ فضاء میں صلوٰۃ اور درود کی ملتی جلتی آوازیں تھیں، جن میں چڑیوں کی چہکار بھی شامل ہو رہی تھی۔ بہت پُر نور فضاء تھی۔ وہ نم آنکھوں، دھڑکتے دل اور مضطرب وجود کے ساتھ پھر سے وہی دُعا مانگنے لگی جو اس کی دھڑکنوں میں بس گئی تھی۔

ولید کی سلامتی حفاظت اور زندگی کی دُعا۔

مووی کی وحشت اور طیش سے سرخ آنکھیں اور دھمکیاں یاد آتیں تو اس کی سانسیں بھی تھینے لگتی تھیں۔
زندگی کا یہ ایسا انوکھا رخ تھا کہ وہ خود کو ایک پڑکٹی چڑیا کی طرح حالات کے پنجرے میں پھڑ پھڑاتا محسوس کر رہی تھی۔ وجود بولہ بان تھا، گردل کی وحشت کا انت نہیں تھا۔

”السلام علیکم.....! صبح بخیر زندگی.....!“

وہ اپنی بے چین اور مضطرب سوچوں میں گم تھی، جب فضلہ نے پیچھے سے آکر اس کے نازک سے وجود کو بہت پُر جوش سے انداز میں اپنی بانہوں کے حصار میں مقید کر کے گنگنائے کے انداز میں کہا تو ایمان نے بہت سرعت سے غیر محسوس انداز میں اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

میں آنے والے زمانے سے ڈر رہا ہوں محسن

کہ میں نے دیکھی ہیں آنکھیں اُداس لوگوں کی

ولید مسجد سے نماز پڑھ کر آیا تو اوپر اپنے کمرے میں جانے کی بجائے ددا کے پاس چلا آیا جہاں اس وقت تقریباً سبھی جمع تھے۔ حرا آپا کے شوہر، بابا، اشعر، عاقب، اسے دیکھتے ہی ایک ہا ہوکار بچ گئی۔

”آئیے آئیے دلہا صاحبہ!“

اشعر نے بڑی شوخی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

”آپ کو تو اس وقت اپنی حسین، دلفریب بیوی کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔“

عاقب نے بھی چیخڑ چھاڑ کا آغاز کیا۔ سب مسکراتے ہوئے اسے دیکھتے رہے، جس کے چہرے کی سنجیدگی قابل دید تھی۔

”بیوی کے ساتھ ہی تھارات بھر، اب تمہارا کیا خیال ہے.....؟ صرف انہی کا ہو کر رہے.....؟ اور یقیناً وحی شاہ کی طرح ایسی نے بھی یہ تقاضہ تو نہیں کیا ہوگا کہ

اب میرے، صرف میرے ہو کے رہو.....!“

عاقب کا لہجہ بے حد شوخ و شنگ تھا۔ ولید کی پیشانی پر ایک سلوٹ نمودار ہو گئی تھی۔

”اگر کرتی بھی تو میں جیسے مان ہی لیتا.....؟“

اس کے لہجے میں کسی قدر تضحی تھی جسے کسی نے بھی محسوس نہیں کیا۔

”اچھا بھئی.....! تم لوگ میرے شیر کو تنگ مت کرو۔ ولید پتر.....! تو ادھر آ میرے پاس.....! یہ بتا، میری پتری کیسی ہے ایمان.....؟“

ددا نے سب کو ٹوک کر اسے اپنے پہلو میں بٹھا کر سوال کیا تھا۔ وہ اتنا خوش گوار ہرگز نہیں تھا کہ وہ خوش دلی سے جواب دیتا، مگر اشعر کے لئے یقیناً تھا، جیسے اس نے کسی قدر شوخ انداز میں سینی بجاتی تھی۔

”ددا.....! ابھی بھی پوچھنے کی کسر ہے کوئی.....؟ یہ ایرجنسی کی رخصتی از خود بھید کھول رہی ہے، محترمہ کی خوب صورتی کتنا سرچڑھ کر جادو چلا چکی ہے۔“

اشعر کے شری لہجے میں شوخی کی کھنک تھی۔ ولید کچھ کہے بغیر خاموش، سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ددا نے اشعر کو جھڑکا پھر ولید سے مخاطب ہوئے تھے۔

”بہت پیاری بچی ہے، اور ہم سب کی بہت چہیتی بھی۔ سب سے چھوٹی ہے نا، اس لئے تھوڑی ضدی ضرور ہے، مگر اس کا دل بہت خاص ہے، بہت پیارا ہے۔“

”جی.....! اور اب یہ دل آپ کا ہوا.....!“

اشعر پھر مداخلت کرتے ہوئے لہک کر گانے لگا تھا کہ ددا نے اسے گھورا۔ تب ہی دروازہ کھلا اور فضلہ کسی قدر گھبراہٹ ہوئی اندر آئی تھی۔

”ولی بھائی.....! آپ یہاں ہیں.....؟“

”کیا ہوا.....؟ خیریت.....؟“

ولید نے محض سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے پر اکتفا کیا تھا جبکہ عاقب باقاعدہ اس کے انداز سے چونکا تھا۔

”میں آپ لوگوں کا ناشتہ لے کر اوپر گئی تو ایمان بستر میں تھی، میں کبھی سو رہی ہے، مگر جب آواز دینے پر نہیں اٹھی تو میں نے آگے بڑھ کر اسے جگانا چاہا، مگر وہ بے ہوش تھی۔ جب صبح میں اسے نماز کے لئے جگانے کو گئی، تب بھی اسے ہلکا بخار محسوس کیا تھا، مگر اس کی طبیعت اتنی خراب ہو جائے گی، مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔“

فضلہ کسی قدر پریشانی میں مبتلا تیز تیز بول رہی تھی۔

”خدا خیر کرے.....!“

وہاں موجود سب پر گویا ایک دم پریشان نظر آنے لگے۔ ددا نے ٹھس سے انداز میں بیٹھے ولید کو ٹھوکا دیا تھا۔

”جاؤ ناں.....! دیکھو بچی کو کیا ہوا ہے.....؟“

ددا کے لہجے کی تشویش کو پا کر اس نے ہونٹ بھیچے تھے اور اٹھ کر سردی کیفیت میں فضلہ کے ہمراہ چلتا اوپر آ گیا عاقب، اشعر وغیرہ سب دانستہ نیچے ہی رُک گئے تھے۔

”یہ دیکھیں، ابھی تک ہوش نہیں آیا ہے۔ میرا تو دل گھبرانے لگ ہے۔“

فضلہ کسی بھی پل رو پڑنے کو تیار تھی۔ مائی ماں اس کی ہتھیلیاں سہلاتے ہوئے قرآنی آیات پڑھ کر دم کر رہے تھیں، جبکہ حرا آپا نے گھبراہٹ میں اس کے چہرے اور وجود پر ٹھنڈا پانی بھی ڈالا تھا۔ جس سے اس کا لباس ہی نہیں بستر بھی گھبرا گیا ہو چکا تھا۔

ولید کا مارے کوفت کے برا حال ہو گیا۔ یہ ایسا کیسی اسے کیا ہوا تھا.....؟ اس بات پر غور کئے بنا وہ اسے تنفس دینے لگا۔ کتنی مشکلوں سے اس کی ذہنی سانس بحال ہو پائی تھیں۔ اگر چند لمحے مزید تاخیر ہو جاتی تو شاید ہر کوشش بے کار چلی جاتی۔ ولید نے گہرا سانس بھر کر اسے دیکھا تھا۔

سفید زردی مائل حسین نقوش سے سجا سحرانہ مکھڑا، دلکش متناسب سرپا، اتنی کشش، اتنا فراخی سے حسن اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا کہ دیکھنے والی نگاہ پہ سحر طاری ہو جاتا۔ بلاشبہ وہ مکمل حسن کی مالک تھی۔

”فضلہ.....! بستر اور لباس بدلیں اس کا، ورنہ انہیں ٹھنڈ بھی لگ سکتی ہے۔“

وہ دانستہ اس سے نگاہ چراتا ہوا فضلہ سے مخاطب ہوا تھا۔

”ارے ہاں.....! مجھے خیال ہی نہ رہا تھا۔ بس گھبراہٹ اور پریشانی میں یہی سوچا۔“

حرا آپا کھسیا کر کہتی خود لپک جھپک ساتھ والے کمرے سے نئی چادر اور گدا اٹھا لائیں، اور پھر اسے مخاطب کیا۔

”ولید.....! ذرا اٹھانا تو ایمان کو، بستر تب ہی بچھے گا ناں.....!“

اسے پہلے ہی فقرے پہ بدکتے دیکھ کر انہوں نے کسی قدر غصے سے وضاحت دی۔

”بھئی.....! بیوی ہے تمہاری.....! اس قدر گھبرا کیوں رہے ہو.....؟ یا پھر ہمارے سامنے شرم رہے

ہو تو ہم باہر چلے جاتے ہیں.....؟“

پریشانی ٹل گئی تھی۔ اب انہیں چٹکے سوجھ رہے تھے۔ ولید کا چہرہ جانے کس احساس کے تحت سرخ ہو گیا تھا۔ طوعاً و کرہاً سہی، مگر اسے آگے بڑھ کر اسے بیڈ سے اٹھا کر صوفے پر منتقل کرنا پڑا تھا۔

”اس کی تو شرٹ بھی گیلی کر ڈالی ہے آپ نے، اس کا بھی کچھ کریں۔“

وہ کسی قدر جھلاہٹ کا شکار ہو کر کہہ رہا تھا۔

”ظاہر ہے، وہ ہم بھی کریں گے، تم سے زیادہ بھلے نہ سہی، مگر بہر حال ہمیں اس کا خیال ہے۔“

آپا نے ایک بار پھر اس پر حملہ کیا۔ انداز میں بھلے جتنی بھی سادگی ہو، مگر ولید کو بری طرح چبھا تھا۔

”بھئی.....! حد تھی بدتمیزی کی۔“

وہ کھول اٹھا۔

”ارے.....! اب کہاں بھاگے جا رہے ہو.....؟ اس بیچاری کو بستر پر تو لٹا جاؤ۔ اگر ہم سے یہ کام ہوتا

تو تمہیں کہتے بھلا.....؟“

آپا نے اسے دروازے کا رخ کرتے دیکھ کر ایک دم شور مچا دیا تھا۔ فضا کو مسکراہٹ چھپانا پڑی، جبکہ ولید یوں ان کے جان کو آجانے پر بے طرح جھنجھلایا تھا۔

”ایسی بھی پہلوان نہیں ہیں محترمہ کہ آپ جیسی دو خواتین سے اٹھائی ہی نہ جا سکیں.....؟ بس.....!

بہانے ہیں سارے۔“

اب کے وہ اپنی ناگواری کسی طور بھی چھپا نہیں پایا اور ایمان کے بے سدھ وجود کو کسی ناگوار بوجھ کی

طرح اٹھایا۔

”تمہارے بھی تو یہ محض بہانے ہی ہیں۔ ورنہ دل ہی دل میں کیسے پھول کھل رہے ہوں گے، یہ میں

اچھی طرح جانتی ہوں۔“

آپا نے جیسے اس کی بات پہ مکھی اڑائی تھی۔ ولید نے ہونٹ بھیجنے لئے اور جس پل وہ ایمان کو پلنگ پہ

لٹا کر اپنے بازو اس کی کمر سے الگ کر رہا تھا، اسی پل ایمان نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اسے اتنا نزدیک پایا تو جانے کس احساس کے تحت اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر منہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔ ولید کے اعصاب کو

حیرت کا جھکا لگا تھا۔ اس کی اس حرکت پہ وہ کچھ پل اسی زاویے پہ ساکن رہ گیا تھا۔

”چلو.....! اب کیا ہوا.....؟ مت بھولو منجلے.....! ابھی ہم یہیں ہیں۔“

آپا نے جب اسے سیدھے ہوتے نہ پایا تو گویا اپنی بات اس پر ثابت کر کے کسی قدر شوخی سے کھنکھار کر بولی تھیں۔ ولید چونکا اور اپنے کھوتے ہوئے اعصاب پہ قابو پائے بغیر کسی قدر درشتی سے جھٹک کر اسے بستر

پر بچھا اور ایک لمحے کے توقف کے بغیر پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ ایمان نے اپنی ہلکتی ہوئی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

”کاش.....! کاش میں ان آنسوؤں کی طرح ہی آپ کو بھی اپنی آنکھوں کے پیچھے چھپا سکتی۔ دل

میں محفوظ کر سکتی۔“

اس کا دل رو اٹھا تھا۔ موسیٰ کا فون تھا جس کی دھکیوں کی تاب نہ لائے ہوئے اس کا دل دھڑکنا

بھول گیا تھا۔

”آر پو آل رائٹ ناؤ.....!“

فضہ اسے ہوش میں دیکھ کر لپک کر اس کے نزدیک آئی تھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایمان نے محض سر ہلانے پہ اکتفا کیا اور مزید سوالوں سے بچنے کے خوف سے آنکھیں تھکے ہوئے انداز میں موندھ لیں۔

☆☆☆

”اگر وہ مہربان ہوتا

تو میری آنکھوں میں نہ یہ نمی ہوتی

نہ میرے دل کی وادی میں

خزاں کا قافلہ رکتا

اگر وہ مہرباں ہوتا

میری بے نور آنکھوں میں

ستارے قید کر دیتا

میری زخمی ہتھیلی پر

کوئی پھول وہ رکھتا

میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں

لے کر وہ یہ کہتا

محبت روشنی ہے، رنگ ہے، خوشبو ہے، ستارہ ہے

قسم مجھ کو محبت کی مجھے تو سب سے پیارا ہے

مگر ایسا وہ تب کہتا

اگر وہ مہرباں ہوتا“

”کس کے دھوکے میں مجھ سے قریب ہوتی تھیں تم.....؟ بولو.....! بتاؤ.....!“

وہ سر اپا قہر بنا اس سے سوال کر رہا تھا۔

”نفرت کرتی ہوں تم مجھ سے.....؟“

آنکھوں میں شعلوں سی پیش لئے اس کے لہجے میں بھی حقارت کی حد تھیں۔ ایمان ساکن تھی۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا، مار ڈالوں گا تمہیں، جواب دو میری بات کا۔“

اس کی خاموشی پر وہ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر آپے سے باہر ہوتا پوری جان سے سلگا۔ ایمان سہمی

گئی اور بہت شدت سے سر کوئی میں ہلایا۔

”کیا نہیں.....؟“

وہ وحشت زدہ ہو کر چلا یا۔ ایمان کچھ اور خائف ہو گئی۔

پھول کی طرح میرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنگھڑی پنگھڑی ان ہونٹوں کا سایہ دیکھوں
میں نے جس لمحے کو پوجا ہے اسے بس ایک بار
خواب بن کے تیری آنکھوں میں اُترتا دیکھوں“

اسے ماما کی طرف آئے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا، اور اس دوران ولید حسن نے پلٹ کر بھی اس کی خبر
نہیں لی تھی۔ کئی بار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اس کا نمبر ڈائل کیا، مگر پھر ارادہ ترک کر دیا کہ اس کے موڈ
کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا، بلکہ اس کے لئے تو اس کا ایک ہی انداز تھا، مخصوص آتش فشانی روپ، ہنک آمیز، بے
لچک آنکھوں سے اس کے سامنے کے ساتھ ہی جارحیت سمٹ آئی، کتنا بدل گیا تھا وہ۔
ایمان لان میں ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی تو کچھ سوچ کر فضا کا نمبر ڈائل کر لیا۔
”کیسی ہوفضہ.....؟“

رابطہ بحال ہونے پر اس نے سلام کے بعد پوچھا تھا۔
”فٹ فٹ.....! تم سناؤ.....! ہماری یاد کیسے آگئی.....؟“
”بور ہو رہی تھی، سوچا تم سے بات کر لوں.....!“
وہ جھولے پر آکر بیٹھ گئی اور آہستگی سے جواب دیا۔
”تو واپس آ جاؤ ناں.....! مجھے پتا ہے، تم ساجن کے بن اُداس ہو رہی ہو۔“
فضہ کے دھوکے بھرے لہجے پہ اس کے چہرے پر بھولی بھنگی مسکان کی جھلک لہرائی تھی۔
”ولید سے کہو ناں، مجھے آکر لے جائیں۔“
اس کا مدہم لہجہ سرگوشی میں ڈھلنے لگا۔

”تم خود کہو ناں، تم سے زیادہ تو میری بات اہمیت نہیں رکھتی۔“
فضہ نے ٹوکا تھا، اور وہ ملول ہونے لگی۔
”تم کیا جانو کہ میری حیثیت کتنی ڈاؤن ہو گئی ہے، ان کی نظروں میں۔“
وہ خود سے سوچ رہی تھی۔
”چپ کیوں ہو گئی ہو.....؟ یہ لو، ولید آ گیا ہے، خود بات کر لو اس سے۔“
فضہ کی بات پر وہ ایک دم گھبرا گئی۔
”ہیلو.....!“

ایمان نے اس کی آواز کے ساتھ اپنی دھڑکنوں کو بے ترتیب ہوتے پایا تھا۔
”کیسے ہیں آپ.....؟“

سو کھتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر وہ گڑبڑا کر بولی۔

”کتنی بار کہوں کہ اس قسم کے ڈرامے مت کیا کرو.....؟“

وہ طیش سے پھٹ پڑا۔ ایمان اس قدر بے مروتی پہ جیسے خفت سے سرخ پڑ گئی۔ اس سے کچھ بولا ہی

”مم..... میں آپ سے نفرت نہیں کرتی، ٹرسٹ می.....!“
اس نے ہکلا کر کہا اور گویا ولید کے غضب کو آواز دے ڈالی۔
”جھوٹ بول رہی ہو تم.....! بکو اس کرتی ہو تم.....! مجھے پھر سے دھوکہ دینا چاہتی ہو.....؟ مگر میں
تمہارے دھوکے میں نہیں آؤں گا۔“

وہ پاگلوں کی طرح اسے زرد کوب کرتا ہوا دھاڑتا رہا۔ ایمان اس کی گرفت میں زخمی پرندے کی طرح
پھڑپھڑاتی رہی۔ ولید کا اپنا سانس دھونکی کی مانند چلنے لگا۔ چہرے پر جیسے کسی نے آگ بڑھکا دی تھی، آنکھوں میں
لبو اُترا ہوا تھا۔ ایمان کو اس کی ذہنی حالت کا اندازہ ہوا تو خوف زدہ ہونے لگی۔ اس کا ایک انکار ولید حسن جیسے
شدت پسند، انا پرور انسان کو کس ذہنی ابتری تک لے گیا تھا، وہ اب سمجھ رہی تھی۔
”ساری زندگی سکا سکا کر ماروں گا تمہیں۔ تم نے ابھی میری نفرت دیکھی نہیں ہے۔ بہت مان تھا
ناں تمہیں اپنی دولت پہ، اپنے وجود کی خوب صورتی پہ، ساری زندگی سڑنا اسی گھر میں۔“

گہرے گہرے سانس کھینچ کر اپنے طیش پہ قابو پاتا وہ اسی حقارت سے بولا تھا۔ ایمان نے اس پل
خاموشی میں عافیت سمجھی تھی۔ وہ چاہتی تھی، ولید کے اندر کا سارا غبار نکل جائے، چاہے کسی بہانے سے ہی سہی۔
”ہر کامیاب مرد کی کامیابی میں کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے ناں.....! بالکل اسی طرح میری ناکامی کے
پیچھے تمہارا ہاتھ ہے۔ نہ تم اس وقت نخست ڈالتیں، نہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آتا۔ سب کچھ کھودیا میں نے
تمہاری وجہ سے، بد بخت عورت.....! سب کچھ۔“

اس نئے الزام پہ ایمان نے بہت کرب میں گھرتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ کچھ اتنا غلط بھی
تو نہیں کہہ رہا تھا، مگر یہ حقیقت بہت تلخ تھی، بہت کرب انگیز۔

☆☆☆

”شام بھی ہو گئی دھندلا گئیں آنکھیں بھی میری
بھولنے والے میں کب تک تیرا رستہ دیکھوں
کاش صندل سے میری مانگ اُجالے آکر
اتنے غیروں میں وہی ہاتھ جو اپنا دیکھوں
تو میرا کچھ نہیں لگتا مگر اے جان حیات
جانے کیوں تیرے لئے دل کو دھڑکتا دیکھوں
بند کر کے میری آنکھیں وہ شرارت سے بنے
بونجھے جانے کا میں ہر روز تماشہ دیکھوں
تب ضدیں میں اس کی پوری کروں ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح اسے ہنستا دیکھوں
مجھ پہ چھا جاتے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

نہیں گیا۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندا لگنے لگا تھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے سلسلہ کاٹ دیا تھا۔ آنکھوں میں آئے آنسو پلکیں جھپک جھپک کر اندر اُتار رہی تھی، جب ایک بار پھر موبائل پر بیل ہونے لگی۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، اسکرین پر ولید کا نام تھا۔ اسے کال ریسیو کرنا پڑی تھی۔

”کیوں فون کیا تھا تم نے.....؟“

اس کی خاموشی پہ وہ کسی قدر تنک کر پوچھ رہا تھا۔

”آپ کو نہیں، فضلہ کو کیا تھا۔“

ایمان نے تمام آنسو اندر اُتار کر کسی قدر سرد مہری سے جتایا۔ اس کا اس قدر انسٹلنگ انداز اسے کوڑے کی طرح لگا تھا۔ دوسری سمت یک لخت خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ کسی قدر تاخیر سے مگر تپے ہوئے انداز میں گویا ہوا تھا۔

”مجھے بہت اچھی طرح سے اندازہ ہے، جتنی اہمیت تمہارے نزدیک میری ہے۔“

”عجیب انداز تھا، نفرت سے بھیچا ہوا، شاک کی پن سمئے۔ ایمان گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

”میں آپ کی غلط فہمیاں دور کرنے سے قاصر ہوں۔“

اس نے کسی قدر عاجز ہو کر کہا تو ولید طنزیہ ہنسی ہنسا۔

”غلط فہمیاں ہوں تو دور کروں ناں.....؟“

ایمان نے ہونٹ بھیجنے لئے۔ محبت کے اس سفر میں وہ کتنی اکیلی تھی، اس کا دل بوجھل ہونے لگا۔

”آپ مجھے لینے کب آئیں گے.....؟“

”تمہیں اس بات میں دلچسپی ہے.....؟“

جواباً وہ زہر خند سے بولا تھا اور ایمان نے خود پر ضبط کرنے کی خاطر ہونٹ بھیجنے لئے تھے۔

”مجبوریوں کے رشتے غیر مستقل اور غیر متوازن ہی ہوتے ہیں۔ سمجھ لو فی الحال مجھے تمہاری ضرورت

نہیں ہے۔ اگر کبھی محسوس کی تو آ جاؤں گا۔“

اس قدر بے مروت، توہین آمیز انداز پہ ایمان غیض اور خفت سے منجمد بیٹھی رہ گئی۔ اس مرتبہ ولید نے خود رابطہ منقطع کیا تھا۔ وہ ساکن سی اپنے ہاتھ میں موجود موبائل کی تاریک ہوتی اسکرین کو گھورتی رہی۔ اس سے کوئی بہت اچھی توقعات تو اس نے وابستہ ہی نہیں کی تھیں، مگر وہ ایسی انتقامی کارروائی پہ اُتر آئے گا.....؟ یہ بھی کم از کم ایمان نے نہیں سوچا تھا۔

لانا جو اس سے اسی ایک ہفتے میں ہی متعدد بار ولید کے نہ آنے اور اس کے واپس جانے کے متعلق استفسار کر چکی تھیں، اب آنے والی صورت حال سے کیسے پنپنا ہے، ہر سوال کرتی نظروں کو سہنا ہے۔ یہ سوچ کر ہی اس کا دل بے کل ہو جا رہا تھا۔

☆☆☆

”نوٹی ہے میری نیند مگر تم کو اس سے کیا؟

بچتے رہیں ہواؤں سے در تم کو اس سے کیا؟

تم موج موج مثل صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پرتم کو اس سے کیا؟
اوروں کا ہاتھ تھا مو انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر تم کو اس سے کیا؟
اب گرین پا کو برسنے سے کیا غرض
پسی میں بن نہ پائے گھر تم کو اس سے کیا؟
لے جائیں مجھ کو مالی غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا؟
تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لئے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا؟“

اس نے آہستگی سے پروین شاکر کی کتاب بند کر دی۔ زندگی پہ ایک دم ہی کیسا جمود طاری ہو گیا تھا۔
کتنا تھکا دیا تھا اس سفر لا حاصل نے اسے۔ وہ سوچتی محبت کے اس سفر میں اس نے کیا پایا ہے، تو دل اس
خسارے پہ افسردگیاں سمیٹ لاتا۔ کھڑکی کی سلائیڈ کھول کر وہ شام کے سایوں کو اندھیروں میں مدغم ہوتا دیکھ رہی
تھی، جب دروازہ ناک کر کے ملازمہ نے اندر جھانکا۔
”چھوٹی بی بی.....! آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں، جلدی آئیں، ولید صاحب آئے
ہیں۔“

ملازمہ کی اطلاع پر ایک دم اس کا دل بہت زور سے دھڑکا اور دھڑکتا ہی چلا گیا۔

☆☆☆

میں ابھرتا اس کا عکس اتنی سی توجہ پا کر ہی کھل اٹھا تھا۔

جس وقت وہ نیچے آئی، ولید خفیف سا جھک کر ٹیبل پر چائے کا خالی مگ رکھ رہا تھا۔ سیدھے ہوئے پہ اس کی نگاہ ایمان کے شگفتہ گلاب کی مانند کھلے کھلے چہرے سے ٹکرائی تو کچھ لمحوں کو وہ اس کے دلکش چہرے سے نگاہ ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

”او کے ماما.....! اللہ حافظ.....! پاپا کو سلام کہہ دیجئے گا میرا۔“

ولید کو اٹھتے دیکھ کر وہ ماما سے الوداعی کلمات ادا کرنے لگی۔

”خوش رہو.....! آباد رہو ہمیشہ.....!“

ماما نے اسے گلے لگا کر دُعا دی تھی۔

”تائی ماں اور باقی سب گھر والے ٹھیک تھے ناں.....؟“

وہ اس کے ساتھ گاڑی میں آکر بیٹھی تو یوں ہی سبیل تذکرہ پوچھ لیا تھا۔

”کیوں.....؟ انہیں کیا ہونا ہے.....؟“

وہ جواب میں اسے پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ ایمان کو ایک دم چپ سی لگ گئی۔

اور یہ کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے ناں، زندگی کا جب جان سے پیارے رشتے خفا ہو جائیں۔ زندگی ایک دم کتنی پھیکی، کتنی بے رونق اور مضحل سی لگنے لگتی ہے۔ وہ اسے مٹانا چاہتی تھی، مگر بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ مٹا نہیں پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس بے بسی کے احساس سمیت بھیگ رہی تھیں، جب ولید نے گاڑی گیٹ سے نکالتے ہوئے اس کا دُھواں ہوتا چہرہ دیکھا تھا اور بغیر کسی تاثر کے منہ پھیر لیا۔ ایمان نے بھیچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ سر جھکا لیا تھا۔

”میں اس کے سارے رُویوں پہ معترض ہوئی

میری طرح سے مگر تھا دُکھا ہوا وہ بھی

میں اس کی کھوج میں دیوانہ وار پھرتی رہی

اسی گن سے کبھی مجھ کو ڈھونڈتا وہ بھی

گلی کے موڑ پہ دیکھا اسے تو کیسی خوشی

کسی کے واسطے ہوگا زکا ہوا وہ بھی“

اس کے آنسو پہ آنسو گرتے رہے تھے۔ اس کے سامنے رو کر وہ اسے مزید طیش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ولید حسن نے سگریٹ سلگا لیا تھا، ساتھ ہی گویا وہ بھی سلگ اٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے پیچھے دوں میں انفکشن ہے، اور ڈاکٹر نے اسے سگریٹ نوشی سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ تاؤ جی تو خاص پہرہ کرتے تھے اس کا۔ مجال تھی جو وہ ان کے سامنے سگریٹ پی لیتا، بلکہ ان کے پاس جانے سے قبل وہ ہر ایسا آثار مٹا دیا کرتا تھا جس سے انہیں شک بھی گزرے۔

”کیوں کر رہے ہیں یہ بے احتیاطی.....؟ آپ کو پتا ہے ناں اسونگ ٹھیک نہیں ہے آپ کے

لئے.....؟“

اسے ایک دم ایسا لگا تھا جیسے اس کے مردہ تن میں نئی جان آگئی ہو۔ ملازمہ کی پوری بات سنے بغیر ہی وہ ہرنی کی طرح سے قلائعیں بھرتی سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی تو اسے ہال کمرے میں لگی چغتائی کی پورٹریٹ میں گم پایا تھا۔ اس کے قدموں کی آہٹ پہ گردن موڑی۔

جوش مسرت سے چمکتا چہرہ، متمتاتے زخار اور آنکھوں میں ڈھیر ساری چمک لئے وہ ایک بار پھر اسے چونکا گئی۔ پتا نہیں کیوں وہ اپنے رُویوں میں اتنی متضاد کیوں تھی.....؟ وہ اکثر اس کی وجہ سے الجھتا رہتا۔

”آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں.....؟ اندر آئیے ناں.....!“

اس کی پرتپش گہری نگاہوں کے ارتکاز پہ ایمان کی پلکیں حیا بار انداز میں جھک کر لرزنے لگی تھیں۔ ولید نے چونک کر سر جھکا۔

”تمہیں لینے آیا ہوں، چلو.....!“

”اس وقت.....؟“

وہ تھیری ہو کر وال کلاک کی سمت متوجہ ہوگی۔

”نکاح کے وقت تم نے یہ شرط تو نہیں بتائی تھی کہ تم مخصوص اوقات میں ہی میرے ساتھ چل سکتی

ہو.....؟“

ایک ایک لفظ چپا کر ادا کرتے ہوئے وہ تھیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ ایمان ایک دم بخول سی ہو گئی۔

”میں تیار ہو کر آتی ہوں، آپ تب تک بیٹھے تو سہی.....!“

اسی وقت ماما آگئیں۔

”آؤ بیٹا.....! چائے تو پیو، کھانے سے تو منع کر دیا ہے۔“

”جی.....! ناؤم بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ گاؤں کا راستہ تھوڑا خطرناک ہے ناں، اس لئے بابا رات کو سفر

کرنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔“

وہ مؤدب انداز میں جواب دیتا ان کے ساتھ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گیا، تب ایمان ایک سرخوشی کی کیفیت میں اپنے کمرے میں آکر تیار ہونے لگی تھی۔

”ڈیپ ریڈ کلر کے ایمرائیڈ سوٹ کے ساتھ اس نے پرل کا سیٹ پہن لیا۔ بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی اور میک اپ کے نام پہ صرف نیچرل پنک کلر کی لپ اسٹک لگا کر ہی اس کی تیاری مکمل تھی۔ مگر آئینہ

تھا اور اس کے ہونٹوں کے درمیان رکھ کر لائٹر اٹھا لیا۔

ایک شعلہ بھڑکا، صرف سگریٹ ہی نہیں، ایمان کا دل بھی اس آنچ سے جھلس گیا تھا۔ کیسا مشینی عمل تھا یہ سارا، جس میں جذبات کا کوئی عمل دخل ہی نہ رہا تھا۔ وہ جیسے اس پل کسی پتھر کی مورقی میں ڈھل گئی تھی۔ ولید نے اپنی فتح پہ جتانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا، مگر وہ اس کی سمت متوجہ کہاں تھی.....؟

”حیرت ہے، ویسے میرا تو خیال تھا، یہ میری بات سن کر تم سگریٹ کیس اور لائٹر کھڑکی سے باہر پھینک دو گی، اور مجھے اپنی بات رکھنے کی خاطر تمہیں طلاق دینا پڑتی۔ افوہ یار.....! کتنا سنہرا چانس بس کر دیا تم نے.....؟“

وہ اب نئے انداز میں اس کا تسخر اڑا رہا تھا اور ایمان سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ آیا اس نے کبھی محبت کی بھی تھی.....؟ شاید نہیں.....! یا پھر شاید اس کی محبت ہمیشہ درجہ دوم پر رہی تھی۔ اس کی محبت اور انا میں پہلی ترجیح ہمیشہ اُندہ ہی رہی تھی۔ یہ بات نئی تھوڑا ہی تھی، مگر وہ پتہ نہیں کیوں پھر بھی نئے سرے سے دکھی ہو رہی تھی.....؟

☆☆☆

”تمہاری زندگی میں، میں کہاں پر ہوں

ہوئے صبح میں یا

شام کے پہلے ستارے میں

جھجکتی بوند باندی میں

کہ بے حد تیز بارش میں

رو پہلی چاندنی میں

یا کہ پھر تپتی دو پہروں میں

بہت گہرے خیالوں میں

کہ بے حد سرسری دھن میں

تمہاری زندگی میں، میں کہاں پر ہوں

کارہجوم سے گھبرائے ساحل کے کنارے پہ

کسی ویک اینڈ کا وقفہ

کہ سگریٹ کے تسلسل میں

تمہاری انگلیوں کے بیچ کوئی

بے ارادہ ریشمیں فرصت

کہ جامِ سرخ سے یکسر تہی

اور پھر سے بھر جانے کا خوش آداب لمحہ

کہ خوابِ محبت ٹوٹنے اور

جب اس نے دوسرے کے بعد تیسرا سگریٹ سلگایا تو ایمان کا ضبط بالآخر چھلک گیا تھا۔ یہ اس کی اوقات سے بہت بڑی جرأت تھی کہ اس نے ولید کے ہاتھ کی انگلیوں میں دبے سگریٹ کو چھین کر کھڑکی کے رستے باہر اُچھال دیا تھا۔ ولید پہلے تو اس کی حرکت پہ دنگ رہ گیا تھا، پھر گویا اپنے حواسوں میں نہیں رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے سائیڈ پہ کر کے گاڑی روکی تھی، پھر اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ ایمان کے چہرے پر دے مارا تھا۔

”ماؤ ڈیز یو.....؟“

اسے کاندھوں سے دبوچ کر اپنی جانب گھسیٹا ہوا وہ قہر بن کر چیخا تھا۔ ایمان کے گال پہ اس کی انگلیاں ہی ثبت نہیں ہوئی تھیں، اس کے ہونٹ کا کنارہ بھی پھٹ گیا تھا، جس سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم بے اوسان اور سراسیمہ ہو کر ہراسگی کے عالم میں اسے تنکے لگی۔ اشتعال اور وحشت سے پھرا ہوا اس کا روپ اب اس کے لئے پتا نہیں جانے کیا تھا، اس پل اس کی پھیلی پھیلی نگاہوں میں کہ ولید نے اسے قہر بھرے انداز میں واپس اس کی سیٹ پر پٹخ دیا۔

کچھ دیر گہرے گہرے سانس بھر کے اپنے وحشی جذبوں کو قابو کیا، پھر ڈیش بورڈ پہ پڑے سگریٹ کیس اور لائٹر کی سمت اشارہ کرتا ہوا تحکم بھرے خشک انداز میں گویا ہوا تھا۔

”سگریٹ اٹھاؤ وہاں سے اور اسے میرے ہونٹوں کے درمیان رکھ کر لائٹر سے اسے سلگاؤ، ورنہ.....“

ایمان جو ہونٹ بھیجنے خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی، اس نئے آرڈر پر ٹھکی۔

”ورنہ کیا.....؟“

وہ گویا اس کی وحشت کی انتہاء دیکھنا چاہتی تھی۔ ولید نے اپنی جلتی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑھ دیں۔

”ورنہ یہ کہ آج میری ضد ہے کہ تم ایسا کرو گی، ہر صورت، ہر قیمت.....!“

وہ اس کی کلائی پکڑ کر مروڑتے ہوئے پھنکارا۔ اس کی گرفت میں ٹوٹی چوڑیوں کی کرچیاں ایمان کی کلائی کو زخمی کرنے لگی مگر وہ ضبط کئے رہی تھی۔

”اگر میں ایسا نہ کروں تو.....؟“

ایمان کو بھی جیسے ضد ہو گئی تھی۔ ولید نے کچھ کہے بغیر محض سر و نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”تم ایسا کرو گی۔“

اس نے ڈیش بورڈ پہ پڑی سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر اس کی گود میں پھینکی اور اسی سرد آواز میں بولا تھا۔

”نکالو اس میں سگریٹ اور ویسا ہی کرو جیسا میں نے کہا ہے۔ ورنہ میں ابھی اسی وقت تمہیں طلاق

دے دوں گا۔ اپنی انسٹ کا بدلہ تو لے چکا ہوں نا تم سے، پھر تم جہاں مرضی دفغان ہونا، مجھے اس سے غرض نہیں ہوگی۔“

اندر اُندتا جلال دبائے بغیر وہ درشتی سے کہتا ایمان کو لحوں میں زیر کر گیا۔ ایمان کا چہرہ سکی سے ہی نہیں، شدتِ غم سے بھی سرخ ہوا تھا۔ ایک لفظ بھی کہے بغیر اس نے کانپتے ہاتھوں سے کیس کھول کر سگریٹ نکالا

اشعر نے آنکھیں میٹا کر کہا تو فضا نے بے ساختہ اس کی سمت دیکھا تھا۔

”ہاں بولو.....!“

”آپ ان کے لئے جھجکتی بوندا باندی اور سرسری دھن میں ہیں، جبکہ ولی بھائی کے لئے ایمان

جی.....“

اس نے بات اُدھوری چھوڑی اور دونوں پر ایک معنی خیز قسم کی نگاہ ڈالی۔ ایمان نے دانستہ لگا ہیں اٹھائیں جبکہ ولید سرسری انداز میں ضرور اشعر کی سمت متوجہ تھا۔

”روپہلی چاندنی میں ہیں۔“

اشعر نے کہا اور ایمان کا جانے کب کا اٹکا ہوا سانس بحال ہوا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ان کے مابین جو

کچھ بھی تھا، اس پر پردہ پڑا ہوا تھا اور یہ ہی بہتر بھی تھا۔

”ہم محبت کے خرابوں کے مکین

وقت کے طول المناک کے پروردہ ہیں

ایک تاریک ازل تو رابد سے خالی

ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو

سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا

اپنی تہذیب کی پاکوبی کا حاصل پایا

ہم محبت کے نہاں خانوں میں بسنے والے

اپنی پامالی کے افسانوں پہ ہنسنے والے

ہم سمجھتے ہیں کہ نشان سیر منزل پایا“

اشعر کے کہنے پہ وہ کسی کی سمت بھی دیکھے بغیر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بہت جذب سے پڑھنے لگا تھا۔ اس کا موڈ کس قسم کا ہے، ایمان کو قطعی سمجھ نہیں آ سکی تھی۔

”ہم محبت کے خرابوں کے مکین

کنج ماضی میں ہیں

باراں زدہ طائر کی طرح آسودہ

اور کبھی فتنہ نازہ سے ڈر کر چو نکلیں

تو یہی سیاہ نگاہ بھاری پردے

ہم محبت کے خرابوں کے مکین

ایسے تاریک خرابے کہ جہاں

دُور سے تیز پلٹ جائیں ضیا کے آہو

بس ایک صدا گونجتی ہے

شب آلام کی یا ہو یا ہو

دوسرا آغاز ہونے کے مابین

اک بے نام لمحے کی فراغت

تمہاری زندگی میں، میں کہاں پر ہوں“

فضہ نے نظم مکمل کی اور کسی قدر شوخی سے عاقب کو دیکھا جو مسکراہٹ ضبط کر رہا تھا۔

”یار.....! اس قسم کے سوال سب کے درمیان تھوڑا ہی کئے جاتے ہیں.....؟“

وہ جیسے کئی کترا رہا تھا۔ فضہ اسے گھورنے لگی۔ اس وقت وہ سب ٹی وی والے کمرے میں جمع تھے۔

یہ اتفاق تھا کہ ایمان اور فضہ کھانا کے بعد فرصت سے وہاں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھنے لگی تھیں کہ اشعر نے آکر چینل

بدل دیا۔

”مجھے میچ دیکھنا ہے۔“

”مگر ہمیں بھی ڈرامہ دیکھنا ہے۔“

فضہ نے اسے گھورا تھا۔

”چھوڑو یہ دونوں بھی دیکھنے کی چیزیں ہیں.....؟ ناک شود دیکھتے ہیں۔“

عاقب نے آکر ایک نئی بات کر دی۔ اشعر بے ساختہ ہنسنے لگا۔

”یہ نقصان ہے ایک ٹی وی کا۔ ہر بندے کے مطلب کی تفریح فراہم نہیں کر سکتا ایک ناظم میں

بیچارہ.....!“

”ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اسے دفعہ کرو.....؟ ہم آج گزرے وقت کو یاد کرتے ہیں۔“

عاقب کے آئیڈے پر اشعر نے آنکھیں پھیلانی تھیں۔

”کیا مطلب.....؟ گزرا وقت.....؟“

”یار.....! جب شادی سے قبل ہم اپنے اپنے دلی جذبات شاعری کی زبان میں ایک دوسرے تک

پہنچایا کرتے تھے۔“

وہ مسکرا رہا تھا۔ اشعر فوراً مان گیا۔ یوں ٹی وی آف ہوا اور وہ سب وہیں پر براجمان ہو گئے۔

”جاؤ اشعر.....! ولید کو بلا کر لاؤ.....!“

”انہیں تو بلا لاؤں، لیکن میرے والی کہاں چھپی بیٹھی ہے، کم بخت.....! جسے ابھی تک میرا خیال نہیں

آیا۔“

اشعر کی بات پہ وہ سب ہنس پڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی اشعر ولید کو کھینچ کھانچ کے لے آیا تھا۔

”خیریت.....؟ کیوں بلوایا ہے.....؟“

اس کے انداز میں کسی قدر تشویش تھی۔ نگاہ بے ساختہ سر جھکائے بیٹھی ایمان میں الجھی تھی۔

”بیٹھو یار.....! تھینک گاڈ.....! کہ ہر لحاظ سے خیریت ہے۔“

عاقب نے اسے ایمان کے برابر دھکیل دیا۔ وہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گیا تھا۔

”یہ جواب کہاں دیں گے.....؟ میں بتاتا ہوں، بلکہ آپ کا کیا، ان کا بھی بتا سکتا ہوں۔“

ہم محبت کے خوابوں کے کئیں
ریگ دلدوز میں خوابوں کے شجر بوتے ہیں

سایہ ناپید تھا

سائے کی تمنائے سوتے رہے

”افوہ.....! آپ نے بھائی بیگم کی شان میں قصیدہ پڑھنے کی بجائے پھر المیہ شاعری کی سلیکشن کیوں کی.....؟“

اشعر کے بے حد اعتراض ہوا تھا۔ عاقب نے شد و مد سے سر اثبات میں ہلا کر گویا اس کی تائید کی تو ولید نے کاندھے اُچکا کر لولی لنگڑی سی توجہ دی تھی۔

”اچکھو کلی مجھے قصیدہ خوانی کرنی نہیں آتی ناں.....!“

”امیزنگ..... اتنی خوب صورت پیاری سی بیوی کو پہلو میں بٹھا کر بھی آپ یہ بات کہہ رہے ہیں۔“
اشعر نے آنکھیں پھیلا کر تحیر کا اظہار کرتے ہوئے باقاعدہ جرح کا آغاز کیا مگر وہ بڑی صفائی سے پہلو بچا گیا تھا۔

عاقب کا کاندھا ہلا کر یہ کہتے ہوئے

”چل یار.....! تو کچھ سنا، میں اسے مطمئن نہیں کر سکتا۔“

”تو یار.....! تو اسے کچھ اور سنا کر مطمئن کر دے ناں.....!“

عاقب نے اسے نئی راہ دکھائی تو وہ جیسے کچھ دیر کو کسی سوچ میں ڈوبا تھا، پھر گویا آمادگی ظاہر کر دی۔ ہلکا سا گلا کھنکارا اور اس مرتبہ اپنے پہلو میں بیٹھی گم سم نظر آتی ایمان کو دیکھتے ہوئے گنگنایا تھا۔

”وہ اک معصوم سی چاہت

وہ اک بے نام سی الفت

وہ میری ذات کا حصہ

وہ میری زیت کا قصہ

مجھے محسوس ہوتا ہے

وہ میرے پاس ہے اب بھی“

ایمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لینے پہ چونک کر اسے دیکھا تھا، مگر وہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھا۔ اس کی کلائی میں پڑی چوڑیوں سے کھیل رہا تھا۔ ایمان کا دل اس کی آواز کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ دھڑکنے لگا۔

”وہ جب جب یاد آتا ہے

نگاہوں میں ساتا ہے

زباں خاموش ہوتی ہے

مگر یہ آنکھ روتی ہے

میں خود سے یو جھ لیتا ہوں

اسے کیا پیار تھا مجھ سے“

ایمان ایک دم ساکن ہو گئی۔ ولید خاموش ہو چکا تھا، اس کا وہ بے دھیانی میں کھیلا جانے والا کھیل بھی

رُک چکا تھا۔

”ایکی بھابو.....! ذرا پوچھیں ان سے، ابھی یہ کس نار کا قصہ سنا کر بٹے ہیں.....؟ کہیں کوئی انگلینڈ کی

گوری تو نہیں.....؟“

اشعر کو تو موقع چاہئے تھا، بے ٹکان بولنے کا، مگر اب کی مرتبہ کسی نے بھی اس کی بات کو بڑھاوا نہیں

دیا، اور عاقب نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا، اور خود سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ بھی ایک گویا انداز تھا۔ سب کو اپنی

طرف متوجہ کرنے کا۔

”دل عشق میں بے پایاں سودا ہو تو ایسا ہو

دریا ہو تو ایسا ہو صحرا ہو تو ایسا ہو

ہم سے نہیں رشتہ بھی ہم سے نہیں ملتا بھی

ہے پاس وہ بیٹھا بھی دھوکہ ہو تو ایسا ہو“

”چلیں جی.....! یہ خوب رہی۔ ہم ایک طرف ہی مشکوک ہو کر دیکھتے رہے، یہاں تو ہر طرف یہی

حال ہے۔ الرٹ فضا بھابی.....! الرٹ.....!“

اشعر فضا کے کان میں گھس کر بولا اور اس نے مصنوعی خفگی سے اسے ایک جھانپڑ لگا دی۔

”وہ بھی رہا بے گانہ ہم نے بھی نہ پہچانا

ہاں اے دل دیوانہ اپنا ہو تو ایسا ہو

ہم نے بھی یہی مانگا اس نے بھی یہی بخشا

بندہ ہو تو ایسا ہو داتا ہو تو ایسا ہو

اس درد میں کیا کیا ہے رسوائی بھی ذلت بھی

کانٹا ہو تو ایسا ہو چھتا ہو تو ایسا ہو“

”چلیں.....! اب پوچھیں ذرا ان سے، ان کے بھی کان کھینچیں۔“

اشعر پھر سے اسے بھڑکانے کی اپنی سی کوشش کرنے لگا۔ فضا نے بے دریغ گھورا۔

”بکومت.....!“

”ہاں.....! میں تو بکتا ہوں ناں.....! تب پتا چلے گا، جب یہ کوئی چاند چڑھائیں گے۔“

وہ روٹھ سا گیا۔ پھر جیسے ایک دم کچھ یاد آنے پر پھڑک کر بولا تھا۔

”فضا جی.....! آپ کے لئے ایک شعر ابھی ابھی نازل ہوا ہے، اجازت ہو تو عرض کروں.....؟“

فضا نے شان بے نیازی سے گردن ہلا دی اور اشعر نے مسکراہٹ چھپائی تھی۔

”ہونٹ تمہارے کلیاں ہیں ناک تمہاری بھدی سی

رنگ تمہارا گورا ہے مگر تم ہوا ذرا موٹی سی“

فضہ ایک دم جھینپ کر اپنا دوپٹہ پھیلائے لگی۔ وہ پریکٹ تھی، اس کا جسم واقعی مٹاپے کی طرف مائل تھا۔
”بہت بد تمیز ہوں تم۔!“
خفت مٹانے کو وہ بھی کہہ سکی۔

”ایمی جی.....! کبھی تو خود سے بھی کچھ سنا دیا کریں۔ ہر بار دست بستہ گزارش کرنا پڑتی ہے۔“
فضہ کا پیچھا چھوڑ کر وہ اس کی طرف رخ روشن کر کے بولا تو ایمان نے فوراً آمادگی ظاہر کر کے جان

چھڑائی۔

”کبھی شبوں کے اُداس آنگن میں یاد اترے
یا چاندنی اپنے بال کھولے
کواڑ کے روزنوں سے جھانکے
کتاب کھولو تو میرا عکس جھللائے
ستارہ پلکوں پر جگمگائے
کبھی جو کمرے کی کھڑکیوں سے ہوا کا جھونکا
گلاب رُت کی نوید لائے
شدید بارشوں کے موسموں میں
حسن بیلوں کے پھول جھو میں
دُعا کی خاطر جو ہاتھ اٹھیں
بادل کے صحراؤں میں بگولوں کا شور بھاگے
کبھی سسکتی ہوئی سحر میں
کبھی سرشام درد سانسوں میں پھیل جائے
یا پھر آسمان پر ہر سمت ستارے ٹکرائیں
دل کہے یہ
سدا جیئے تو

نہ ڈھوپ ہو دکھ کی سر پر
کبھی مقدر فراق لمحوں کا روگ بن کر
زبان کو دکھ کی تلاوتیں دے
اگر کبھی محفلوں میں
لوگوں کے تہقہوں میں
اکیلے پن کا خیال آئے
خراب موسم میں گھر سے نکلے ہوئے
پرندوں کا خیال آئے

تو جان لینا کہ کوئی تمہیں

یاد کر رہا ہے

اس نے جھکی ہوئی پلکوں کے باوجود ولید حسن کی نگاہوں کی تپش سے اپنا وجود سلگتا ہوا محسوس کیا تھا۔
جبھی بعد میں بھی دانستہ نظریں نہیں اٹھائیں۔

”کہاں.....؟“

اسے اُٹھتے دیکھ کر عاقب نے بے ساختہ ٹوکا تھا۔ ایمان بھی متوجہ ہوئی۔

”چلتا ہوں یار.....! اب بیٹھا نہیں جا رہا، نیند آرہی ہے، کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”کچھ دیر بیٹھو ولی.....! چائے پیٹے ہیں یار.....!“

عاقب نے اصرار کیا، مگر وہ سہولت سے ٹال گیا۔

”ٹھیک ہے.....! چائے، مگر ہم آپ کی بیوی کو کوئی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔“

فضہ نے گویا اسے چھیڑا تھا۔ اس نے بے ساختہ ایمان کی طرف دیکھا۔ رنگ، خوشبو، رعنائی کا دلنشین
عظم، وہ پلکیں جھپکاتی موم کی گڑیا سے مشابہ لگی۔

”بھد شوق روک لیں۔“

وہ کا ندھے اُچکا کر کہتا کمرے سے نکل گیا۔ ایمان اس درجہ نخوت کے مظاہرے پر وہ بھی سب کے
سامنے خفیف سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

”چائے کے ساتھ کیا بناؤں.....؟“

فضہ نے اُٹھتے ہوئے سوال کیا تھا اور گویا تینوں سے کیا تھا، مگر جواب صرف اشعر کی طرف سے آیا۔

”چپس تل لیں، ساتھ میں کباب بھی فراہم کر لیجئے۔“

”تم بیٹھو ایمی.....! میں کر لوں گی۔“

اسے اُٹھتے دیکھ کر فضہ نے ٹوکا تھا۔

”وہ کہہ رہے تھے طبیعت ٹھیک نہیں، پوچھتی ہوں کیا ہوا.....؟“

وہ آہستگی سے کہہ رہی تھی۔ اشعر نے ٹھنڈا سانس کھینچا۔

”مجھے تو پہلے ہی پتا تھا، اب یہ ہمیں کہاں لفٹ کرائیں گی.....؟“

وہ بسور کر کہہ رہا تھا۔ ایمان اس کی بات پہ دھیان دیئے بغیر باہر نکل گئی۔ وہ اوپر کمرے میں آئی تو
ولید شرٹ اُتارے بستر میں گھسا ہوا تھا، مگر اس طرح کہ آدھے سے زیادہ کمرے سے باہر تھا۔ دراز کھنگالتا ہوا شاید
سگریٹ ڈھونڈ رہا تھا۔ ایمان نے کچھ کہے بغیر لائٹر اور سگریٹ کیس اس کے سامنے کر دیا۔ وہ بری طرح سے
چونکا تھا اور سلگتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ میں یہ ڈھونڈ رہا ہوں.....؟“

اس کے بھڑک اُٹھنے پر ایمان شپٹا کر گھبرائی۔ اس نے کسی قدر متحیر نظروں سے اسے دیکھا۔

”سوری.....! مگر پھر کیا چاہئے.....؟“

”کم از کم تم نہیں.....!“

اس نے ہونٹ سکڑ کر برہمی سے کہا تو ایمان ہونٹ بھیج کر رہ گئی جبکہ وہ پھر سے سابقہ شغل میں مگن ہو چکا تھا۔ ایمان دھندلاتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”طبیعت کو کیا ہوا ہے.....؟“

وہ اتنی بے بسی، بے اعتنائی کے باوجود اس دل کا کیا کرتی جو مضطرب ہوا جا رہا تھا.....؟

”شاید ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ یہاں وکس رکھی تھی، تم نے تو کہیں ادھر ادھر نہیں رکھ دی.....؟“

اس مرتبہ لہجہ و الفاظ قدرے بہتر تھے۔ ایمان کا حوصلہ کچھ بحال ہوا۔ وہ تیزی سے بڑھی اور سب سے نیچے راز سے وکس کی ڈبیا نکال لی۔

”لیٹیں، میں لگا دیتی ہوں۔“

وہ کسی قدر جھجک کر گویا ہوئی تھی۔ ولید نے کچھ کہے بغیر عمل کیا تھا۔ ایمان اس کے سینے پر اور ماتھے پر باری باری وکس کا مساج کرتی رہی اور وہ اس کے ہاتھوں کی نرمی، گداز اور ملائمت کو محسوس کرتا عجیب سے احساسات کا شکار ہوتا رہا تھا۔

”چلیں.....! سو جائیں اب.....!“

ایمان اپنے دھیان میں تھی، اس کی محویت نوٹ نہ کر سکی۔ جیسے ہی کبل اس پر برابر کر کے اٹھنے لگی، ولید نے اس کا ہاتھ اچانک اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ بے دھیان تھی، اسی جھوک میں اس کے اوپر آگری۔ ابھی سنبھل کر اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ ولید نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر دیا تھا۔

”اک بات بتاؤ گی.....؟ بالکل سچ.....؟“

اس کا چہرہ ایمان کی گردن سے سچ ہو رہا تھا۔ ایمان پر اس کی قربتوں کا سحر طاری ہونے لگا۔

”سچ..... جی.....! کون سی بات.....؟“

اس کے لہجے کی سنجیدگی پہ وہ بوکھلانے لگی۔

”پہلے وعدہ کرو.....! بالکل سچ بولو گی.....؟“

وہ مصر تھا، ایمان کا دل بہت تیز دھڑکنے لگا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا تھا.....؟ مجھے دھوکہ کیوں دیا تھا.....؟ پھر اب سب کو دھوکہ کیوں دے رہی ہو.....؟“

اس کے استفسار پہ ایمان کا وجود ساکن ہو گیا۔

”بولو.....! بتاؤ.....!“

وہ پھر سے خوشی ہونے لگا، مگر ایمان کے پاس اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش رہی تھی اور ولید کو اس کی یہ خاموشی پھر سے پھرانے لگی تھی، مگر وہ چپ چاپ اس کا ہر ستم سہتی رہی تھی، روتی رہی تھی۔

جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں بدن کو ناؤ لہو کو چناب کر دے گا میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی وہ جھوٹ بولے گا اور لا جواب کر دے گا انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے وہ اٹھ کے میری ہر کتاب کر دے گا“

اگلی صبح اسے اٹھنے میں اتنی دیر ہوئی تھی کہ تمام ترکوشش کے باوجود نماز ادا نہیں کر سکی۔ ولید آج کسی انٹرویو کے سلسلے میں شہر جا رہا تھا، جب تک وہ واش روم سے باہر آئی، وہ تیار ہونے کے بعد نیچے جا چکا تھا۔ ایمان نے پہلے اس کا پھیلا ہوا سامان سمیٹا، کبل تہہ کر کے رکھا، بیڈ شیٹ درست کی، اس کے تویے کو اٹھا کر باہر بالکونی کی ریلنگ پر پھیلا یا اور پرفیوم کے ساتھ مختلف لوشنز کی بوتلوں کو درست کر کے ڈانٹنگ نیبل پر رکھنے کے بعد شال لیٹتی نیچے چلی آئی۔

ولید بڑے کمرے میں عاقب اور اشعر کے ساتھ موجود تھا، مگر اخبار میں گم۔ عاقب ناشتہ کرنے میں مصروف تھا، جبکہ اشعر کو اس کی کتاب کھولے رٹا مارنے میں۔ وہ ایک نگاہ میں جائزہ لیتی ابھی پلٹ ہی رہی تھی کہ فضلہ ناشتے کی ٹرے لئے چلی آئی۔

”ایمی.....! پہلے ناشتہ کرو، پھر کچھ اور کرنا۔“

فضلہ نے نیبل پر ناشتے کے لوازمات لگاتے ہوئے کہا تو ولید نے اخبار سے نگاہ اٹھا کر دونوں کو دیکھا تھا۔

”اسے کب تک آپ نے چوتھی کی دہلہ بنائے رکھنا ہے بھابی.....؟ کام کیوں نہیں کرواتی ہیں.....؟“

جہاں فضلہ چوکی تھی، ایمان ایک دم خفت زدہ نظر آنے لگی۔

”افوہ.....! کرتی ہے کام، تمہیں اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے.....؟“

فضلہ کا انداز ہلکا پھلکا ہی تھا۔

”میں تو ہر وقت آپ کو ہی کاموں میں لگے دیکھتا ہوں، یا پھر اماں کو۔ یہ تو پہلے کی طرح اب بھی بس عیش ہی کرتی ہیں۔“

اس کے لہجے میں اتنی بے زاری اور تلخی تھی کہ عاقب کے ساتھ ساتھ اشعر نے بھی ٹھٹھک کر ولید کی صورت دیکھی تھی۔ جبکہ ایمان صبح صبح ہونے والی اس عزت افزائی پہ اپنی پیشانی جلتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

”ولید.....! کیا ہو گیا ہے یار.....! رسم کے مطابق اماں پہلے ایمان سے بیٹھا ہوا تیں گی، پھر وہ کام بھی کیا کرے گی۔ یہ اتنا بڑا ایٹو تو نہیں ہے کہ تم یوں خفا ہونے لگے ہو.....؟ بھی.....! وہ تو ہمارے لئے ابھی

بھی وہی گڑیا سی ایمان ہے، جو بات بات پہ روٹھ جایا کرتی تھی۔“

عاقب نے ہلے رسانیت سمیت ولید کو ٹوکا، پھر گوما ماحول کی گبیہرتا دُور کرنے کی خاطر کسی قدر خوش دلی

مارے گھر کا کام کرتی ہو۔ تھکن تو ہوتی ہوگی.....؟“
 ”اپنوں کی محبت، ستائش اور دعائیں مجھے تھکنے نہیں دیتیں ایسی.....! پھر ڈاکٹر نے بھی تو مجھے کام کرنے کی تاکید کی ہے ناں.....!“

اپنی بات کے اختتام پہ وہ دانستہ مسکرائی تھی۔
 ”ضرور کرو.....! مگر سارا نہیں، صرف اتنا جتنا تم آسانی سے کر سکو۔“
 رسانیہ سے کہہ کر وہ برتن دھونے میں مشغول ہو گئی تھی۔ فضہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

”جناباں نے پھل مار یا میری روح پلک تک روٹی
 لوکاں دے پھراں دی مینوں پیڑ ذرا دی نہ ہوئی“
 دوا کے ریڈیو پہ گیت چل رہا تھا جس کی آواز کھلے دروازے سے اس تک بآسانی پہنچ رہی تھی۔ چاول صاف کرتے اس کے ہاتھ اس زاویے پہ ساکن ہو گئے۔ سوز و گداز سے پُر لہجہ کارچاؤ الفاظ کی کرب ناکی نے لمحے کے ہزاروں حصے میں اس کی آنکھوں کو بھگو ڈالا۔

”پیار کسی کو کبھی نہ رہا! ایسے موڑ پہ لائے
 بھولنا چاہے بھی تو دل اس کو بھول نہ پائے
 مجھ جیسا درد ملا ایسی چوٹ نہ کوئی کھائے
 جناباں نے پھل مار یا میری روح پلک تک روٹی“

”ٹپ.....! ٹپ.....!“

دو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر چاولوں کی پرات میں گرے اور اسے خبر بھی نہ ہو سکی۔ اسی پل کچن کی سمت آتے ولید نے یہ منظر دیکھا تھا اور وہ وہیں رُک گیا تھا۔ تبھی اس سے بے زنی سے پوچھنے لگا۔
 ”کیوں رو رہی ہو.....؟“

وہ جو اس کی آمد سے بھی بے خبر تھی، آواز پہ اس بری طرح سے ڈر کر اُچھلی کہ گود میں پڑی پرات چاولوں سمیت پیچھے جا گری۔ فرش پہ جا بجا چاول بکھر گئے، جبکہ پرات زمین پہ ایک آدھ چکر کھانے کے بعد اوندھی جا پڑی تھی۔ ولید کی آنکھوں میں تسخّر جبکہ ایمان کے چہرے پر تاسف اور پشیمانی جھلکنے لگی۔
 ”کیوں کرتی ہو وہ کام جو تمہارے بس کا روگ نہ ہو.....؟“

ایمان نے ہونٹ کاٹ کر اسے دیکھا۔ بے بسی، خفت، گھبراہٹ اور خجالت نے مل جل کر اسے روہنا کر دیا تھا۔ وہ جھکی تھی اور بکھرے ہوئے چاول اکٹھے کرنے لگی۔

لابی انگلوں والے گلابی ہاتھ مصروف عمل تھے اور ولید کی نگاہ اس منظر میں اٹکنے لگی تھی۔ شریرائیں جنہیں وہ اسی مصروفیت کے عالم میں کانوں کے پیچھے اڑتی اور وہ پھر چل کر اس کے گال چومنے لگتیں۔ ولید کا اہنادل بھی انہی لٹوں کی طرح چملا تو بے ساختہ نگاہ پھیرتے ہوئے ہونٹ بھیجنے لئے۔

”میں چائے کی خاطر آیا تھا، یہاں پہ افتاد آ پڑی۔ بھابی کہاں ہیں.....؟“

سے ایمان کو دیکھ کر مسکرایا تھا، جو ہونٹ بھیچے آنکھوں میں اُٹتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں ہلکان ہو چکی تھی۔
 ”بالکل بالکل.....! مجھے لگتا ہے رات بھائی کی ایسی جی سے لڑائی ہوئی ہے، جو صبح صبح انہیں ڈانٹنا شروع کر دیا ہے۔ ایسی جی.....! آپ ذرا ابا اور ددا سے ان کی شکایت لگائیے گا۔“

اشعر نے بھی گفتگو میں حصہ لے کر گویا ایمان کو اس کیفیت سے نکالنا چاہا تھا، مگر اس کا چہرہ بتا رہا تھا، اشعر کی یہ کوشش کوئی اتنی کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ فضہ خاموش تھی، مگر اس کے چہرے کے تاثر سے صاف اندازہ ہو سکتا تھا کہ اسے ولید کی یہ حرکت اتنی پسند نہیں آئی ہے۔

”میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ بھابی اس گھر کی ملازمہ نہیں ہیں۔ اگر یہ برابر کی اس گھر میں حیثیت پا رہی ہیں تو پھر کام.....“

”ولید.....! یو دس ٹاپک یار.....!“

عاقب نے اس مرتبہ کسی قدر جھلا کر کہا تو ولید ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ ایمان کا زرد چہرہ سفید پڑنے لگا۔ کمرے میں موجود رہ جانے والے چاروں نفوس چند ثانیوں کو بالکل خاموش رہ گئے۔

”آئی تھک.....! ولی بھائی نے مانتا کیا ہے.....؟“

فضہ کی قیاس آرائی کسی حد تک درست تھی۔

”آپ کو کیا ضرورت تھی بیچ میں بولنے کی.....؟ میں کر رہی تھی ناں بات ایمان ان سے.....؟“

فضہ جھلا کر عاقب سے الجھ پڑی تو اشعر گہرا سا گیا۔

”پلیز.....! اب آپ لوگ نہ لڑ پڑیے گا.....؟“

عاقب ایک دم خاموش ہو گیا۔

”یہ ولی بھائی کو اتنا غصہ کیوں آ رہا تھا.....؟“

فضہ کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹک گئی تھی۔ اس کا دل انجانے خدشات کے پاتال میں ڈوبنے لگا۔

”ایمی.....! تمہارے ساتھ تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا ان کا.....؟“

فضہ کے سوال پر ایمان کا رنگ ایک دم فق ہوا تھا۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ رات وہ کس موڈ میں تھا.....؟

”افوہ بھی.....! تم اب اسے خواہ مخواہ پریشان مت کرو۔ پتا ہے ناں تمہیں، اس کی آفیشل پرابلم چل رہی ہے۔ بندہ کبھی ٹینس ہو ہی جاتا ہے۔ ڈونٹ وری.....! شام کو آئے گا تو بھلا چنگا ہوگا۔“

عاقب نے اپنے ساتھ ساتھ انہیں بھی تسلی دی تو سب خاموش ہو گئے۔ یہ الگ بات کہ اپنی اپنی جگہ پر ہر کوئی پریشان رہا تھا۔ عاقب اور اشعر کے ساتھ ساتھ تاؤ جی کے بھی چلے جانے پہ جب ایمان برتن سمیٹ کر سنک میں رکھنے کی بجائے دھونے کھڑی ہو گئی تو فضہ نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”کیا کرتی ہو ایمی.....؟ مجھے لگتا ہے، تم نے ولی بھائی کی بات کو کچھ زیادہ ہی دل پہ لے لیا ہے.....؟“

اور ایمان مضحل سے انداز میں مسکرا دی تھی۔

”وہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہے تھے فضہ.....! مجھے خیال کرنا چاہئے تھا۔ ایسی حالت کے باوجود تم

اپنی جھنجھلاہٹ کو اس نے اس ذریعے سے نکالا، ایمان کی خفت دوچند ہو گئی۔
”میں ابھی بنا دیتی ہوں۔“

اس کام کو ادھورہ چھوڑتی وہ مستعدی سے بولی۔

”مجھے پائے چاہئے میم.....! جوشاندہ نہیں.....!“

اس کے طنزیہ لہجے پہ ایمان کا سارا جوش دھرا رہ گیا۔

”اب کس سوچ میں غم ہو گئی ہو.....؟ بناؤ گی یا میں خود کچھ کر لوں.....؟“

وہ جانے کیوں اتنا جھلا رہا تھا.....؟ ایمان نے جھلملاتی نظروں سے اسے دیکھا اور آگے بڑھ کر
چائے کے لئے پانی رکھنے لگی۔

”ذرا سترانگ قسم کی بنانا۔“

وہ ہدایات کرتا وہیں بیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ایمان نے سر ہلایا تھا۔

”آپ کے انٹرویو کا کیا بنا.....؟“

چائے بن گئی تو چھان کر کپ میں نکالنے کے بعد اس کے آگے رکھتے ہوئے ایمان نے کسی قدر جھجک
کر پوچھا تھا۔ اپنی بات کے جواب میں ولید کے چہرے پر پھیلنے سکوت کو دیکھ کر ایمان کچھ خائف ہو گئی تھی۔
جانے اب وہ کیا الٹا سیدھا جواب دیتا.....؟

”انٹرویو تو ہو گیا ہے، دُعا کرنا اللہ بہتر کرے.....!“

کبھی کبھار وہ اتنا مہربان ہو جاتا ہے کہ نارمل انداز میں بھی جواب دے دیا کرتا اور یہ کبھی کبھار آنے
والا لمحہ ہی ایمان کو پھول کی طرح مہکا دیتا تھا، کھلا دیتا تھا۔

”کیوں نہیں.....! میری ساری دُعائیں نیک تمنائیں آپ کے لئے ہی تو.....“

معاً اس کی پیشانی کو شکنم آلود اور آنکھوں کو دکھتا محسوس کر کے ایمان کی زبان لنگ ہونے لگی۔ وہ کچھ
کہے بغیر اٹھا تھا اور لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ چائے کا گم وہیں رہ گیا تھا۔ ایمان کے اندر واضح شکست کے احساس
نے ٹوٹ پھوٹ پیدا کی تھی۔ ہونٹ بھیج کر اس نے آنسو ضبط کرنا چاہے تھے مگر آنسو بہت سرعت سے اس کے
چہرے کو بھگوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

”کیا اس نے کوئی ایسا نہیں اپنا جسے مانوں

کہا میں نے میرے شانے پہ سب آنسو بہا لو تم

کہا اس نے محبت زندگی میں درد لاتی ہے

کہا میں نے معجزے بھی تو محبت ہی دکھاتی ہے

کہا اس نے محبت میں فقط آنسو ہی آنسو ہیں

کہا میں نے کہ ہنسنا بھی محبت ہی سکھاتی ہے

کہا اس نے دُعائیں زندگی کو مانگتے کیوں ہو

کہا میں نے میری اس ذات سے منسوب تم ہونا
کہا اس نے جنت میں خدا سے کس کو مانگو گے
کہا میں نے میرے ہدم میرے محبوب تم ہونا
کہا اس نے تمہیں سجا سنورنا کیوں نہیں بھاتا
کہا میں نے میری چاہت میرا سنگھار ہی تو ہے
کہا اس نے بھلا مجھ میں تمہیں کیا چیز بھاتی ہے
کہا میں نے تمہیں دیکھوں تو جان میں جان آتی ہے“

ولید کے کسی دوست کی شادی تھی، وہ اسے ساتھ لے کر جانا نہیں چاہتا تھا، مگر دوست کا اصرار اتنا تھا
کہ اسے مجبوراً حامی بھرنا پڑی۔ اسے تیار ہونے کا کہہ کر وہ خود نہانے گھس گیا تھا۔ جب ہاتھ لے کر نکلا تو ایمان
کو چند سوٹ سامنے رکھے کچھ پریشان پایا تھا۔

”تم ابھی تک یوں ہی بیٹھی ہو.....؟ شہر جانا ہے، ہمیں محترمہ.....!“

وہ کسی قدر درشتی سے جتا کر بولا تھا۔ ایمان اس کے موڈ کی خرابی کے خیال سے ہی گڑبڑانے لگی۔

”مجھے سمجھ نہیں آرہی، کون سا لباس پہنوں.....؟ فضا کہہ رہی ہے، ساڑھی پہن لوں۔“

وہ قدرے جھجک کر بولی۔ ولید نے برش ٹیبل پر اُچھال کر اس کی سمت دیکھا۔ ریشمی بالوں کا آبشار
پشت پر گرائے اپنی دکھتی ہوئی رنگت کے ساتھ وہ اس الجھن میں مبتلا کتنی انوکھی سی لگ رہی تھی۔

”ہاں.....! تو پہن لو ناں.....! اس میں اتنا متردد ہونے والی کون سی بات ہے.....؟“

اس نے کام نپٹانے والے انداز میں کہا اور الماری کھول کر اپنے لئے کپڑے سلیکٹ کرنے لگا۔
ایمان قدرے مطمئن ہوئی تھی اور ساڑھی اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ولید نے وائٹ پیٹ کوٹ نکالا
اور تیار ہونے لگا، اور جس پل وہ خود پہ فراخ دلی سے پرفیوم اسپرے کر رہا تھا، تب ہی ایمان نے ساڑھی کا پلو
سنجھالتے ہوئے اندر قدم رکھا تھا۔

لچکی ڈال کی مانند ڈولتا ہوا اس کا سانچے میں ڈھلا ہوا مومی سراپا بلیک کا مدار ساڑھی میں ایک دم
نمایاں ہو کر غضب ڈھانے لگا تھا۔ سیاہ نیٹ کی ہاف سلیو بلاؤز میں اس کا نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوا حسن گویا
لشکارے مار رہا تھا۔ گلابی فریش چہرے پر بلا کی جاذبیت اور مسحور کر دینے والی معصومیت تھی۔ وہ صحیح معنوں میں
ماحول سے بے گانہ ہو کر رہ گیا تھا۔

ایمان نے اس کی نگاہوں کے ارتکاز کو محسوس کیا تو بکھرتی دھڑکنیں کچھ اور منتشر ہونے لگیں۔ اس کی
نگاہوں کی حرارت سے پکھلتی وہ بے ساختہ نظروں کو جھکا گئی۔ ولید کو اس کے ہاتھوں میں بج اٹھنے والی چوڑیوں
کی جلت رنگ نے چونکایا تھا۔ اپنی بے خودی پہ وہ بے ساختہ خفت زدہ نظر آیا۔

”یہ پہن کے جاؤ گی تم وہاں.....؟“

”جج..... جی.....! آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔“

وہ اس کی ترچھی کاٹ دار نظروں کی آنچ پہ ٹپٹا کر نظریں چرانے لگی۔

”تب مجھ کو تھوڑا ہی پتا تھا کہ تم.....“

معا اس نے ہونٹ بھیج کر سر کو جھکا۔ پھر کسی قدر برہمی سے بولا تھا۔

”جاؤ اور فوراً سے بیشتر چینیج کرو اسے۔“

”جج..... جی بہتر.....!“

وہ اتنی آسانی سے جان چھوٹ جانے پہ سرعت سے اندر بھاگی اور چینیج کر کے جب یہ پوچھنے کو واپس آئی کہ اب کون سا ڈریس پہنے، تو پتا چلا وہ اکیلا ہی جا چکا ہے۔ ایمان ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”قسم لے تو تمہارے بعد کسی کا خواب دیکھا ہو
کسی کو ہم نے چاہا ہو کسی کو ہم نے سوچا ہو
کسی کی آرزو کی ہو کسی کی جستجو کی ہو
کسی کی راہ دیکھی ہو کسی کا قرب مانگا ہو
کسی کو ساتھ رکھا ہو کسی سے آس رکھی ہو
کوئی اُمید باندھی ہو کوئی دل میں اُتارا ہو
کوئی تم سے بھی پیارا ہو کوئی دل میں بسایا ہو
کوئی اپنا بنایا ہو کوئی روٹھا ہو ہم نے منایا ہو
دبیر کی جس رُت میں کسی کا بجر جھیلا ہو
کسی کی یاد کا موسم میرے آنگن میں کھیلا ہو
کسی سے بات کرنی ہو کبھی یہ ہونٹ ترسے ہوں
کسی کی بے وفائی پر کبھی یہ نین برسے ہوں
کبھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر تیرے دکھ میں نہ روتے ہوں
قسم لے لو تمہارے بعد ہم اک پل بھی سوئے ہوں
قسم لے لو کبھی جگنو کبھی تارہ کبھی ماہتاب دیکھا ہو
قسم لے لو تمہارے بعد کسی کا خواب دیکھا ہو“

ایمان نے یہ نظم پڑھی تو اتنی اچھی لگی کہ اسے ٹائپ کیا اور ولید حسن کے نمبر پر سینڈ کر دیا۔ کیا ہو بھلا.....؟ زیادہ سے زیادہ خفا ہو جاتا ناں.....؟ تو ہو جاتا۔ بس.....! اس کا جی چاہا تھا، یہ اتنا خوب صورت اظہار اس سے کرنے کو، تو دل پہ جبر نہیں کیا تھا، ابھی وہ سیل فون رکھ کر اٹھی ہی تھی کہ میج نون بج اٹھی۔ وہ ذرا چونکی اور سیل فون اٹھا کر میج چیک کیا۔

ولید حسن کا ہی تھا اور وہ بھی شاعری، وہ خوش گواریت میں گھرتی تیزی سے نظریں دوڑانے لگی۔

”وہ مجھ سے ملتے ہیں تو ملتے ہیں چرا کر آنکھیں

تو پھر کس لئے رکھتے ہیں وہ سجا کر آنکھیں

میں دیکھتا رہتا ہوں اس کو جہاں تک وہ نظر آئے
ایک وہ ہیں کہ دیکھتے نہیں اٹھا کر آنکھیں
میں آج بھی اس جگہ پر ہوں اکیلا بیٹھا
جس جگہ چھوڑ گئے تھے وہ ملا کر آنکھیں
وہ مجھ سے نظریں چرا لیتا ہے فراز
میں نے کاغذ پر بھی دیکھیں ہیں بنا کر آنکھیں“

غزل کے اختتام تک پہنچتے ہی ایمان کا سارا جوش و خروش جھاگ بن کر بیٹھ چکا تھا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی سیل فون ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی تھی، پھر جانے کیا دل میں سائی کہ ایک اور غزل ٹائپ کرنے لگی۔

”تجھ کو معلوم بھی شاید کبھی ہو کہ نہ ہو
میری راتیں تیری یادوں سے سخی رہتی ہیں
میری سانسیں تیری خوشبو میں بسی رہتی ہیں
میری آنکھوں میں تیرا سپنا سجا رہتا ہے
میرے دل میں تیرا عکس بسا رہتا ہے
ہاں اس طرح میرے دل کے بہت پاس ہو تم
کہ دھڑکنوں کو بھی اب مجھ سے گلہ رہتا ہے“

اس نے اس غزل کو بھی ولید کے نمبر پر سینڈ کر ڈالا۔ یہ کھیل دلچسپ تھا۔ اسے لطف آنے لگا۔ تصور میں اس کا جھنجھلایا ہوا چہرہ آیا تو اسی شرارت کو مزید طول دینے لگی۔

”کہیں ایسا نہ ہو جاناں

کہ میرا عکس چپکے سے

تیری آنکھوں سے مٹ جائے

تیری جانب پلٹنے کا ہر اک رستہ

کہیں نہ بند ہو جائے

میری یادوں کا ہر پنچھی

تیرے ہاتھوں سے نکلے

فلک پر آباد ہو جائے

یا پھر برباد ہو جاتے

میرا دل اب کے سینے میں

دھڑکنے سے مگر جائے

انا کی سبز ٹہنی کو میں

خود یہ توڑ دیتی ہوں

تمہارے واسطے جاناں

میں ضد اپنی جھوڑ دیتی ہوں

یہی اک خواب بننا چاہتے تھے ناں تم

یہی ضد تھی ناں کہ خود کہتے نہیں تھے تم

فقط میری زباں سے

میرا اقرار سننا چاہتے تھے ناں تم

لو میں نے کہا

میری جاناں!

مجھے تم سے محبت ہے

سنو جاناں!

مجھ پہ اعتراف اب برملا ہے کہ

میری رگ رگ میں خوں بن کر

بہہ رہے ہو تم

میری آنکھوں میں اک خواب حسین بن کر

رہ رہے ہو تم

کہ میرے جسم کا ہر حصہ

سینے کی ہر دھڑکن

اور ہر سانس کہتی ہے

مجھے تم سے محبت ہے

یہی سچ ہے

مجھے تم سے محبت ہے

جس وقت اس نے طویل نظم سینڈ کی، اس سے محض چار منٹ بعد ولید نے فون کر لیا تھا۔

”السلام علیکم.....!“

اس کے شوخ لہجے میں زندگی کی کھنک تھی۔

”دماغ صحیح ہے تمہارا.....؟“

وہ چھوٹے ہی برسا، مگر ایمان نے نہ برا مانا نہ خائف ہوئی۔

”جناب.....! محبت کے اظہار کی خاطر دماغ کی صحت مندی شرط ہے۔“

اس کی جھاز کے جواب میں بھی وہی ہشاش بشاش، خوب صورت کھلتا لہجہ جلتی بجاتی ہنسی جو اس

کا موڈ بری طرح سے غارت کر گئی۔

”بکواس بند کرو.....! گھر آنے دو، پھر پوچھتا ہوں تمہیں.....!“

اس کے دہنگ لہجے میں سرد پھنکار در آئی، مگر ایمان نے خاطر میں نہ لانے کا گویا عہد باندھ لیا تھا،

خود سے۔

”نیو ماننڈ.....! اور کیا کریں گے.....؟ ہر قسم تو توڑ چکے ہیں مجھ پر.....؟“

اور وہ اتنا جھلایا تھا کہ سلسلہ کاٹ دیا۔ ایمان نے مسکراتے ہوئے سیل فون رکھا اور ہونٹوں میں کچھ

گنگناتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

”لو بھئی.....! عرض کیا ہے،

سنو سنو.....!

ظالمو.....!

میری داستانِ الم

”کہ آنسو کے دریا بہہ جائیں،

مگر غم پھر بھی نہ ڈھلے“

ایمان، فضا کے ساتھ کچن میں مصروف تھی۔ آج کل وہ فضا سے کھانا بنانا سیکھ رہی تھی۔ اس وقت

فضا اس کے پاس کھڑی ہو کر کڑا ہی بنوا رہی تھی، جب اشعر شور مچاتے ہوئے، فرضی آنسو صاف کرتے ہوئے

وہاں آیا۔

”افوہ.....! کیا ہو گیا ہے.....؟ کچھ بولو گے بھی یا بس رولا ہی پاتے رہو گے.....؟“

ایمان نے اسے دیکھ کر کسی قدر جھجکا کر کہا۔ اصل جھنجھلاہٹ تو اس جھیلے کی تھی۔

”اُف.....! کھانا بنانا آسان تھوڑی تھا، مگر صاحب بہادر کا حکم تھا، ماننا تو تھا ناں.....!“

”میں نے کچھ عرض کرنا ہے، توجہ تو فرمائیں.....!“

اشعر پیڑھی گھیٹ کر فرصت سے بیٹھا۔

”کچھ دیر بعد کر لینا، پلیز.....! ابھی میں مصروف ہوں۔“

ایمان نے اب کے دانستہ اسے چڑایا اور وہ واقعی چڑ گیا۔

”فضا جی.....! آپ بھی مصروف ہیں کیا.....؟“

”اس کے منہ پھلا کر کہنے پہ فضا کی ہنسی جھوٹ گئی۔

”نہیں میرے چاند.....! میرے پاس تمہارے لئے وقت ہی وقت ہے، بولو.....!“

اس کے دُلا رہے بھی وہ پھڑک اٹھا تھا، بے حد ناراضگی سے بولا۔

”آپ کو پتا ہے چاند گنچے کو کہتے ہیں آج کل.....؟“

اس کی بلبلاہٹ پر جہاں فضا کھسیاہٹ کا شکار ہوئی، ایمان کا قبضہ بے ساختہ تھا۔

”ہنس لیں، ہنس لیں.....! اڑا لیں میرا مذاق.....! میں بیچارہ تو اب آپ دونوں کو یہ بددعا دینے

سے بھی قاصر ہوں کہ آپ کو گنچے شوہر پتے پڑیں۔ مگر ناں جی.....! دونوں موصوفوں کے ہی اتنے بڑے بڑے

وہ منہ پھلا کر کہہ رہا تھا، اب کے ایمان نے بمشکل ہنسی ضبط کی، اور اس کا دھیان بٹایا۔
”تم کچھ کہہ رہے تھے شاید.....؟“

”ہاں.....! تو ایک نظم تھی، جسے آپ سے شیر کرنے آیا تھا، مگر یہاں کسی کو شوق ہی نہیں۔“
وہ کچھ اور بھی سلگا۔

”کیوں شوق نہیں.....! تم سناؤ.....!“

فضہ نے اس کا دل رکھا، وہ بھی جیسے انتظار میں ہی تھا، فوراً شروع ہو گیا۔

”میں کسی اور کی ہوں اتنا وہ بتا کر روئی

وہ مجھے مہندی لگے ہاتھ وہ دکھا کر روئی

میں بے بس ہوں قدرت کا فیصلہ ہے یہ

لپٹ کر مجھ سے بس اتنا وہ بتا کر روئی

مجھ پہ اک کرب کا طوفان ہو گیا حائل

جب میرے سامنے خط میرے وہ جلا کر روئی

میری نفرت اور عداوت پکھل گئی پل میں

بے وفا ہے تو کیوں مجھ کو وہ رُلا کر روئی

سب گلے شکوے اک پل میں بہہ گئے

جھیل سی آنکھوں میں جب آنسو وہ سجا کر روئی“

”چچ چچ.....! یہ تو واقعی بڑا افسوس ناک واقعہ ہے۔ بائی داوے، کب ہوا یہ حادثہ.....؟“

فضہ اس کے درد بھرے لہجے سے اچھی خاصی متاثر ہو چکی تھی۔

”بس جی.....! کچھ نہ پوچھیں، سب کچھ بھولا ہوا ہے آج کل۔“

جواباً اشعر کی اداکاری غضب کی تھی۔

”وہ ایک شعر ہے ناں.....!“

جب وہ ہچھڑا تھا رات باقی تھی

عمر بیتی ہے رات باقی ہے

ایسا ہی حال ہوگا.....؟“

فضہ کی ہمدردی کا دائرہ کچھ اور وسیع ہوا۔ اشعر نے شد و مد سے سرکوا ثبات میں جنبش دی تھی۔

”صبر.....! میرے اچھے ننھے بھائی.....! کہ ابھی تو آپ نے وہ گانا بھی گانا ہے۔“

ایمان نے اس کا کاندھا تھپک کر مصنوعی رنجیدگی سے کہا تو اشعر کے کان فوراً کھڑے ہوئے۔

”کون سا گانا.....؟“

”چند سالوں بعد جب ایک اور المیہ آپ پر بیتے گا اور آپ گانے پھریں گے۔“

دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے

ان کے بچے ہم کو ”ماموں“ کہہ گئے

ایمان گنگنائی، پھر خود ہی ہنسنے لگی۔ اشعر نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”بس.....! ہنسنا ہی آتا ہے آپ کو، یا پھر زخموں پہ نمک پاشی کر سکتی ہیں.....؟ ارے.....! غضب خدا

کا، میری داستانِ غم سن کر کسی کو بھی اتنا خیال نہیں آیا کہ جوان جہان لڑکے کے دل بربادی کا کوئی سامان

کر دیا جائے.....؟“

”مثلاً کیسا سامان.....؟“

ایمان نے معصومیت سے آنکھیں پھیلائیں تو اشعر نے دانت کچکپکائے تھے۔

”اتنی معصوم تو نہیں ہیں آپ.....؟“

”ہاں.....! اس سے زیادہ ہی ہوں۔“

وہ فی الفور بولی اور اشعر نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

”ارے.....! کٹھور بھا بھو.....! اپنے لئے ایک عدد حسین، خوب صورت، نوخیزی دیورانی ڈھونڈ لو،

تا کہ کل کو اگر ان کے بچے ہم کو ماموں کہتے آئیں تو اس کے جواب میں انتقاماً ہمارے بچے بھی ان کو پھپھو کہہ

سکیں۔“

”واؤ.....! کیا لاجک ہے.....؟“

فضہ سر دھنسنے لگی۔ ایمان مصالحہ بھون چکی تھی، فضہ کے کہنے پہ گوشت ڈال دیا۔

”اب اسے بھی اچھی طرح بھونو، لیکن آج دھیمی ہی رکھنا۔“

فضہ مزید ہدایت دے رہی تھی۔

”افوہ.....! اس کا مطلب، آج بیچارے ولی بھائی کے معدے کی آزمائش ہے.....؟“

”ان کے ہی نہیں، تمہارے معدے کی بھی خیر نہیں ہے بچو.....!“

ایمان نے اس بے عزتی پہ اسے گھور کر دیکھا تو وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

”تو بہ کریں.....! میں کل کا پکا ساگ تو کھا سکتا ہوں، مگر یہ ہرگز نہیں۔“

”ایمان پتر.....! تیرا موبائل کب سے گھنٹیاں بجا رہا ہے۔ چڑیوں کی آواز لگا رکھی ہے تو نے، میں

تجھی اوپر روشن دان میں چڑیاں بول رہی ہیں۔ وہاں بار بار میں شی شی کر کے چڑیوں کو اڑا رہی ہوں، مگر آواز

آئے جارہی تھی۔“

اس سے پہلے کہ ایمان اسے کوئی جواب دیتی، تائی ماں اس کا موبائل فون اٹھائے کسی قدر کھسیا ہٹ

بھرے انداز میں اپنی نادانی کا قصہ سناتے ہوئے اندر آئیں اور موبائل اس کی سمت بڑھا دیا، جو ہنوز بج رہا تھا۔

ایمان نے دیکھا، کسی یونیورسٹی سے کال تھی اور کرنے والا بھی مستقل مزاج۔

”ہیلو.....!“

اس نے ہانڈی میں چمچ چلاتے ہوئے کال ریسیو کی، انداز مصروفیت لئے ہوئے تھا۔

”ذرا نہ موم ہوا پیار کی حرارت سے
چمک کے ٹوٹ گیا دل کا سخت ایسا تھا
یہ اور بات کہ وہ لب تھے پھول سے نازک
دل نہ سہہ سکے لہجے کرخت ایسا تھا“

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، جب وہ اس کے جوتے پالش کر رہی تھی۔ ولید سے اسے ابھی کچھ دیر
قبل ہی زبردست جھاڑ پڑی تھی۔ کل وہ اس کا نمبر ٹرائی کرتا رہا تھا جو مسلسل آف جا رہا تھا۔ یہ اس وقت کی بات
تھی جب موسیٰ کی کال کے بعد اس نے سیل فون بند کر دیا تھا۔

بس..... اتنی سی بات پہ وہ اس کی اچھی خاصی انسٹ کر چکا تھا، جس نے ایمان کا دل ایک دم ہی
اس سوچ کے ساتھ ویران کر دیا تھا کہ اب ساری زندگی ہی کیا، وہ اس کی محبت چاہت اور احترام جیسے جذبے کو
ترستی رہے گی.....؟

اس کا دل ایک بار پھر موسیٰ کو بدعنائیں دینے لگا تھا، جس کی انتہاء پسند سوچ نے اسے ولید جیسے شقی
انسان کی نظروں سے گرا دیا تھا۔

”پاگل ہو گئی ہو کیا.....؟ بے وقوف عورت.....! کب سے ایک ہی جوتے پہ برش پھیر رہی ہو.....؟“
ولید کی درشت آواز پہ وہ چونکی۔ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا، مگر لہجے کی تحارت اور تلخی اس کا دل زخمی کر
گئی تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر دوسرا جوتا اٹھالیا۔ مگر ولید نے اس کے ہاتھ سے بوٹ جھپٹ لیا تھا۔
”رہنے دو.....! یہ احسان نہ کرو مجھ پہ۔“

وہ پھنکار کر بولا تھا۔ ایمان نے آنسوؤں سے جل تھل ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھنا چاہا، مگر اس کا
عکس دھندلا گیا تھا۔

”جاؤ.....! ناشتہ لے آؤ، یا پھر میرے سر پہ ہی کھڑی رہو گی.....؟“
وہ اس بد مزاجی سے بولا تھا، ایمان ہونٹ پھینچتی نیچے آئی، پہلے داش بیسن پر رک کر ہاتھ صابن سے
دھوئے، پھر کچن کی سمت آ گئی۔ فضلہ ناشتے کے لوازمات ٹرے میں لگا رہی تھی۔
”میں بنا لیتی ناشتہ.....!“

اس نے فضلہ سے نگاہیں چار کئے بنا کسی قدر خفت سے کہا تو فضلہ نے آہستگی سے اس کا گال تھپکا تھا۔
”اس قسم کی فارمیٹیز میں نہ پڑا کرو جان.....! اب لے جاؤ فنافٹ، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“
اس اپنائیت، محبت اور خلوص پہ ایمان کی آنکھیں بہت سرعت سے چمکی تھیں، جنہیں فضلہ کی نگاہ کی زد
سے بچانے کی خاطر ٹرے اٹھاتے جلدی سے نکل گئی۔ اوپر کمرے میں آئی تو ولید بلیک جنز شرٹ میں تیار بال بنا
رہا تھا۔ ایمان نے ٹرے لا کر میز پر رکھ دی اور خود بکھرا ہوا کمرہ سمیٹنے لگی۔ ولید نے برش رکھا اور نیبل کی سمت
آ گیا۔

”تم نے ناشتہ کر لیا ہے کیا.....؟“

سلاکس اٹھاتے ہوئے اس نے ایک نگاہ ایمان پر ڈالی تھی۔ بھگی بھگی نم پلکیں، آنکھوں کے زیریں

”کیسی ہیں آپ مسز ولید حسن.....؟“

ٹھہرا ہوا بھاری بھاری لہجہ، ایمان قطعی پہچاننے سے قاصر رہی۔

”آئی ایم فائن.....! سوری.....! میں نے آپ کو پہچانا نہیں، کیا آپ ولید کے کوئی دوست
ہیں.....؟“

”دوست کیوں.....؟ دشمن ہیں ہم ان کے، اور آپ ہمیں کیوں پہچانیں گی.....؟ آپ جیسا بھی کوئی
عہد شکن ہوگا بھلا دنیا میں.....؟“
”کک..... کون.....؟“

وہ ایک دم سرد پڑنے لگی۔ فضلہ کے ساتھ ساتھ اشعر نے بھی چونک کر اس کے فنی ہوتے ہوئے
چہرے کو دیکھا تھا۔

”ابھی بھی نہیں پہچانیں.....؟ میم.....! موسیٰ کا دوانی بات کر رہا ہوں۔“
ایمان کا دل ایک دم اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بناء اس نے پہلے سلسلہ کاٹا، پھر
سیل فون ہی آف کر دیا تھا اور خود کو کمپوز کرنے لگی۔
”کون تھا.....؟“

اشعر نے اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو بغور دیکھا۔
”تھنگ.....! رانگ نمبر تھا کوئی۔“

اس نے خود کو سرعت سے سنبھالا کہ ان کے سوالوں کے جواب وہ بہر حال دینے سے قاصر ہوتی۔
”رانگ نمبر تھا تو آپ اتنا گھبرا کیوں رہی تھیں.....؟ کیا یہ کالر پہلے بھی آپ کو تنگ کرتا رہا ہے.....؟
نمبر دکھائیں مجھے اس کا۔“

اشعر کے پے درپے سوال اور آخری تقاضہ بالکل ہی اسے سراسیمہ کر گیا۔ اس نے سرعت سے سیل
فون مٹھی میں بھینچ کر ہاتھ اپنے پیچھے چھپا لیا۔

”کچھ نہیں ہے اشعر.....! ڈونٹ وری.....! یہ فارغ لوگوں کے مشغلے ہوتے ہیں۔ ہم کیوں خواہ مخواہ
کسی سے پنگا لیں.....؟“

اس کی جان پہ بن آئی تھی۔

”میں اس سے پنگا لینے تو نہیں جا رہا بھابی.....! صرف پتا کروں گا، وہ ہے کون.....؟“

اشعر نے کسی قدر رساں سے کہا تو ایمان نے زور سے سر کو جھٹکا تھا۔

”نہیں.....! رہنے دو تم، لعنت بھیجو اس پر، پلیز.....!“

وہ کچھ اتنی لجاجت سے بولی تھی کہ اشعر اسے دیکھ کر رہ گیا اور کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ ایمان

کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ اور گھبراہٹ اسے کچھ غلط ہونے کا سگنل ضرور دے رہی تھی۔

وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر باقی ماندہ سیڑھیاں پھلانگ گئی۔ ولید نے ہونٹ بھیج کر خود پہ ضبط کیا تھا، اگر وہ کچن میں نہ گھس گئی ہوتی تو اس بد تیزی پر وہ یقیناً اس کا حشر کر چکا ہوتا۔

☆☆☆

”میرا تمام فن، میری کاوش، میری ریاضت
اک ناتمام گیت کے مصرعے پس جن کے بیچ
معنی کا ربط ہے نہ کسی قافیے کا میل
میری متاع بس یہی جادو ہے عشق کا
سیکھا ہے جس کو میں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ
لیکن یہ حر عشق کا جادو عجیب ہے
کھلتا نہیں ہے کچھ کہ حقیقت میں کیا ہے یہ
تقدیر کی عطا ہے یا کوئی سزا ہے یہ
کہنے کو یوں تو عشق کا جادو ہے میرے پاس
پر میرے دل کے واسطے اتنا ہے اس کا بوجھ
سنے پہ اک پہاڑ سا بنتا نہیں ہے یہ
لیکن اثر کے باب میں ہلکا ہے اس قدر
تم پہ اگر چلاؤں تو چلتا نہیں ہے یہ“

فضہ کی طبیعت ان دنوں کچھ خراب رہنے لگی تھی۔ آج اسے ویسے بھی ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لئے جانا تھا۔ اس کی ڈیوری بھی نزدیک تھی، جبھی اب ایمان کی کوشش ہوتی، اسے زیادہ سے زیادہ آرام مہیا کرے۔ بہت سارا کام اس نے اپنے کاندھوں پر لے لیا تھا، مگر فضہ کے علاوہ تائی ماں بھی اس کا پورا ہاتھ بٹانے کی کوشش ضرور کرتی تھیں۔

اس وقت اس نے پہلے پورے گھر کی صفائی ڈھلائی کی تھی، پھر فضہ کو کپڑے نکال کر دیئے تاکہ وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار ہو جائے۔ عاقب بھائی اسے لینے آنے والے تھے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ آج اسے اتنی فرصت ہی نہ ملی تھی کہ اپنا کمرہ بھی صاف کر لیتی۔ نیکیے اور کبیل ہٹا کر اس نے چادر جھاڑ کر بچھانا چاہی تو سیل فون کی بپ پہ چونکی تھی۔ ایک بار پھر انجان نمبر تھا، یقیناً موسیٰ کا فون تھا، مگر اس نے خائف ہوئے بغیر کال ریسیو کر لی۔ آج اس کا ارادہ اسے کھری کھری سنانے کا تھا۔

”ہیلو.....! کیا تکلیف ہے تمہیں.....؟ کیوں جان نہیں چھوڑ دیتے تم آخر میری.....؟“

وہ کسی آتش فشاں لاوے کی طرح سے ہی پھٹ پڑی تھی۔

”بے فکر رہیں، میری آج آپ کو لاسٹ کال ہے۔“

”اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔“

وہ جواباً پھنکار کر بولی تو موسیٰ ہنس پڑا۔

کنارے شدت ضبط سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کا یہ سوگوار سا روپ بے حد اڑکیو تھا۔ ولید کو ایک دم ہی اپنی زیادتی کا احساس جاگ اٹھا۔ پتا نہیں اسے دیکھتے ہی کیوں اس کا خون کھولنے لگتا تھا.....؟ حالانکہ یہ وہی چہرہ تھا جسے ایک نگاہ دیکھنے کو بھی اسے جتن کرنے پڑا کرتے تھے، مگر عزت نفس پہ لگائی گئی چوٹ سب کچھ الٹ پلٹ کر کے رکھ گئی تھی۔

”نہیں.....!“

مختصر جواب آیا تھا، وہ بھی اس کی سمت دیکھے بغیر۔ آواز کے بھاری پن نے ولید کا دل کچھ اور بھی پشیمان کیا۔

”تو آ جاؤ ناں.....! میرے ساتھ ناشتہ کر لو.....!“

ہاتھ روک کر وہ اسے منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایمان نے اب کے اچھا خاصا چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی توجہ پا کر دھڑکنیں بیچ اٹھیں۔

”اس نوازش کے لئے شکریہ.....! جو کچھ آپ مجھے دے رہے ہیں، میرے لئے وہی بہت ہے۔“
اس نے کسی قدر تلخی سے کہا اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ غم، غصہ، مایوسی، بے بسی، افسردگی، کتنے احساس تھے اس کے ہمراہ، جنہوں نے آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی چادر سی تان دی تھی کہ سیڑھیاں اترتے بے دھیانی میں اس کا پیر پٹ گیا۔ یقیناً سنبھلنے کی کوشش بھی کرتی، تب بھی گر جاتی، اگر جو اس کے پیچھے آتے ولید نے بروقت اسے نہ تھام لیا ہوتا۔

”دھیان کہاں ہوتا ہے تمہارا.....؟“

وہ خوف سے آنکھیں میچ چکی تھی، مگر ولید کی بات پہ اس کا دماغ جیسے الٹ کر رہ گیا۔

”کم از کم آپ میں نہیں ہوتا۔“

بھڑک کر کہتے وہ اس سے دُور ہٹنا چاہتی تھی، مگر ولید نے اُلٹا اسے بازوؤں میں محصور کر کے زبردستی اپنے ساتھ لگا لیا۔ گرفت میں استحقاق اور گرم جوشی تھی، مگر جب بولا تو لہجہ اس کے متضاد کسی قدر طنزیہ تھا۔
”شکر ہے.....! تم نے سچ بولنے کی ہمت تو کی۔“

ایمان کے وجود میں کرب آمیز شکست کے شعلے بلند ہوئے تھے۔ مضطرب آنکھوں، بے قابو ہوتی دھڑکنوں اور غم پلکوں سمیت اس نے کرنٹ کھانے والے انداز میں خود کو اس کی گرفت سے نکالنے کو مزاحمت کی۔

”یوں لمحہ لمحہ سلگا کر مارنے سے بہتر ہے، آپ مجھے ایک ہی بار ختم کر دیں۔ کیا جائے گا آپ کا.....؟“

مقصود تو جان چھڑانا ہے ناں.....؟

وہ بے بسی کے شدید احساس سمیت سسک اٹھی تھی۔ ولید کا موڈ جانے کیوں آف ہوا تھا.....؟

”یہ بیڈ روم نہیں ہے تمہارا.....! یہ کام کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔“

اس کی جھلستی نگاہ ایمان کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں پر تھی۔ ایمان جیسے سر تا پا جل اٹھی۔

”مجھے بھی آپ کو یہی بتانا ہے کہ یہ آپ کا بیڈ روم نہیں ہے، چھوڑیں مجھے۔“

”وجہ تو پوچھ لیں، میں آپ کو یہ خوش خبری کیوں سنارہا ہوں.....؟“

میں لعنت بھیجتی ہوں تم پہ، تمہاری ہر بات پہ۔“

اس کے لہجے کی خباثت پہ دھیان دیئے بغیر وہ سرد لہجے میں بولی تو موسیٰ نے بے ساختہ اسے ٹوک

دیا۔

”نونو.....! یہ تو فیکر نہ ہونا ناں.....؟ چلیں، آپ نہ پوچھیں، میں بتاتا ہوں۔ گو کہ اب آپ میرے

لالہ کے قابل تو نہیں رہیں، برقی ہوئی عورت میں خود بھی ان کے لئے پسند نہیں کروں گا، مگر آپ کے جرم کی سزا

کے طور پر میں آپ کو ہمیشہ کے لئے بیوگی کی چادر ضرور اوڑھا سکتا ہوں۔ عنقریب آپ میرے انتقام کا یہ

بھیا تک رنگ دیکھیں گی۔ گڈ بائے.....!“

سلسلہ کٹ گیا، جبکہ ایمان دہشت کے حصار میں گھری بے ساختہ اسے پکارنے لگی تھی۔

”مم..... موسیٰ.....! ہیلو.....! ہیلو.....! میری بات سنو.....!“

اس نے ڈوبتے ہوئے دل اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس کا نمبر ملایا، مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔

ایمان کو لگا تھا وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔

☆☆☆

اپنی کوشش کی ناکامی پہ انتہائی مایوسی میں گھرتے ہوئے ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر سسکنے لگی۔ خوف کے ساتھ وحشت اور بے بسی کے احساس نے اسے بری طرح سے توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ جانے وہ کب تک اسی طرح آنسو بہاتی رہی تھی کہ کسی خیال کے تحت پہلے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے، پھر سیل فون اٹھا کر ولید کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

ایک بار، دو بار، تین بار ڈرائی کرنے پہ اس کا دل گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا۔ پتا نہیں وہ کال ریسیو کیوں نہیں کر رہا تھا.....؟ اس نے ایک بار پھر اس کا نمبر ڈائل کیا۔

”کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے تم پہ.....؟ آفس میں ہوں، بڑی ہو سکتا ہوں، تمہیں احساس کرنا چاہئے۔“

وہ فون پک کرتے ہی برس پڑا، مگر ایمان کے دل پہ تو جیسے سکون کے چھیننے پڑے تھے، اس کی صبح سلامت آواز سن کر۔

”ولید.....! پلیز، اسی وقت گھر آ جائیں ناں.....! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“

عجیب فرمائش ہوئی تھی، جس نے ولید کی بد مزاجی کو کچھ اور ہوا دی۔

”دماغ درست ہے محترمہ.....؟ حد ہے نخرے کی بھی۔ بند کرو فون اور خبردار جو مجھے اب ڈسٹرب

کیا۔“

”ولید.....! میری بات.....“

مگر وہ سلسلہ کاٹ چکا تھا۔ ایمان کی آنکھیں اس بے اعتنائی کے مظاہرے پر پھر سے بھیگ گئیں۔

”یا اللہ.....! کیا کروں اب.....؟“

وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر سسک اٹھی۔

”ایمان.....! ای می.....!“

نیچے سے فضلہ اسے پکار رہی تھی۔ وہ خود کو سنبھال کر اٹھی، پہلے واش روم جا کر منہ پر پانی کے چھپاکے

مارے، پھر سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی تھی۔ عاقب بھائی آچکے تھے، فضلہ اور تائی ماں جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

”ہم جا رہے ہیں، دروازہ بند کر لو.....! کوئی بھی آئے، پوچھے بغیر دروازہ مت کھولنا۔“

تائی ماں کی تاکید پہ اس نے گردن موڑ کر گھر کی خاموشی پہ غور کیا تھا، پھر مضطرب سی ہو کر بولی تھی۔

”میں تب تک اکیلی رہوں گی.....؟“

”پتر.....! تمہارے تاؤ جی کچھ دیر میں آنے والے ہیں، پھر باجی تو یہیں ناں گھر پہ.....!“
تائی ماں کی تسلی پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے ان کے جانے کے بعد دروازہ بند کیا اور پلٹ کر سکھ چین کے پیڑ کے نیچے رکھی پلاسٹک کی کرسی پہ گرے گلابی پھول سمیٹنے لگی۔ انداز میں بے دلی اور تھکان تھی۔ منڈیر یہ بیٹھے کوئے نے اپنی آواز کا سر نکھیرا، تب وہ ہاتھ میں اکٹھے کئے پھول پھینک کر اسی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

”اتنا تو میرے حال پہ احسان کیا کر

آنکھوں سے میرا درد پہچان لیا کر“

ہوا کے دوش پہ لہراتی گیت کی آواز اس کی سماعتوں میں اتاری تو ساری توجہ اسی سمت ہو گئی۔

”کوئی ساتھ دے سفر میں بہت تھک گیا ہوں میں

کچھ پل ہوں تیرے ساتھ میری مان لیا کر“

اس کا دل درد سے بوجھل ہونے لگا۔ کرسی کی بیک سے سر نکا کر اس نے آنسوؤں کو بہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔

”افسانے محبت کے یوں ادھورے تو نہ چھوڑ

جرم وفا کا مجھ سے ہر بیان لیا کر

مدت ہوئی اس آس پہ ٹھہرا ہوا ہوں میں

بھولے سے کبھی تو بھی میرا نام لیا کر

تو اپنی ذات سے وابستہ کر مجھے

ہو کر خفا مجھ سے نہ یوں جان لیا کر“

پوری طرح وہ اس گیت میں گم ہو چکی تھی، جب دروازے پر ہونے والی دستک پر ہڑبڑا کر سیدھی

ہوئی۔

”کون ہے.....؟“

تائی جی کی تاکید کے مطابق اس نے ڈیوڑھی میں آنے کے بعد بند دروازے کے پار سے پوچھا۔

”دروازہ کھولو.....!“

ولید کی آواز پہ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ جلدی سے لپک کر دروازہ وا کیا تو ولید بایک گھسٹتا ہوا اندر

چلا آیا۔

”آپ تو آفس میں تھے ناں.....؟“

دروازہ بند کئے بنا وہ بھاگ کر اس کے نزدیک آئی تھی۔ اسے رد برو پا کر کیسا طمانیت سے بھرپور

احساس دل میں جا گزریں ہوا اٹھا تھا۔

”میرے آتے ہی آپ کے حفاظتی انتظامات ختم ہو گئے کیا.....؟“

کسی قدر جھلا کر کہتا بایک اسٹینڈ کرنے کے بعد وہ خود دروازہ بند کرنے لگا۔ ایمان بجائے خفیف

ہونے کے، زور سے ہنس پڑی۔ اس کی وجہ سے وہ آفس چھوڑ کر چلا آیا تھا، بہت کیف آگئی احساس تھا۔

”سب لوگ کہاں ہیں.....؟“

اس کو بھی گھر میں چھائی خاموشی کا احساس ہوا تھا۔

”تاؤ جی کھیتوں پر، جبکہ تائی ماں اور عاقب بھائی، فضا کو چیک آپ کے لئے لے کر گئے ہیں شہر۔“

ایمان نے اس کے فریش چہرے پہ نگاہ جما کر تفصیلی جواب دیا۔

”آئی سی.....! جیسی آپ کا دل گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا تنہائی میں.....؟“

وہ واش بیسن پہ منہ ہاتھ دھونے لگا۔

”آپ کے لئے چاؤ بناؤں.....؟“

دانستہ اس کی بات کا جواب گول کر کے اس نے کچن کی سمت جاتے ہوئے پوچھا تھا۔

”خالی چائے نہیں، ساتھ کچھ کھانے کو بھی لانا۔“

اسٹینڈ سے تولیہ کھینچ کر منہ پونچھتا ہوا وہ سیڑھیوں کی سمت بڑھ گیا تھا۔ ایمان کچن میں آئی اور فریج

کھول کر جائزہ لینے لگی۔ کچھ سوچا، پھر کباب فرائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ کام نسبتاً آسان تھا۔ دوسری طرف

اس نے چائے کا پانی رکھ دیا، جب سے اس نے کام کرنا شروع کیا تھا، تاؤ جی نے عاقب سے کہہ کر سلنڈر پر

ڈبل چولہے کا انتظام کروا دیا تھا۔ تیل گرم ہو کر کڑکڑانے لگا تھا، تب اس نے اس میں کباب ڈالے تھے۔

تمام تر احتیاط کے باوجود بھی جانے کیسے گرم گرم گھی کی چھینٹ اس کے ہاتھ پر آگری۔ تکلیف کی

شدت سے اس کی جان نکل گئی، مگر ہونٹ بھیج کر خود پہ ضبط کر لیا۔ مگر متاثرہ جگہ پہ جیسے کسی نے چھری سے کٹ لگا

کر مرمچیں بھر دی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی سطح اس اذیت کو سہتے بہت تیزی سے بھیگی، سب کچھ یوں ہی چھوڑ

چھاڑ کر سنک کی ٹونٹی کھول کر ہاتھ پانی کی دھار کے نیچے کر کے کھڑی ہو گئی۔ کچھ سکون ہوا، مگر معمولی۔

ادھر کباب شاید جل رہے تھے، اس نے ٹونٹی بند کی اور پلٹ کر چولہے کی آنچ کم کر دی۔ چچ کی مدد

سے کباب پلٹے اور کھولتے ہوئے پانی میں بقی اور چینی ڈالنے لگی۔ ہاتھ کی تکلیف سے اس نے دانستہ توجہ ہٹا لی

تھی۔ حالانکہ تپش کے نزدیک آجائے سے تکلیف کا احساس بڑھ گیا تھا، مگر اس نے ہونٹ بھیج لئے تھے۔ سب

کچھ تیار ہوا تو سلیقے سے ٹرے سجا کر اوپر لے آئی۔ ولید پلنگ پہ تکیوں کے سہارے لیٹا ہوا کسی کتاب کے مطالعہ

میں مگھتا۔ اسے دیکھا تو کتاب رکھ دی۔

”آپ کا دل کیوں گھبرا رہا تھا.....؟ اب بتائیے.....!“

کباب اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے وہ چائے کا مگ ہاتھ میں لے کر ریلیکس انداز میں بیٹھ گیا۔

اب پوری کی پوری توجہ اس پر تھی۔ ایمان نے سر جھٹک دیا اور دراز سے زخم پہ لگانے کو مرم ہم ڈھونڈنے لگی۔

”حلیہ تو درست رکھا کرو، فقیرنی لگ رہی ہو بالکل.....!“

ولید نے اس کے حلیے پہ چوٹ کی۔ ایمان نے ایک نگاہ اپنے گیلے میلے کپڑوں پر ڈالی تھی، پھر نخوت

سے بولی۔

”جب کام کرنا ہو تو پھر ایسا حلیہ ہی ہوتا ہے۔“

”احسان کرتی ہو کام کر کے.....؟“

عادت کے مطابق اسے لمحہ لگا تھا، بھڑک اٹھنے میں۔

”نہیں.....! اپنی اوقات پہچان گئی ہوں۔“

اس کی آواز ایک دم بھگ گئی۔ ولید نے چونک کر اسے دیکھا کہ وہ زخم پر مرہم لگا رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے.....؟“

ولید نے منگ واپس ٹرے میں رکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے آنسو اتنی سی توجہ پا کے ہی گالوں پہ اتر آئے۔ ولید نے ٹھنڈا سانس بھر کے اسے دیکھا تھا۔

”ابھی جلا کے آئی ہو.....؟“

”دوا لگالی ہے ناں، اور جلاؤں گی کیوں.....؟“

وہ بری طرح زچ ہو گئی۔

”ہاں.....! کیوں جلاؤ گی بھلا.....؟ تمہارا میری جان چھوڑنے کا ارادہ کیوں ہوگا.....؟“

ولید نے دانستہ چھیڑا تھا اسے، مگر وہ جانے کیوں اتنی رقیق القلب ہو رہی تھی کہ بے ساختہ رو پڑی۔

”بے فکر رہیں، چھوڑ دوں گی آپ کی جان، پھر خوشی کے شادیانے بجاتے رہے گا۔“

آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر اس کے گالوں پہ بکھرے تھے، ولید نے ٹھک کر اسے دیکھا تھا، پھر آہستگی و نرمی کے ساتھ اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ مگر وہ تو بری طرح سے پھل اٹھی تھی۔

”ہنیں، چھوڑیں مجھے.....! کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے جھوٹی تسلی دینے کی۔“

اس کی زبردست مزاحمت کے نتیجے میں وہ پیچھے کی جانب چت ہوا تھا، مگر برامنائے بغیر ہنس پڑا۔

”بڑی طاقت ہے اس دھان پان سے نازک وجود میں.....؟ کیا کھاتی ہو.....؟ سچ بتاؤ.....!“

”ان باتوں پہ دھیان مت دیں۔ اس وقت میرا حلیہ گندا ہو رہا ہے، اس لئے چھوڑ دیں مجھے۔“

اس نے واقعی اس کی بات کو دل پہ لے لیا تھا۔ ولید گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

”چھوڑیں ناں.....! آپ تو ویسے بھی اپنے مطلب کے وقت نزدیک ہونا پسند کرتے ہیں میرے۔“

اتنی ہی نفرت کرتے ہیں ناں مجھ سے.....؟“

وہ تلخی سے کبھی خود اذیتی کا شکار ہونے لگی۔

”تو پھر سمجھ جاؤ، مجھے اس وقت بھی تم سے اپنی غرض ہی پوری کرنی ہے۔“

سرد، کاٹ دار نظریں، اس نے ایمان کی بات کی تردید ضروری نہیں سمجھی تھی۔ ایمان کا دل اس درجہ

توہین پہ سلگ اٹھا، آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں، مگر مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔

”میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے، جیسی میری قربت میں ہمیشہ آنسو ہی بہائے ہیں تم

نے۔“

ولید نے اس کے گالوں پہ پھسلے آنسوؤں کو اپنی انگشت شہادت سے جھٹکتے ہوئے سرد لہجے میں کہا اور

اپنے بازو اس کے وجود سے الگ کر لئے۔ ایمان اسی الزام پہ سُن ہو گئی تھی۔

”ہے کوئی جواز تمہارے پاس.....؟“

وہ اس پر تکیھی کاٹ دار نظریں جما کر بولا۔

”آپ محبت کے دعویدار تھے ناں مجھ سے.....؟ مگر کبھی اپنے سلوک پہ غور کیا آپ نے.....؟ مجھے کبھی

بھی آپ کی قربت میں یہ احساس نہیں ملا کہ میں آپ کی بیوی ہوں، جس سے کبھی آپ نے محبت کی تھی۔ اس

کے باوجود میں نے کبھی شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی احتجاج۔ اگر آپ ذرا سا غور کرتے تو جان سکتے تھے، یہ میری محبت

ہی تھی جس نے آپ کا ہر ستم مجھے خاموشی سے سہنے کا ظرف بخشا تھا۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ رُکی نہیں تھی، منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دہاتی اُٹھ کر بھاگ گئی۔ ولید ساکن

لیٹا تھا۔

☆☆☆

”کبھی تو آسماں سے چاند اترے جام ہو جائے

تمہارے نام کی اک خوب صورت شام ہو جائے

میں خود بھی احتیاطاً اس گلی سے کم گزرتا ہوں

کوئی معصوم کیوں میرے لئے بدنام ہو جائے

عجب حالات تھے یوں دل کا سودا ہو گیا آخر

محبت کی حویلی جس طرح نیلام ہو جائے

سمندر کے سفر میں اس طرح آواز دے ہم کو

ہوائیں تیز ہوں اور کشتیوں میں شام ہو جائے

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے“

اس نے تمام ضروری چیزیں بیگ میں رکھیں اور احتیاط سے زپ بند کر دی اور خود کمرے سے نکل کر

کچن کی سمت آ گئی۔ کل رات فضلہ کے ہاں رب کی رحمت اُتری تھی۔ شام سے کچھ پہلے اسے ہاسپٹل لے جایا گیا

تھا اور چار گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد یہ خوش کن خبر سننے کو ملی تھی۔ وہ اتنی خوش ہوئی کہ بے ساختہ حرا آپا کے

گلے لگ گئی، جنہیں تانکی ماں اس کی تنہائی کے خیال سے پاس چھوڑ گئیں تھیں کہ باقی تو نسب ولید سمیت ساتھ

چلے گئے تھے۔

”شکر ہے خدا کا.....! بس اب اللہ تمہاری طرف سے بھی ہمیں خوش خبری سنوادے تو سکون کا سانس

آئے۔“

آپا نے اس کا گال چوم کر دُعا دی تو ایمان ولی کی موجودگی کے باعث کانوں کی لوؤں تک سرخ پڑ

گئی تھی۔

”ہمارے ایسے نصیب کہاں.....؟“

ولید کے سرد آہ بھر کے کہنے پر ایمان نے ٹھک کر اسے دیکھا تھا۔

”واٹ یو مین.....؟ بوڑھے ہو گئے ہیں اس انتظار میں جو.....“

وہ پھٹ پڑی تھی۔ ولید کی بات پر اس کے دماغ میں انگارے سے چٹخ اٹھے تھے۔ حرا آپا بھی یقیناً اس پر گرفت کرتی، اگر جو وہ کسی کام سے باہر نہ جا چکی ہوتی۔

”تین ماہ ہو چکے ہیں ہماری شادی کو، اطلاعاً عرض ہے۔“

ولید نے اس پہ سرد نگاہ ڈال کر جانے اس پر کیا جتنا چاہا تھا.....؟

”تین ماہ ہی ہوئے ہیں ناں.....! تین سال یا تین صدیاں تو نہیں بیت گئیں جو یوں آپ نا امید ہو کر بیٹھ گئے.....؟ پھر بھی اگر مطمئن نہیں ہیں تو میری بلا سے، اور شادی کر لیں جا کر۔“

وہ اتنا ہرٹ ہوئی تھی کہ باقاعدہ جھگڑے پہ اتر آئی۔ جو آنسو بہہ رہے تھے، وہ الگ۔ جبکہ ولید کی بے حسی اور لائق اپنے عروج پر تھی۔

”تو تم اجازت دے رہی ہو بخوشی.....؟“

وہ پتا نہیں کیا سننا چاہ رہا تھا اس کے منہ سے.....؟ یا مقصد محض تنگ کرنا، ستانا تھا، مگر اس کا تو دل کرب کے سمندروں میں ہلکورے لیتا پھر رہا تھا۔

”ہاں.....! آپ تو پہلے ہی سے یہی چاہتے ہیں، بندوق میرے کاندھے پر رکھ کر چلائیں گے اور.....“

وہ کچھ اور بھی شدتوں سے روتے ہوئے بولی تھی، جب ہی آپا کپڑے بدل کر آئیں اور اسے روتے پا کر ایک دم ٹھٹھک گئیں۔

”کیا ہوا.....؟“

انہوں نے بے ساختہ دہل کر سوال کیا تھا۔

”ابھی تو دونوں کو اچھے بھلے موڈ میں چھوڑ کر گئی تھی۔“

”بے وقوفوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے ہیں آپا.....!“

سوال ولید نے کیا تھا اور حد درجہ اطمینان کے ساتھ۔ آپا کا تحیر کچھ اور بڑھ گیا۔

”کیا بک رہے ہو ولی.....؟ میں پوچھ رہی ہوں، ایکی کو کیا ہوا ہے.....؟“

”خود ہی مجھے شادی کا مشورہ دے رہی ہے، پھر خود ہی رونا پینٹنا بھی ڈال کے بیٹھی ہیں محترمہ۔“

وہ نخوت سے کہتا کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جبکہ وہ آنسو پونچھتے ”سوسوس“ کر رہی تھی۔

”ہائے میں مر گئی.....! ایی.....! کیا کہہ رہا ہے ولید.....؟“

آپا نے کلیجہ تھام لیا تھا۔ ایمان نے کسی قدر برہمی سے ولید کو دیکھا۔

”کر کے تو دکھائیں، ایک ہی بار جان لے لوں گی ان کی۔“

وہ غصے سے چیخی تھی۔ ولید مسکرا دیا۔

”گڈ.....! یہ ہوئی ناں بات.....! اچھی بیویوں والی۔“

اس کے پاس آکر اپنا کاندھا اس کے کاندھے سے ٹکراتے ہوئے وہ لفظ ”بیوی“ پر زور دے کر بولا،

پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو بھی صاف کر دیئے۔

”میری ہر بات کو دل پہ مت لیا کرو، مذاق کرتا ہوں تم سے.....!“

اور ایمان سمجھ گئی تھی، وہ صرف آپا کو دکھانے کی خاطر التفات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے اندر ڈھیر ساری تھکن اتر گئی، تو کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا تھا۔ آپا ولید کے ساتھ چلی گئیں، تب وہ صحن میں پیچھی چارپائی پہ آ بیٹھی۔ دل بہت خالی خالی سا ہو رہا تھا۔

”ولید نے یہ بات یوں ہی تو نہیں کہی ہوگی.....؟ یقیناً اس نے اس کی کومحسوس کیا تھا۔“

گوکہ اس میں قصور اس کا کہیں بھی نہیں لگتا تھا، پھر بھی وہ خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

”محبت تم نے کب کی ہے

محبت میں نے کی ہے

تم نے تو اک خامشی کو اوٹ میں رکھ کر

کچھ اپنے لمس کے مصرعے میرے دل میں اتارے ہیں

لب نم ساز کے غم میں کئی نظمیں بگھو کر

میرے شانوں پر بکھیری ہیں

محبت تم نے کب کی ہے

تم نے اپنی آنکھوں میں دُور تک اسرار میں ڈوبی ہوئی

ایک شام جیسی سرد آنکھوں میں مجھے تحلیل کرنا تھا

سو میں بھی ایک بے وقعت سے لمحے کی طرح اب تک

تمہارے پاؤں کی مٹی سے لپٹا ہوں

نہ تم نے اس مٹی کو جھٹکا ہے

نہ اس بے وقعت بے مایا لمحے کو اٹھا کر اپنی پیشانی پر رکھا ہے

تمہاری خامشی کی اوٹ میں میرے لئے کیا ہے

بہت کچھ ہے مگر اقرار کی جھلک نہیں ہے

سمندر موجزن ہے اور کوئی ساحل نہیں ہے“

وہ کب سے اس کے انتظار میں صحن میں چکرا رہی تھی۔ آج اس نے معمول سے زیادہ دیر کر دی تھی۔

پتا نہیں کہاں رہ گیا تھا.....؟ اس کا فون بھی پک نہیں کر رہا تھا۔ صبح اسے کہا تھا، تیار ہو کر رہے، واپسی پر اسے

فضہ کے پاس ہاسپٹل لے کر جائے گا۔

اشعر بیٹھک میں تھا اور اپنی اسٹڈی میں مصروف۔ دوا اپنے کمرے میں غالباً مغرب کی نماز ادا کر

رہے تھے۔ تاؤ جی ابھی کچھ دیر قبل ہی کھیتوں سے واپس آئے تھے اور وہ انہیں کھانا دے کر چائے کا پوچھنے لگی،

جس سے انہوں نے منع کر دیا تھا۔

بالآخر وہ اس کے آنسوؤں سے ہار گیا تھا۔ ایمان نے آنسوؤں سے جل تھل نگاہوں سے اسے دیکھا، پھر اس کے بازو سے لگ کر اپنی نم آنکھیں اس کی آستین سے رگڑتے ہوئے بولی تھی۔

”اپنا ہمیشہ خیال رکھئے گا، ورنہ میں آپ سے پہلے مر جاؤں گی۔“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر جناب.....! اب مجھے اجازت ہے، مرہم پٹی کر لوں اپنی.....؟“

ولید نے بے حد فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔ تب وہ چوکی تھی، پھر اشعر کو میڈیکل باکس اٹھائے مسکراہٹ ضبط کرتے پایا تو گھبراہٹ، تشویش، پریشانی اور اضطراب کی جگہ خفت اور شرمندگی نے لے لی۔ تپے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ صرف اس سے دور ہی نہیں ہنسی تھی، سرعت سے پلٹ کر کمرے سے ہی نکل گئی۔ میزہیاں اتر کر نیچے آئی تو تاؤ جی سر پہ ٹوپی لئے اپنے کمرے سے باہر آئے تھے۔

”پتر.....! خیر ہے، میں نماز پڑھ رہا تھا، جب مجھے ایسا لگا جیسے کوئی چنچا ہو.....؟“

”جی کچھ نہیں.....! ولید کو چوٹ لگ گئی ہے ناں، تو میں خون دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔“

تاؤ جی اس کی بات سن کر بری طرح سے چو۔ نکلے۔

”کیسے چوٹ لگ گئی اسے.....؟“

”یہ سب تو انہوں نے نہیں بتایا، اوپر کمرے میں ہیں، آپ خود پوچھ لیں ان سے۔“

وہ آہستگی سے بولی۔ تاؤ جی غلت بھرے انداز میں اوپر چلے گئے۔ تب وہ آہستگی سے چلتی کچن میں آ گئی۔ چولہا جلایا اور فروغ سے دودھ کی کیتلی نکال کر گرم ہونے کو رکھ دی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ابھی بھی معمول پہ نہیں آئی تھیں۔ اسے کال یقین تھا، یہ حرکت صرف موسیٰ کی ہی تھی۔

”اگر انہیں کچھ ہو جاتا.....؟“

اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”اپنی کوشش کی ناکامی پر کیا وہ دوبارہ یہ حرکت نہیں کرے گا.....؟“

ایک نئی سوچ نے اس کے دماغ میں جگہ بنائی اور اسے لگا جیسے اس کا سانس الجھنے لگا ہو۔

”کیا کروں اب میں.....؟ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔“

اس کا دل چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ وہ اتنی بے دھیان تھی کہ دودھ ابل کر برز میں گرنے لگا، مگر اسے خبر تک نہ ہو پائی تھی۔

”ایمی جی.....!“

اس نے گھبرا کر دیکھا، اشعر تھا، ہمدردی سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”کنٹرول پور سیلف.....! بھائی بالکل ٹھیک ہیں۔“

وہ اس کا سر تھپک کر تسلی دے رہا تھا۔ اس نے ہونٹ کا کنارہ دانتوں تلے داب کر بچکیوں پر قابو پا کر

سرکواثبات میں جنبش دی اور چولہا بند کر دیا۔

”بابا کہہ رہے ہیں، گرم دودھ میں دیسی گھی ڈال کر دلی بھائی کو پلا دیں۔“

”ہاں.....! میں لا رہی ہوں۔“

”مجھے ایک بار پھر ان کا سیل ٹرائی کرنا چاہئے.....!“

وہ اس سوچ کے ساتھ ہی میزہیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ موبائل فون سمیت نیچے آئی تو تاؤ جی کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ ایمان نے ایک بار پھر ولید کا نمبر ڈائل کیا، بیل جاتی رہی مگر کال ریسپونڈ نہیں ہوئی۔ وہ کسی قدر جھنجلائی تھی اور سیل فون صحن میں نہچھی چارپائی پہ بیچ کر کمرے میں جانے لگی تھی کہ اسی وقت بیرونی دروازے پہ دستک ہوئی، ساتھ ہی بائیک کی آواز بھی تھی۔

وہ یقیناً ولید حسن تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب لپکی، مگر تب تک اشعر بیٹھک سے نکل کر دروازہ کھول چکا تھا۔ بائیک گیٹ کے اندر لاتے ولید کی سفید خون آلود شرٹ پہ نگاہ پڑتے ہی ایمان کی چیخیں نکل گئیں تھیں۔

”مائی گڈنیس.....! ولید.....! کیا ہوا ہے آپ کو.....؟“

اس سے کچھ فاصلے پہ کھڑے اشعر کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر وہ دوڑ کر اس سے پلٹ کر سر اسیمکی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے بولی۔ اشعر کے چہرے پر بھی فطری تشویش تھی، مگر اس نے حواس نہیں کھوئے تھے۔

”افوہ.....! آہستہ بولو، ساری دنیا کو بتا کر رہو گی کیا.....؟“

ولید اسے بازو سے پکڑ کر خود سے الگ کرتے ہوئے کسی قدر جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر بولا تھا، مگر وہ حواسوں میں ہی کہاں رہی تھی.....؟ موسیٰ کی دھمکیاں تمام تر سفاکی کے ہمراہ یاد آتے ہی اس کا دل پھر پھڑانے لگا تھا۔ ولید اسے نظر انداز کئے تیز قدموں سے چلتا اپنے کمرے میں چلا گیا، اشعر بھی پیچھے ہی تھا۔

”معمولی ایکسیڈنٹ ہے یار.....! ڈونٹ وری.....! تم ڈرامیڈیکل باکس لاؤ میرا۔“

ایمان اندر آئی تو ولید نارمل انداز میں اشعر سے بات کر رہا تھا۔

”دکھائیں، کہاں چوٹ لگی ہے آپ کو.....؟ میرے خدا.....! اتنا خون.....؟“

وہ یوں ہی روتی سسکتی اس کے نزدیک آئی اور اس کی شرٹ کے بٹن کھولنے لگی۔

”ایک کام کر لو تم، چاہے رولو چاہے.....“

ولید کا موڈ بری طرح سے بگڑا تھا۔

”میرا دل گھبرا رہا ہے ولید.....! مجھے بتائیں، کسی نے جان بوجھ کر تو آپ کو نہیں مارا.....؟“

”کیا لوگی تم چپ ہونے کا.....؟ ویسے ابھی زندہ سلامت کھڑا ہوں تمہارے سامنے۔ یہ رونے

دھونے کا پروگرام ابھی ملتوی کر دو۔“

تک کر کہتے ہوئے وہ کسی قدر بے چک اور روڈ لہجے میں بولا۔ ایمان تو اس کے الفاظ کی سفاکی پہ لرز اٹھی تھی۔

”خدا نہ کرے.....! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ.....؟“

وہ ایک بار پھر بلک اٹھی۔ ولید حسن نے عاجز ہو کر اسے دیکھا۔

”یہ دیکھو، ہاتھ جوڑ دیئے ہیں تمہارے سامنے، اب رونا تو بند کرو۔ کیوں یقین نہیں آ رہا ہے تمہیں کہ

میں ٹھیک ہوں.....؟“

بے چینی، پھر سے وہی عمل دہرانے پر مجبور کر دیتی۔

جب چوتھی سے پانچویں بار اس نے یہی حرکت کی، تب ولید نے نیند میں ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ ایمان ایک دم ساکن ہو گئی۔ اس نے جھک کر بغور اسے دیکھا۔ وہ مکمل طور پر نیند کی آغوش میں تھا، مگر اس بے خبری کے عالم میں بھی اس کے لبوں نے اس کے ہاتھ کو جہاں سے چوما تھا، وہ وہی جگہ تھی جہاں سے اس کا ہاتھ جل چکا تھا۔

اس کے متفکر، بے چین چہرے پر ایک دم ہی ایک الوہی مسکان اُتر آئی۔ ہاتھ کو اس کی گرفت سے نکالے بغیر وہ آہستگی سے اس کے ساتھ لگ کر لیٹ گئی تو چند لمحوں کے بعد خود بھی غافل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”سفر آسان لگتا ہے

دلِ برباد تجھ کو یہ

سفر آسان لگتا ہے

ادھر تو سوچتا تھا اور ادھر

آنکھوں سے کوئی خواب چہرہ آن لگتا تھا

دلِ برباد ہم نے تو کہا تھا

یہ سفر آسان لگتا ہے مگر

آنکھیں بدن سے چھین لیتا ہے“

اگلی صبح وہ جلدی بیدار ہو گئی تھی۔ چونکہ آپا کورات ہی اشعر نے ولید کے ایکسڈنٹ کے متعلق بتا دیا تھا، جیسی وہ سورج نکلنے سے بھی پہلے آن موجود ہوئی تھیں۔ ولید کی خیر خیریت دریافت کی، مطمئن ہوئیں اور کچن میں آگئیں۔

”آپا! میں ناشتہ بنالوں گی۔“

ایمان کو انہیں مصروف دیکھ کر انجانی سی خفت ہوئی۔

”ارے! کچھ نہیں ہوتا چندا! تم سب کو ناشتہ دو، بس!۔۔۔۔۔!“

ان کے لہجے میں مخصوص قسم کی نرمی و محبت تھی۔ ان کے ناشتہ بناتے بناتے ایمان نے تاؤ جی کے ساتھ ساتھ اشعر اور ددا کو بھی ناشتہ پہنچا دیا۔ ان کے کمروں میں اس دوران وہ دوبار ولید کو بھی دیکھنے آئی تھی، جو ہنوز سو رہا تھا، مگر جب تیسری بار وہ اندر آئی، تب وہ نہ صرف اُٹھ چکا تھا، بلکہ منہ ہاتھ دھو کر واش روم سے نکلا تھا۔

”اُٹھ گئے آپ!۔۔۔۔۔! ناشتہ لے آؤں!۔۔۔۔۔؟“

”تم نے جگایا کیوں نہیں مجھے!۔۔۔۔۔؟“

ناشتے کے لئے سرکواشات میں جنبش دے کر اس نے بال ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”میں نے سوچا آپ کی نیند بوری ہو جائے۔“

ایمان نے گلاس میں دودھ نکالتے ہوئے کہا تو اشعر پلٹ کر چلا گیا۔ جس وقت وہ دودھ کے گلاس سمیت اوپر آئی، ولید کمرے میں اکیلا تھا۔ بہت سارے تکیوں کے سہارے نیم دراز کشادہ پیشانی پر سفید پٹی بندھی تھی، شرٹ بھی تبدیل ہو چکی تھی، آسمانی شرٹ کا گریبان کھلا تھا، جس سے سینے پر پڑی کھردھیں بہت واضح ہو رہی تھیں۔ ایمان نے ہونٹ بھیج کر زاویہ بدل ڈالا۔

”واش روم میں شرٹ پڑی ہے میری، پہلے اسے دھو دینا، اماں کی نظر میں نہیں آنی چاہئے۔“

اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیتے ہوئے وہ آہستگی سے بولا تھا۔ ایمان نے محض سر ہلانے پر اکتفا

کیا۔

”اور کہاں چوٹ لگی ہے آپ کو!۔۔۔۔۔؟“

اس کی ساری تشویش اسی حوالے سے تھی۔

”چوٹ تو بس سر پہ ہی لگی ہے، باقی تو بایک سے گرنے کے باعث خراشیں ہی آئی تھیں۔“

وہ گھونٹ گھونٹ دودھ پی رہا تھا۔

”کون تھا وہ!۔۔۔۔۔؟ حلیہ یا وہ ہے آپ کو اس کا!۔۔۔۔۔؟“

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ولید نے خالی گلاس اسے تھمایا اور خود سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

”مجھے نیند آ رہی ہے ایمان!۔۔۔۔۔! پلیز، جو پوچھنا ہے، صبح پوچھ لینا۔“

ایمان نے دیکھا، اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ایمان کا دل انجانے خدشات کا شکار ہو گیا۔

”ولید!۔۔۔۔۔! ابھی مت سوئیں، مجھ سے باتیں کریں ناں!۔۔۔۔۔!“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ولید نے خفیف سی ناراضگی سمیت اسے دیکھا۔

”ایمان!۔۔۔۔۔! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اسی لئے تو کہہ رہی ہوں ولید!۔۔۔۔۔! آپ کو پتا بھی ہے، سر پہ چوٹ لگے تو فوری سونا نہیں چاہئے،

خطرناک ہوتا ہے۔“

اس اہم اطلاع پہ ولید کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکان اُتری۔

”وہ شدید چوٹ کے لئے ہوتا ہے۔ میری چوٹ معمولی ہے، ڈنٹ دری!۔۔۔۔۔!“

”آپ کو کیسے پتا آپ کی چوٹ معمولی سی ہے!۔۔۔۔۔؟“

وہ دانستہ بحث پہ اُتری۔ مقصد اسے جگانا تھا، مگر ولید کو اس بحث نے شدید کوفت میں مبتلا کر دیا تھا،

جیسی بے دریغ اسے جھڑک ڈالا۔

”شت آپ ایمان!۔۔۔۔۔! اگر تم خاموش نہیں ہو تو جاؤ، چلی جاؤ کمرے سے۔“

ایمان نے ہونٹ بھیج کر جلتی آنکھوں سے اسے کروٹ بدل کر بے خبر ہوتے دیکھا تو اپنے آنسو روکتی

وہاں سے اُٹھ گئی تھی۔ مگر دل کو چین بھی تو نہیں تھا۔ جلے پیر کی بلی کی طرح پھرتے پھرتے بار بار اسے دیکھنے

لگتی۔ اس کی ہموار سانسوں کا زیروہم اس کی پُرسکون اور گہری نیند کا گواہ تھا۔ مگر اسے جانے کون سا خوف لاحق

تھا کہ کئی بار اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی سانسوں کو محسوس کرتے اپنا اطمینان کرتی، مگر چند لمحوں بعد پھر وہی

محفوظ کر لوگی.....؟“

وہ بے حد مشتعل ہو کر کہہ رہا تھا۔ ایمان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، جب ولید نے آگے بڑھ کر ایک ہی کوشش میں اس کی بند مٹھی سے چابی نکالی تھی اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا تھا۔ وہ آنسو پٹی مضطرب سی اس کے پیچھے آئی تھی۔

”ذرا ٹھہرو ولید.....! یہ فضا کا بیگ لیتے جانا۔“

آپا نے اسے آندھی طوفان کی طرح سیڑھیاں اتر کر ڈیوڑھی کی سمت جاتے دیکھا تو زور سے آواز دی۔ وہ رُکا اور کسی قدر جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو گیا۔

”افوہ آپا.....! ابھی رہنے دیں۔ میں ابھی ہاسپٹل نہیں جا رہا ہوں، آفس جا رہا ہوں۔ محترمہ کی حماقتوں کی وجہ سے آل ریڈی لیٹ ہو گیا ہوں۔“

”کیا ہوا.....؟ ایمان سے پھر تمہاری لڑائی ہو گئی ہے کیا.....؟“

آپا جو کچن کے دروازے تک آئی تھیں، آخری سیڑھی پہ کھڑی ایمان کا سرخ چہرہ اور نم آنکھیں دیکھ کر مشکوک ہوئیں۔

”ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تعویذ بنا کر مجھے گلے میں لٹکائے پھرنے کا ارادہ کئے بیٹھی ہیں۔ سمجھائیں انہیں، میں انسان ہوں۔“

وہ بے حد نالاں ہو کر کہتا ہوا بایک اشارت کر کے دروازے سے نکل گیا۔ آپا نے پہلے دروازہ بند کیا تھا، پھر واپس آ کر سر جھکائے کھڑی، ہونٹ کچلتی ایمان کو بڑھ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

”مجھے بتاؤ ایمی جان.....! کیا ہوا ہے.....؟ دیکھنا، اگر اس کا قصور ہوا تو واپسی پہ کیسے اس کے کان کھینچتی ہوں۔“

ایمان کی آنکھیں پھر سے چھلکنے کو بے تاب ہو گئیں۔ بہت آہستگی سے اس نے اپنا خدشہ ان کے سامنے رکھ دیا تھا، جسے سن کر وہ بے ساختہ مسکرائی تھیں، پھر اسے لپٹا کر پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

”وہ صحیح کہتا ہے، بے جاضد ہے تمہاری.....! مرد گھر میں سنبھال کر رکھنے کی چیز نہیں ہے ایمی.....! انہیں رزق کی تلاش میں گھروں سے نکلنا ہی پڑتا ہے۔ حفاظت تو اللہ کی ہوتی ہے۔ اللہ کی امان میں دے دو اسے۔“

وہ یوں ہی اسے تھامے ہوئے اپنے ساتھ کچن میں لے آئیں۔

”بیٹھو یہاں، میں تمہارے لئے ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

س نے جھٹ سے کہا تو اب کی بار آپا نے اسے گھورا تھا۔

خبردار.....! آئندہ یہ نہ سنوں میں، اپنی خوراک کل خیاں رکھو، دن بھر بیکمزور ہو رہی ہو۔“

ناکی ڈانٹ میں بھی پیار کا گہرا رنگ تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکا گئی۔

☆☆☆

وہ مسکرا کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ناشتے کی ٹرے لے کر آئی تو ولید گرے اور وائٹ لائینگ کی شرٹ اور بلیو جینز میں تیار ہو چکا تھا۔

”کہیں جارہے ہیں آپ.....؟“

ایمان نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”کیوں.....؟ چھٹی کر کے بیٹھ جاؤں کیا.....؟“

وہ جوتے اپنے سامنے رکھ کر موزے پہنتے ہوئے بولا۔

”جی بالکل.....! آرام کریں گھر پہ، بس.....!“

ایمان نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے دو ٹوک انداز اختیار کیا، مگر ولید نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے جوتے پہنے اور اٹھ کر ہاتھ دھونے چلا گیا۔

”میں ایک گھنٹے بعد واپس آؤں گا۔ تم تیار رہنا، ہاسپٹل لے جاؤں گا تمہیں۔ وہاں سب تمہارا پوچھ رہے تھے۔“

وہ بہت غلٹ میں ناشتہ کر رہا تھا۔

”آپ کہیں جائیں گے، تب واپس بھی آئیں گے ناں.....!“

ایمان کی سنجیدگی بھرے انداز پہ ولید نے ہاتھ روک کر اسے گھور کر دیکھا۔

”کیا فضول بات کر رہی ہو بار بار.....؟ کہہ رہا ہوں ناں، معمولی چوٹ ہے۔“

”جو بھی ہو، میں بھی آپ سے کہہ چکی ہوں، آپ نہیں جائیں گے تو بس نہیں جانے دوں گی۔“

اس کے لہجے میں ہٹ دھرمی تھی، اس ہٹ دھرمی نے ولید کو چراغ پا کیا تھا۔

”اس طرح روک سکتی ہو مجھے.....؟“

اس کا لہجہ تناہوا سا تھا۔ ایمان نے مسکرا کر کاندھے اُچکائے۔

”روک چکی ہوں۔ دروازہ لاکڈ ہے اور چابی میرے پاس۔“

اس کے چہرے پر ہی نہیں، آنکھوں میں بھی فاتحانہ چمک تھی۔ ولید کے چہرے پر جھنجھلاہٹ بکھر گئی۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور دروازے کے پاس جا کر ناب گھما کر دروازہ کھولنا چاہا تو ایمان کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے طیش کے عالم میں ایک ٹھوکر بند دروازے کو رسید کی تھی، پھر جارحانہ تیوروں کے ساتھ اس کی جانب لپکا تو آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”چابی دو گی مجھے.....؟“

ایمان اس کے سرد تاثرات سے خائف ہوئی تھی جیسی اکڑ چھوڑ کر فوراً مفاہمت پر اتر آئی۔

”ولید.....! پلیز میری بات مان لیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے، جس نے کل آپ کو نشانہ بنایا، وہ آج پھر وہی حرکت کر سکتا ہے۔ پلیز.....!“

وہ اتنی ہلچلی ہو کر کہہ رہی تھی کہ ولید کو اپنا طیش دبانے کو ہونٹ بھینچنا پڑے۔

”اتنا کمزور عقیدہ کیوں ہے تمہارا ایمان.....؟ حد ہو گئی.....! تم کیا سمجھتی ہو، اپنے گھٹنے سے لگا کر مجھے

”لاکھ ضبط خواہش کے بے شمار دعوے ہوں

اس کو بھول جانے کے بے پناہ ارادے ہوں

اور اس محبت کو ترک کر کے جینے کا

فیصلہ سنانے کو کتنے لفظ سوچے ہوں

دل کو اس کی آہٹ پر برملا دھڑکنے سے

کون روک سکتا ہے

پھر وفا کے صحرا میں اس کے نرم لہجے اور سوگوار آنکھوں کی

خوشبوؤں کو پھونکنے کی جستجو میں رہنے سے

روح تک پھیلنے سے

ننگے پاؤں چلنے سے

کون روک سکتا ہے

آنسوؤں کی بارش میں

چاہے دل کے ہاتھوں میں

ہجر کے مسافر کے پاؤں تک بھی چھو آؤ

جس کو لوٹ جانا ہے

اس کو دُور جانے سے

راستہ بدلے سے

دُور جاتے سے

کون روک سکتا ہے

وہ شام کو ولید کے ساتھ ہسپتال گئی تو ماما کو وہ تھکی تھکی مضحل لگی تھی۔

”بھئی.....! بہت مبارک ہو فضہ.....!“

وہ جھک کر گول مٹول سی گلابی بچی کو پیار کر رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے.....؟ نڈھال کیوں ہو رہی ہو.....؟“

ماما کے بعد فضہ نے بھی جب نوٹ کیا تو پوچھ ڈالا، جواباً وہ بے دلی سے مسکرا دی۔

”مجھے کیا ہونا ہے.....؟ فٹ فاٹ ہوں۔“

”فٹ فاٹ نہیں ہے یہ، راستے میں ہی نہیں، یہاں اسپتال میں گھستے ہی دو منٹنگ ہو رہی تھی اسے۔

پوچھیں اس سے، کیا کھایا ہے اس نے.....؟“

ولید کے انداز میں شرارت تھی، جبکہ اس کی بات پہ فضہ کے ساتھ ساتھ تائی ماں اور ماما نے بھی چونک

کر اسے دیکھا تھا۔ پھر آپس میں نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔

”کب سے ہے یہ کیفیت.....؟“

تائی ماں لپک جھپک اٹھ کر اس کے نزدیک آئیں۔ چہرہ ایک دم ہی کسی انجانے جوش سے تمتا اٹھا تھا۔

”میں تو کل سے وقفے وقفے سے ایسا ہوتا دیکھ رہا ہوں۔ اصل بات تو یہ ہی بتائیں گی۔“

جواب اس کی بجائے ولید کی جانب سے آیا تھا، انداز سرسری سا تھا۔

”ایویں کر رہے ہیں تائی ماں.....! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

وہ صاف کئی کترا گئی۔ اس کے اضمحلال کی وجہ موسیٰ کا خوف تھا جو بہر حال وہ کسی پر آشکار نہیں کر سکتی

تھی۔ کل کے ولید کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے اس کا اضطراب بے حد بڑھا دیا تھا۔

”ہاں تو پتر.....! اللہ تجھے ٹھیک ہی رکھے، تو مجھے بتا تو سہی.....!“

تائی ماں کی بے چینی معنی خیز تھی۔ ماما کی نظریں بھی اسی پر جمی تھیں۔ ایمان نے اچنبھے میں گھر کر

انہیں دیکھا۔

”ایسی کون سی بات ہو گئی ہے.....؟ دو منٹنگ وغیرہ تو.....؟“

”افوہ ماما.....! اس بدھو کا سیدھا سیدھا چپک آپ کرائیں لے جا کر۔“

فضہ کی صلاح پہ ماما اور تائی اسے زبردستی ساتھ لے گئیں اور جب ان کی واپسی ہوئی تو ان کی خوشی اور

جوش قابل دید تھا۔

”لو بتاؤ بھلا.....! اتنی بڑی خوشی کی خبر اور جھلی کو پتا ہی نہیں۔ اللہ سائیں نے میری سن لی۔“

انہوں نے لمحوں میں سب کو ایمان کی پریکٹسی کی خبر سنا دی۔ اشعر کو مٹھائی لینے دوڑایا اور خود جھک کر

بچی کو پیار کرتے ہوئے بولی تھیں۔

”بھگوان ہے میری پوتی، اس کے آتے ہی خوشی کی خبریں ملنے لگیں۔“

ولید نے ماما کے ساتھ لگ کر کھڑی شرمائی، لجائی، جھپٹی جھپٹی سی ایمان کو دیکھا جس کے چہرے پر

قوس و قزح کے رنگ اترے ہوئے تھے۔

”ایک یہ ہمارا پتر ہے، ڈاکٹر ہو کے بھی پتا نہیں چلا کہ بیوی کا پیر بھاری ہے۔“

تائی ماں نے ولید کو مصنوعی خفگی سے گھورا۔ وہ اس عزت افزائی پہ محض انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

”ڈاکٹر نے بہت احتیاطیں بتائی ہیں۔ کمزور بہت ہے میری دھی رانی.....! اب تجھے بہت خیال

رکھنا ہے اس کا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا، ہاں.....!“

تائی ماں کی دھمکی پر ولید کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”تا بعد از ہیں جناب.....! فکر کیوں کرتی ہیں.....؟“

اور جب وہ اس کے ساتھ واپس آ رہی تھی، تب بھی تائی ماں نے ڈھیروں نصیحتیں اور ہدایتیں ساتھ کر

دی تھیں۔

”اب اس کے پیچھے مت پڑے رہنا کام کرنے کے لئے، ایک ادھ دن میں، میں خود آ کے سنبھالوں

گی اپنی دھی کو۔“

انہوں نے ولید کو جتایا تھا۔ اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر جھک کر گویا ایک بار پھر اپنی سعادت مندی کا

”آپ کی خوشی میری خوشی نہیں ولید.....؟“

”مجھے اتنا کچھ نہیں پتا، میں تمہارے دل میں گھس کر نہیں بیٹھا ہوا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ تم فی

الوقت اپنا موڈ درست کرو.....!“

اسی نخت سے وہ تنک کر کہہ رہا تھا۔ ایمان نے ہونٹ بھیج لے۔ ولید نے کریڈٹ کارڈ سے ادائیگی کی تھی، پھر اسے لئے باہر آ گیا۔ اس کے بعد وہ اس کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں آیا تھا اور کولڈ ڈرنک کے ساتھ باربی کیو آرڈر کیا۔

”میری زندگی میں میری اپنی ذات کی بہت اہمیت ہے۔ چونکہ یہ خوشی میری ہے، جیسی میں تم سے کوئی تمہاری پسند کی بابت نہیں پوچھوں گا، بھلے تم مانڈ کرو۔“

اس نے جو توجہ دی تھی، وہ ایمان کے لئے تکلیف دہ اور توہین آمیز تھی۔ مگر وہ ضبط کئے بیٹھی رہی تھی۔

”کھاؤ ناں.....! ڈاکٹر نے سنا ہے ناں کیا کہا ہے.....؟ تمہیں بہترین ڈائنٹ کی ضرورت ہے۔“

وہ خود رغبت سے کھاتے ہوئے اسے ٹوک کر بولا تو ایمان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”مجھے صرف ڈائنٹ کی ہی نہیں ولید.....! آپ کی توجہ اور محبت کی بھی ضرورت ہے۔ اگر آپ سمجھیں

تو.....؟“

وہ پھٹ پڑی تھی۔ آنکھیں بھیگ بھیگ گئی تھیں۔

”دے تو رہا ہوں توجہ.....! اور محبت کی بات مت کرنا میرے ساتھ، یاد ہے ناں، کیا کیا ہے تم نے

میرے ساتھ.....؟“

اس کے لہجے میں بیک وقت بلا کا طنز اور زہریلا پن تھا۔ اس کے جاہل خانہ تیوروں کی تاب نہ لاتے

ہوئے ایمان نے سرعت سے نگاہ جھکالی۔ پھر کچھ توقف سے رو ہانسی ہو کر بولی تھی۔

”آپ بھول کیوں نہیں جاتے ہیں اس بات کو.....؟ معاف کر دیں مجھے.....!“

”نہیں کر سکتا۔ کوئی اپنی توہین بھلا سکتا ہے بھلا.....؟ کھیلی ہو تم میرے خالص کھرے جذبوں سے۔

اگر میں نے ہٹیل پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہیں نہ چھین لیا ہوتا تم سے تو آج تم پتا نہیں کہاں ہوتیں.....؟ تم

بتا سکتی ہو تم نے میرے اوپر کس چیز کو ترجیح دی تھی.....؟“

اس کے دہنگ لہجے میں کرب کے شعلے تھے، شکست تھی، بے اعتنائی کا ڈکھ تھا۔ ایمان کو پہلی بار اس

کی کیفیت سمجھ آئی۔ اسے پہلی بار اس کا ڈکھ محسوس ہوا تو کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا۔ وہ جلتی آنکھوں سے کتنی دیر

اسے تکتا گویا جواب کا منتظر رہا تھا، پھر چھری اور کاٹنا دونوں پلیٹ میں شیخ دیئے تھے اور اشارے سے وٹر کو بلایا۔

”آج یہ بات بھی کنفرم ہو گئی کہ تمہیں میری خوشی سے نفرت ہے۔“

ویٹر بل لایا تو والٹ سے نوٹ نکا کر پلیٹ میں بیٹھے ہوئے وہ پچھنی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ایمان

اٹھ کر اس کے ساتھ چلی تو چال میں بے حد تھکن اور پڑمردگی تھی۔

یقین دلایا اور جب وہ اس کے ہمراہ ہاسٹل کی طویل سیڑھیاں اتر رہی تھی، ولید کا بس نہ چلتا تھا، اسے گود میں اٹھالے۔ وہ اس کی ایسے ہی کیڑ کر رہا تھا جیسے کوئی نازک آگینے کی۔

”تشریف رکھئے.....!“

گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اس نے کسی قدر شوخی سے کہا تو ایمان نے لرزیدہ پلکیں اٹھا کر بغور اس کے فریش چہرے کو دیکھا تھا۔

”خوش ہیں ناں آپ.....؟“

”نہ خوش ہونے کی وجہ بھی تو نہیں ہے۔ ویسے اگر ابھی تو کیا، کبھی بھی یہ خوش خبری نہ ملتی، تب بھی میں دوسری شادی نہ کرتا۔“

ڈرائیونگ سیٹ پر آکر گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا وہ پتا نہیں اسے چھیڑ رہا تھا کہ یقین کا سرا تھا رہا تھا۔

”مرد کی کسی بات پہ کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔“

ایمان نے جواباً سنجیدگی سے کہا تو ولید کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔

”اعتبار تو مجھے بھی تمہاری کسی بات کا نہیں کرنا چاہئے، مگر کر رہا ہوں۔“

اس کے لہجے میں کڑا دھٹ بھری تھی۔ ایمان کو جیسے سانپ نے سونگھ لیا۔ وہ ایک دم گرم سم ہوئی تھی۔

سوچوں کے اس بھنور سے وہ تب ابھری تھی جب گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔

ایمان نے نگاہ اٹھائی، سانس نے ایک مشہور شاپنگ آرکیڈ تھا۔ ولید اسے اترنے کا اشارہ کرتا ہوا اپنی

سمت کا دروازہ کھولنے لگا۔ ایمان نے تقلید کی تھی، مگر دانستہ کسی قسم کا استفسار نہیں کیا۔ اس کے ہمراہ سیڑھیاں

چڑھ کر وہ روشنیوں سے جگمگاتی شاپ میں آئی تو ہر سمت برائٹ کلرز کی گویا بہار آئی ہوئی تھی۔ ایک سے بڑھ کر

ایک قیمتی اور اسٹائلش لباس، ولید خاموشی سے گھوم پھر کر کپڑے دیکھتا رہا۔

”سر.....! آپ کو کس قسم کا ڈریس چاہئے.....؟ پارٹی، یا پھر برائیڈل.....؟“

سیلز گرل گویا اس کی ہیلپ کو آگے بڑھی تھی۔

”پارٹی.....!“

ولید نے اس کی بات کا جواب دیتے خود ہاتھ بڑھا کر ایک ہینگر نکال لیا۔ سی گرین اور ڈل اورنچ کلر

کا سوٹ جس کی اورنچ شرٹ پہ سی گرین بارڈر تھا، اور اس پر بہت جھلکاتا ہوا سا کام بنا ہوا تھا۔

”فٹائنک.....! آپ ان کے لئے لے رہے ہیں ناں.....! بہت سوٹ کرے گا ان کو۔“

سیلز گرل مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ ولید نے ایمان کو دیکھا جو سپاٹ چہرہ لئے خاموش نظر آ رہی تھی۔

اس نے کچھ کہے بغیر سوٹ سیلز گرل کی سمت پیک کرنے کو بڑھا دیا۔

”پہلے تمہاری وجہ سے میں اپنی شادی پہ جو میری زندگی کا بہت اہم موقع تھا، خوش نہیں ہو پایا تھا۔ میں

نہیں چاہتا تھا میری زندگی کے دوسرے اہم موقع پر کوئی رخنہ ڈالو۔“

ماٹھے پہ تیوریاں لئے وہ سلگتے ہوئے لہجے میں کاٹ سمو کر برہمی سے بولا تو ایمان نے کسی قدر شاکی ہو کر اسے دیکھا۔

ایمان شاکد اسے دیکھتی رہ گئی۔ جبکہ وہ اٹھ کر وہاں سے جا چکا تھا۔ ایمان کو قطعی سمجھ نہیں آ سکی تھی۔ اپنے اتنے بڑے نقصان پر کیا رومل ظاہر کرے؟..... روئے؟..... بین کرے؟..... یا پھر کچھ کھا کر سو رہے؟.....

☆☆☆

تھکا گیا ہے مسلسل سفر اُداسی کا
اور ابھی بھی ہے میرے شانے پہ سر اُداسی کا
وہ کون کیسا گر تھا جو بکھیر گیا
تیرے گلاب سے چہرے پہ زد اُداسی کا
میرے وجود کے خلوت کے عے میں کوئی نہ تھا
جو رکھ گیا ہے دیا طاق پر اُداسی کا
میں تجھ سے کیسے کہوں یار مہرباں میرے
کہ تو علاج نہیں میری ہر اُداسی کا
یہ جو آگ کا دریا میرے وجود میں ہے
یہی تو پہلے پہل تھا شرر اُداسی کا
نہ جانے آج کہاں کھو گیا ستارہ شام
وہ میرا دوست میرا ہم سفر اُداسی کا“

ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے اندر سے جیسے جیسے کی تمنائیں جاری تھیں۔ تائی ماں، فضلہ، اشعر،
ماقب بھائی، تاؤ جی کے علاوہ ولید بھی اس کا خیال رکھتا تھا، مگر وہ گیلی کٹری کی طرح سے سگ سگ کر ختم ہو رہی
تھی۔ فضلہ، فاطمہ کے ساتھ پورا گھر بھی سنبھالتی تھی۔

ڈاکٹر نے ایمان کو بہت پرہیز بتایا تھا۔ وہ مکمل بید ریختی پہ تھی اور تائی ماں تو اسے بستر سے پیر بھی
باہر نہیں نکالنے دے رہی تھیں۔ دن ایسے ہی ست روی سے گزر رہے تھے، جب بہت خاموشی سے، غیر محسوس
نڈاز میں ایک اور طوفان چلا آیا اور گویا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

وہ ایک عام سادہ دن تھا۔ ولید کو اسے لے کر اسی دن شہر چیک آپ کے لئے بھی جانا تھا۔ وہ موسیٰ
کا دوانی کو بھول بھال بیٹھی تھی، جب اس کے ایک میچ نے پھر اس کی زندگی میں ہلچل مچا دی۔ فضلہ کے اصرار پر
ہ فاطمہ سے کھیلنے ہوئے جوس کے سپ لے رہی تھی، جب اس کے سیل فون پہ میچ ٹون بجی، اس نے سرسری
سے انداز میں میچ کھولا تھا۔

”اس دن تو بیچ گئے تھے ناں آپ کے شوہر محترم، مگر مزید نہیں بیچ سکتے۔ پلاننگ تو اس
روز بھی مکمل تھی، مگر یقیناً ان کی کچھ سانسیں باقی تھیں۔ بس یہی سمجھ میں آتا ہے مجھے تو۔
اپنی دے.....! میں آؤب آف کنٹری تھا، جیسی آپ کو یہ مہلت بھی مل گئی۔ مگر اب میری
طرف سے اپنے شوہر نامدار کی لاش کا تحفہ قبول کرنے کے لئے تیار رہے گا۔“
موسیٰ کا دوانی.....!“

”تیلیوں کی بے چینی آ بسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں اور پھر ہواؤں میں
صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا تھا
ذکر نہ ہو اس کا بھی کل کو نارساؤں میں“

پچھلے دو دن سے ولید نے اس سے بول چال بند کر رکھی تھی۔ وہ منامنا ہار گئی تھی، مگر اس کا موڈ خوش
گوار نہیں ہوا تو بے بسی کے شدید احساس سمیت رونے بیٹھ گئی۔ صرف یہی نہیں، کھانا بھی احتیاجاً چھوڑ دیا، تب
وہ تملاتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

”کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو تم.....؟“

اس کا انداز بے حد کڑا تھا۔ ایمان نے ایک نگاہ اس کے بے زار کن انداز پہ ڈالی، پھر اسے زنج
کرنے کو کاندھے اچکا دیئے۔

”میری مرضی.....!“

”تمہاری مرضی کی ایسی کی تہی.....!“

وہ بھڑک کر بولا تو ایمان نے ہونٹ بھیج کر اسے دیکھا تھا۔

”جب تک آپ خفا رہیں گے، میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔“

”اتنی پرواہ تو نہیں ہے تمہیں میری خفگی کی.....؟“

وہ پھنکار کر بولا تو ایمان نے دونوں ہاتھوں میں اس کی کلائی جکڑ لی۔

”آپ کو یقین کیوں نہیں آ جاتا کہ میں.....“

”تم کیوں آخر یہ چاہتی ہو کہ میں تمہارے دام فریب سے نہ نکلوں.....؟“

”ولید.....!“

اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ ولید نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا، پھر کھانے کی ٹرے درمیان
میں رکھی اور خود نوالہ بنا کر اس کے منہ کے نزدیک لایا۔ اب ایمان میں تاب نہیں تھی کہ اس کا ہاتھ جھٹک دیتی۔

”میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں ولید.....! ٹرسٹ می.....!“

وہ لجاجت سے بولی۔ ولید نے بادل ناخواستہ سر اثبات میں ہلا دیا۔

”مجھے پتا ہے، آپ میری بات کا یقین نہیں کر رہے ہیں۔“

اس کا دل رونے کو چاہنے لگا۔

”کبھی کبھار میرا بھی جی چاہتا ہے ایمان.....! کہ تمہارا یقین کر لوں، مگر خود کو دھوکہ تو احمق دیتے ہیں

ناں.....؟ تم نے کبھی بلور کے اس گلاس کو سلامت بچتے دیکھا ہے جسے بے دردی سے دیوار پہ مار دیا گیا ہو.....؟
نہیں ناں.....! میں نے خود کو اسی طرح ٹوٹتے پایا تھا، تب میرے دل کی حالت تو اس سے بھی زیادہ تباہ کن تھی۔
تم کیوں چاہتی ہو کہ میں ایک ہی جگہ سے دوسری مرتبہ دھوکہ کھانے کا سامان کروں.....؟ مجھ میں تاب نہیں
ہے۔“

تھا اور خود کو دو دھاری تلوار سے کتنا ہوا محسوس کیا۔ وہ جیسے خاموشی سے آیا تھا، اتنی ہی خاموشی سے پھر چلا گیا۔ سارا دن گزرا، شام ڈھلی، پھر رات چھا گئی، مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ پھر ایک دن نہیں، جانے کتنے دن بیت گئے۔ ایمان کی حالت مردوں سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔ وہ یا تو سکتے کی کیفیت میں رہتی ورنہ ہیجانی کیفیت میں خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے لگتی۔ فضا ہر دم کسی سائے کی طرح سے اس کے ساتھ رہتی تھی۔

”عاقب نے دلی بھائی کا پتہ لگا لیا ہے۔ وہ آج کل اسلام آباد میں ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ بہت جلد وہ تمہارے ساتھ ہوں گے۔“

فضا اسے تسلیاں دیتی، وہ اس کی تمام وحشت کو ولید کی خفگی سے منسوب کر رہی تھی۔ صرف وہی کیا، سبھی گھر والے، وہ خفگی جس کی وجہ کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ ایک بار پھر ولید نے اس پہ احسان کیا تھا۔ اس کا پردہ رکھ لیا تھا، اور بھی کسی نے اس سے وجہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہر کوئی ولید کو ہی مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔

پھر وہ پورے ایک ماہ کے بعد گھر واپس آیا بھی تھا تو جانے کی غرض سے۔ اس کا انگلیٹڈ کالکٹ کنفرم تھا اور اسی روز رات کی فلائٹ تھی۔ ایمان نے سنا تو رہی سہی ہمتیں بھی جواب دے گئیں۔

اور جس پل وہ اس کے سامنے آیا، اسے دیکھ کر ایمان کو اپنی قوت گویائی چھٹی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ آنکھوں کی لالی گویا دانگی ہونے جا رہی تھی۔ زرد، کمزور چہرہ، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، بکھرے ہوئے بے ترتیب بال۔

وہ شاندار، وجیہ، خوش لباس ولید حسن جانے کہاں کھو گیا تھا.....؟

”ولید.....! مجھے معاف کر دیں.....! میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی ولید.....! مجھے.....“

اس کی بات اُدھوری رہ گئی تھی۔ ولید کے ہاتھ کے بھرپور طمانچے نے ایمان کی ناک سے خون چھلکا دیا تھا۔

”ایک لفظ بھی منہ سے مت نکالنا فاحشہ عورت.....! نفرت ہے مجھے تم سے، شدید نفرت.....! اگر میرا بس چلتا تو میں تمہیں ابھی اسی وقت طلاق دے دیتا، مگر میری مجبوری ہے کہ مجھے کچھ ماہ تمہارے ناپاک وجود کو اپنے نام کی پناہ دینا ہے۔“

اس کی خاموشی ٹوٹی تھی تو ایمان پر غضب ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ اپنی مطلوبہ چیزیں اٹھا کر انہی قدموں سے پلٹ گیا۔ وہ تڑپ کر اس کے پیچھے بھاگی آئی تھی۔ صحن میں سب لوگ جمع تھے، مگر وہ کسی کی بھی بات سے بغیر لگتا چلا جانا چاہتا تھا کہ تاؤ جی کی سرد آواز پہ رُک گیا۔

”کہاں جا رہے ہو.....؟“

”آپ کو بتا چکا ہوں۔“

وہ پلٹے بغیر نخوت سے بولا تھا۔

”ایمان کی زندگی کا فیصلہ کر کے جاؤ۔ ہم بچی کو تمہاری اس بے اعتنائی کا شکار نہیں کر سکتے۔“

”بچے کی پیدائش پہ مجھے انفارم کر دیجئے گا، میں اسے طلاق بھیج دوں گا۔“

صبح پورا پڑھنے تک ایمان کی آنکھوں میں اندھیرے چھانے لگے تھے۔ فاطمہ کے ساتھ ساتھ موبائل پہ بھی اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اسے اپنا پورا وجود برف کی سل میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ خوف و دہشت کا ایسا غلبہ ہوا تھا اس پر کہ وہ اس نمبر پر کال کر کے اسے کچھ کہنے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہی۔ بے بسی کے مظہر آنسو گالوں پر بہت سرعت سے اُتر آئے تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے ہمت کر کے سیل فون اٹھایا اور اس کا نمبر ڈائل کر کے اس سے بات کرنا چاہی تھی، مگر اسی وقت اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہونے لگی۔ وہ اتنی غائب دماغ تھی کہ نہ تو ولید کا نام دیکھ پائی، نہ اس بات پہ دھیان دیا کہ یہ رنگ ٹون اس نے ولید کے نمبر پہ سیٹ کر رکھی ہے۔ اس وقت اس کے ذہن میں صرف موسیٰ کا دوانی کا خوف، اس کی دھمکی کی دہشت کا غلبہ تھا، جیسی کال ریسپونڈ کرتے ہی بے ساختہ گڑ گڑاتے ہوئے بولی تھی۔

”میری بات سنو موسیٰ.....! میری بات سنو پلیز.....! دیکھو.....! تم جو کہو گے، میں کرنے کو تیار ہوں۔ چاہے وہ ولید سے طلاق کا مطالبہ ہو یا کچھ بھی، مگر خدا کا واسطہ ہے، تم ایسا مت کرنا، تم میری بات سن رہے ہو ناں موسیٰ.....؟“

دوسری جانب کی گھیر چپ کو محسوس کر کے وہ وحشت بھرے انداز میں چلائی تھی۔

”اگر موسیٰ ہوتا تو ضرور مان جاتا۔“

ولید حسن کی سرد پھنکار زدہ آواز پہ وہ ایک دم ٹھکی۔ سیل فون کان سے ہٹا کر اسکرین کو دیکھا اور جیسے فضا میں معلق ہو گئی۔ اسے ایک دم اپنا پورا وجود کسی طاقتور بارود سے اڑتا ہوا محسوس ہوا۔

”کون ہے یہ موسیٰ.....؟“

ولید حسن کے لہجے کی غراہٹ نے اس کے رہے سبے اوسان بھی خطا کر ڈالے تھے۔ سیل فون اس کے لرزے ہاتھ سے چھوٹ کر بستر پر جا گرا تھا۔ اسے لگا تھا، اس کا دل اندر ہی اندر گہرے پاتالوں میں گرنا جا رہا ہو۔

☆☆☆

”کون ہے موسیٰ.....؟“

ولید حسن نے اس کے رویہ و بھی اپنا سوال دہرایا تھا اور اس کے چہرے پہ موجود غیض کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہٹتی ایمان کے چہرے پر سروں کا رنگ پھیلتا چلا گیا۔

”وہی ہے ناں.....! جس کی وجہ سے تم اس سے پہلے بھی میری محبت کا مضحکہ اڑا چکی ہو.....؟“

وہ اگلا سوال کر رہا تھا جو پہلے سے بھی زیادہ سنگین تھا۔ ایمان کے وجود پہ لرزہ چھانے لگا۔

”تم جیسی بدکردار عورتیں ہی اپنے مردوں کے ہاتھوں قتل ہوتی ہیں۔ خدا کی قسم.....! آج اگر تم میری نسل کی امین نہ بن چکی ہو تیں تو میں ابھی تمہیں شوٹ کر دیتا۔ مگر یاد رکھنا.....! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تم میری مجرم تھیں، مگر اب..... اب تو تم نے مار ڈالا ہے مجھے۔“

ایمان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں نے ولید حسن کی خون رنگ آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا

ایمان کا ہی نہیں، تائی ماں اور فضلہ کا بھی کلیجہ منہ کو آگیا۔ جبکہ تاؤ جی کا اشتعال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

”تمہیں شرم نہیں آئی ولید.....! ایک بے گناہ بچی پر ظلم کر۔ تہ.....“

”یہ تو رب جانتا ہے بابا.....! کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون.....؟ میں آپ کی آنکھوں کے آگے تنے پردے کھینچ کر کسی کو بے حجاب کر دوں، مگر مجھے ایسا کرتے خوف خدا کا پاس ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔“

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا تو تائی ماں جو تب سے دیوار کا سہارا لئے کھڑی تھیں، پورے قد سمیت گرتی چلی گئیں۔ سب کو ان کی فکر پڑ گئی، جبکہ ایمان کا سفید ہوتا چہرہ کسی نے نہیں دیکھا تھا، جس سے خون کا گویا آخری قطرہ بھی کسی نے نہ چھوڑ لیا تھا۔

☆☆☆

”بھلانے سے جو بھولے نہ وہ کہانی چھوڑ جاؤں گا
زمانے میں تیری آنکھوں میں پانی چھوڑ جاؤں گا
لپٹ کر دیر تک در و دیوار سے لوگ روئیں گے
میں ایسی سوگ میں لپٹی جوانی چھوڑ جاؤں گا
مناؤ گے کہاں تک تم میری یادیں میری باتیں
میں ہر اک موڑ پہ اپنی نشانی چھوڑ جاؤں گا
میرے یہ لفظ مر کے بھی مجھے مرنے نہیں دیں گے
میں چپ ہو کے بھی لہجے کی روانی چھوڑ جاؤں گا
کچھ اس طرح سے نکلوں گا تیری دنیا کو ٹھکرا کر
میں دشمن کے بھی چہرے پہ حیرانی چھوڑ جاؤں گا“

اس کے دل کا بوجھ مزید بڑھ گیا تھا، جس کا واحد صل یہی تھا کہ وہ اصل بات سب پہ کھول دیتی اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ جہاں اس کی پوزیشن کلیئر ہوئی، وہاں ولید حسن بھی بے گناہ ٹھہرا۔ عاقب نے سب سے پہلے موسیٰ سے کانٹیکٹ کیا جو اس سے تو نہ ہوسکا، البتہ ہارون کا دوانی سے ضرور ہو گیا۔ جب اسے ساری بات کا علم ہوا تو حیرانی کے ساتھ ساتھ تاسف و ملال نے بھی اسے عاقب کے سامنے شرمندہ کر ڈالا تھا۔

”آپ بالکل بے فکر رہیں عاقب صاحب.....! میں اپنے بھائی کو جانتا ہوں۔ وہ میری محبت میں خطرناک حد تک جذباتی ہے، مگر وہ اس طرح کسی کو قتل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ نہ ہی اس کی اتنی پہنچ ہے۔ غالباً ایمان صاحبہ کو اس نے اپنی چال بازی سے چکر دیا ہوگا۔ وہ بہت معصوم ہیں، اس کے فریب میں آسانی سے پھنس گئی ہوں گی۔“

ہارون کا دوانی بہت شائستہ اطوار انسان تھا۔ عاقب سے بہت معذرت کرتا رہا تھا۔ بار بار شرمندگی کا اظہار کرتا رہا تھا۔

”موسیٰ فی الحال ملک سے باہر ہے، وہ جیسے ہی پاکستان آتا ہے، میں اسے لے کر آپ کے پاس

ضرور آؤں گا۔“

عاقب کے لئے اتنا ہی کافی تھا، اس نے واپس آکر ساری بات من و عن سنا دی تھی۔

”ٹھیک ہے.....! مگر کوئی اب اس اترے گھوڑے کو تو واپس بلائے جس کی وجہ سے میری بچی کی اتنی سی شکل نکل آئی ہے۔“

سب سے زیادہ خون اس معاملے کے سلجھاؤ پہ تائی ماں کا ہی بڑھا تھا۔

”بالکل جناب..... تب ہی ان کے چہرے پہ مسکراہٹ آئے گی۔ اُف.....! کتنی محبت ہے انہیں بھائی سے، اس کا اندازہ مجھے اب ہوا ہے تو جی چاہ رہا ہے، کاش میری بیوی بھی ایسی ہی ہو۔“

اشعر نے بہت دنوں کے بعد چپک کر بات کی تھی۔ مگر کچھ خوشیاں تلی کے پروں کی طرح ہوتی ہیں۔ جنہیں چھونے کی خواہش میں لپکو تو رنگ پوروں پہ اتر تو آتے ہیں، مگر پھر بھی ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

ولید سے رابطہ کر کے جب اسے ساری بات بتانے کی کوشش کی گئی تو اس نے کچھ بھی سننے سے انکار کر دیا تھا۔ کتنا قطعی اور دو ٹوک انداز تھا اس کا، جس میں اجنبیت اور سرد مہری کے سوا کچھ نہ تھا۔

”اس کے حوالے سے کوئی بات مت کرو عاقب.....! مجھے مزید کچھ بھی نہیں جانتا۔“

”مگر ولید.....! جو تم جانتے ہو وہ.....“

”مجھے کچھ بھی نہیں سننا۔ یاد رکھو عاقب.....! اگر تم نے زبردستی مجھے کچھ سنانے یا بتانے کی کوشش کی تو میں اپنا کانٹیکٹ ہی نہیں، یہ ٹھکانہ بھی بدل ڈالوں گا۔ پھر تم لاکھ سر پنچو، میری خاک تک بھی نہ پہنچ سکو گے۔ تمہاری تسلی کے لئے یہ کافی ہونا چاہئے کہ مجھے اس کے حوالے سے کسی اچھے برے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

اس کے لہجے میں جوتی تھی، وہ ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ عاقب کو خاموش ہونا پڑا تھا، مگر جب تاؤ جی نے اسے صلواتیں بتا کر اصل بات بتانا چاہی تھی، تب اس نے صرف ایک بات کہی تھی۔

”اب اگر آپ نے اس کا نام بھی میرے سامنے لیا تو میں خودکشی کر لوں گا، اور اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔“

اور تاؤ جی اتنے خائف ہوئے تھے کہ دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش ہی نہ کی تھی، اور یوں یہ معاملہ اس کی انتہاء پسندی کی وجہ سے وہیں انکارہ گیا تھا اور زندگی کے قیمتی ماہ و سال گزرتے چلے گئے۔

☆☆☆

”دسمبر کے دنوں میں تم نے مجھ سے یہ کہا تھا ناں
کہ تمہا ہوں مگر پھر بھی تمہارا ساتھ میں دوں گا
اپنے ہاتھ آنکھوں پر میری رکھ کر کہا تھا ناں
بھری دنیا سے فکرا کے تمہارا ساتھ میں دوں گا
نہ بدلوں گا کبھی میں جیسے یہ موسم بدلتے ہیں
بدلتے موسموں میں بھی تمہارا ساتھ میں دوں گا
تمہاری ان ہی باتوں سے بہت مجبور ہو کر میں

سب کے سامنے تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ
تمہارے عہد و پیاں سے تو یہ موسم ہی اچھے ہیں
تم عہد کر کے نہیں لوٹے یہ موسم لوٹ آئے ہیں
دسمبر میں کہا تھا ناں کہ واپس لوٹ آؤں گا
ابھی تک تم نہیں لوٹے دسمبر لوٹ آیا ہے

اس نے سلائیڈ کھولی اور گلاس وال کے پار دُور تک پھیلے سرسبز لان میں کھیلنے والوں بچوں کو دیکھا۔
سرخ، خوب صورت فراک میں بلبوس چھ سالہ فاطمہ اور سوا پانچ سالہ خوب صورت گل گوٹھنا سا اُمید حسن جو ایک
دوسرے کے پیچھے بھاگتے کرفٹ بال سے کھیل رہے تھے۔

معا ایک سفید پروں والی تلی کہیں سے اُڑتی ہوئی آکر گلاب کے ادھ کھلے پھولوں پہ بیٹھ گئی۔ سرخ
دبکتے ہوئے گلاب پر سفید تلی بہت نمایاں تھی، جیسی بچوں کی نگاہ کی زد میں آنے سے بچ نہیں سکی۔ دونوں بال
چھوڑ کر تلی کے تعاقب میں بھاگے۔ اُمید حسن کو غمو کر لگی تھی، اگلے ہی پل وہ منہ کے بل گرا ہوا حلق پھاڑ رہا تھا۔
ایمان کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا، مگر اس سے قبل اشعر اس تک پہنچ گیا تھا۔

”چپ چپ.....! روتے نہیں ہیں، مائی سن.....! بی بریو.....!“

اشعر اسے بہلا رہا تھا۔ ایمان مطمئن ہو کر وہیں لان کی سیڑھیوں سے پلٹ آئی۔ چوبی دروازے
سے اندر جانے قبل اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اشعر اُمید حسن کو اُٹھائے فاطمہ کی انگلی پکڑے گیٹ کی طرف جا
رہا تھا۔ یقیناً ارادہ چاکلیٹ دلانے کا تھا۔

سب کچھ بدل گیا تھا ان چھ سالوں میں۔ پاپا نے جائیداد سے ان دونوں کا حصہ انہیں دے دیا تھا اور
خود حج کرنے چلے گئے تھے۔ ماما بھی ان کے ساتھ تھیں۔ واپس آکر انہوں نے جب اپنے گھر میں رہنا چاہا تو
عاقب نے منع کر دیا تھا اور انہیں اپنے ہاں لے آیا۔ وہی گاؤں کا گھر جہاں دو منزلہ بہت خوب صورت عمارت
کھڑی تھی۔

فضہ نے گاؤں میں رہنے کو ترجیح دی تھی تو ایمان اکیلی کہاں جاتی.....؟ جیسی اس نے بھی اپنا پیسہ اسی
مکان کی آرائش و زیبائش میں لگا دیا۔ ایک سال کے اندر بہترین انداز زندگی ان کو میسر آ گیا تھا۔ وہی جس کی
کبھی وہ عادی تھیں مگر پھر انہوں نے حالات کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا تو قدرت نے انہیں پھر سے نواز دیا
کہ بے شک دینے والی ذات تو اسی کی ہے۔

فضہ کے ہاں فاطمہ کے بعد ایک بیٹا ہوا تھا جو ابھی صرف چھ ماہ کا تھا اور اس کا نام عالمیان تجویز ہوا
تھا۔ تاؤ جی اور تائی ماں بھی حج کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ دوا کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا۔ آخر دم تک
انہیں ولید سے ملنے کی آس رہی تھی۔

سب کچھ دھیرے دھیرے معمول پہ آ گیا تھا۔ عاقب کی طرح اشعر کو بھی اچھی جاب مل گئی تھی۔ پچھلے
دونوں خالصتاً تائی ماں کی پسند کی گئی لڑکی سے اس کی منگنی بھی کر دی گئی تھی۔ پاپا، تاؤ جی کے ساتھ سارا دن باغات
اور کھیتوں میں گزارتے جبکہ ماما کا زیادہ وقت تائی ماں کی طرح عبادت میں گزرنے لگا تھا۔ دونوں کا دکھ بھی تو

مشتہر کہ تھا۔

پچھلے سال ہارون کا دوانی بھی موسیٰ کے ساتھ تشریف لائے تھے اور ایمان، موسیٰ کو دیکھ کر گنگ ہونے
لگی تھی۔ ٹریفک حادثے میں وہ اپنی دونوں ٹانگوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔
”مجھے معاف کر دیں ایمان.....! میں جان گیا ہوں، مجھے آپ سے کی گئی زیادتی کی رب کی طرف
سے سزا ملی ہے۔“

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سبک اُٹھا تھا۔ اس کی آنکھ سے بہتے آنسو ایمان کے دل کو گداز کر گئے
تھے اور وہ جو اسے کبھی معاف نہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئی تھی، ہر کوئی ہی معاف کر گئی۔ گو کہ اس کی معافی سے ایمان
کی زندگی میں در آنے والے نقصانات اور ویرانیوں کو دُور کرنے سے قاصر تھے، مگر احساسِ ندامت انسان کی
سچائی کی علامت ہوا کرتی ہے۔

ندامت انہیں ہی ہوتی ہے جن کے ضمیر زندہ ہوتے ہیں، جو ازالے کی کوشش کفارے کی سعی شروع
کر ا دیتی ہے۔ ندامت جو گناہوں کو دھو ڈالتی ہے۔ جہنم کا ایندھن بننے سے بچا کر جنت کے باغوں میں لا ڈالتی
ہے۔ یہ سزا سے پہلے دل میں جاگ اُٹھے تو سزا جزا بن جاتی ہے۔ اسے دیر ہوئی تھی، مگر اتنی دیر تو نہ ہوئی تھی۔

ندامت آنسوؤں کا خراج لیتی ہے اور بخشش کا سامان مہیا کرتی ہے۔ دُنیا میں عزائیل کے بعد آنے
والے ہر ظالم، شہداء، شہر دو ابو جہل نام نہ ہونے کی وجہ سے ہی ذلیل و خوار ہوئے۔ ندامت آدم کے سر پہ بخشش
کا تاج پہنا دیتی ہے۔ ندامت عمر بن خطابؓ کو فاروق اعظمؓ بنا کر امیر المومنین بنا دیتی ہے۔ ندامت اگر
حکمرانوں کو میسر آجائے تو انہیں فاروق ثانی بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ پھر اگر اس کے سامنے کوئی ندامت کا
احساس لے کر معافی کا طلب گار بن کر آیا تھا تو وہ اسے معاف نہ کر کے گنہگار کیسے ہو جاتی.....؟

☆☆☆

”دسمبر جب بھی آتا ہے

وہ ہلکی پھر سے سیٹے موسموں کی تلخیوں کو یاد کرتی ہے

پرانا کارڈ پڑھتی ہے

کہ جس میں اس نے لکھا تھا

میں لوٹوں گا دسمبر میں

نئے کپڑے بناتی ہے وہ

سارا گھر سجاتی ہے

دسمبر کے وہ ہر دن کو

گن گن کے بتاتی ہے

جوں ہی پندرہ گزرتی ہے

وہ کچھ کچھ ٹوٹ جاتی ہے

مگر پھر پرانی الہم کھول کر

ماضی کو بلاتی ہے
نہیں معلوم یہ اس کو کہ
بیٹے وقت کی خوشیاں
بہت تکلیف دیتی ہیں
محض دل کو جلاتی ہیں

یوں ہی دن بیت جاتے ہیں
دسمبر لوٹ آتا ہے
مگر وہ خوش فہم لڑکی

کلینڈر میں دسمبر کے مہینے کے صفحے کو موڑ دیتی ہے

کچن میں کھڑی وہ رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی، جب اُمید حسن بھاگتا ہوا آکر اس سے
پلٹ گیا۔

”ماما.....! ماما جانی.....!“

ایمان نے سالن کے نیچے پہلے آنچ دھبی کی تھی، پھر ہاتھ سے چچ رکھ کر پلٹ کر اسے دیکھا۔ وائٹ
گرٹا شلوار میں ملبوس، سر پہ ننھی سفیدی ٹوپی لئے وہ ابھی ابھی قاری صاحب سے سپارہ پڑھ کے فارغ ہوا تو
سیدھا اسی کے پاس آگیا۔

”جی ماما کی جان.....!“

ایمان نے جھک کر اسے اپنی ہانہوں میں بھر لیا اور پیشانی کو چوما۔

”ماما جان.....! میرے پاپا کہاں ہیں.....؟“

اس کے سوال نے ایمان کے چہرے پہ سنجیدگی طاری کر دی تھی۔

”بیٹا.....! آپ کو بتایا ہے ناں، وہ ”یو کے“ میں ہوتے ہیں۔

”مگر ماما جان.....! علی کے پاپا بھی ”یو کے“ میں رہتے ہیں، لیکن وہ یہاں بھی تو آتے ہیں، اسپتالی

عید کے دنوں میں، پھر میرے پاپا کیوں نہیں آتے.....؟ میں نے کبھی انہیں نہیں دیکھا۔“

یہ وہ سوال تھے جو وہ متعدد بار اس سے کر چکا تھا۔ ایمان ہر بار اسے بہلانے کی کوشش میں ہلکان ہو

جاتی۔ وہ جس عمر میں تھا، وہاں اسی کی کوشدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے آس پاس جتنے بھی بچے تھے،

کسی کے ساتھ یہ محرومی نہیں تھی۔ یہ فطری احساس اور تقاضہ تھا جو اسے اکثر مضطرب کیا کرتا تھا۔

”مائی لونگ بھیجتے.....! ہاؤ آر یو.....؟“

اشعر جو چائے کی طلب میں وہاں آیا تھا، اُمید حسن کے سوالوں پہ ایمان کو پریشان ہوتے دیکھ کر
آگے بڑھ آیا۔

”الحمد للہ.....!“

وہ بڑے تدبر سے بولا تھا۔ اس کی تربیت گھر کے چاروں بزرگوں نے کی تھی اور کیا خوب کی تھی۔

اشعر نے آگے بڑھ کر اسے خود اٹھالیا۔

”آپ کو پتا ہے جانو.....! آپ کے پاپا بہت جلد آپ سے ملنے کے لئے یہاں آرہے ہیں.....؟“

اشعر کی بات پر ایمان نے کسی قدر حُفگی سے اسے دیکھا تھا۔

”پلیز اشعر.....! اسے جھوٹی آس مت دلاؤ.....!“

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں بھابی.....! بلیومی.....! بھائی آرہے ہیں۔“

اشعر نے اپنا رخ اس کی جانب پھیر کر جس یقین سے کہا تھا، اس نے پہلے ایمان کو متحیر، پھر ایک
انوکھی خوشی کے احساس سے ہم کنار کیا تھا۔ اشعر، اُمید حسن کو لئے وہاں سے چلا گیا تو ایمان کے ہونٹوں پر
آسودہ مسکان بکھر گئی تھی۔ مگر جب رات کے کھانے کے بعد وہ تائی ماں کے لئے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو
اندر سے آتی اشعر کی آواز نے اسے وہیں جامد کر دیا تھا۔

”انہیں یہاں کس طرح آنے پر آمادہ کیا ہے اماں.....! یہ الگ داستان ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ
صرف ایک شرط پہ یہاں آنے کے لئے آمادہ ہوئے ہیں، اور وہ یہ کہ کوئی ان سے ایمان بھابی کے حوالے سے
کسی قسم کی بات نہیں کرے گا۔“

اشعر کا دھیمالہجہ واضح طور پر بجھا ہوا تھا۔

”ارے.....! اسے آنے تو دو ایک بار، میں خود سب کچھ سنبھال لوں گی۔“

تائی ماں کی آواز میں ایک جوش تھا، اعتماد تھا، مگر اس کا اعتماد اس پل زائل ہو گیا تھا، جب وہ آہستگی
سے پلٹ کر وہاں سے جا رہی تھی تو وہ خوشی جو اس کے آنے کی اطلاع پا کر دل میں بکھری تھی، آنسوؤں کی
صورت بہتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

نئے پردے، خصوصی سجاوٹ یعنی ان ڈور پلانٹس وغیرہ کا انتظام، دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز آویزاں کی گئیں جس سے گھر ایک دم سے جگمگا اٹھا۔

جس روز اسے آنا تھا، تائی ماں نے فضلہ اور اس کے سر پہ کھڑے ہو کر اس کی پسند کے سارے کھانے تیار کر دائے تھے۔ یہ سب اپنی جگہ اہمیت رکھتا تھا، مگر اک کام ایمان نے بھی کیا تھا۔ اس نے بیڈروم کو ولید حسن کے لئے خالی کر دیا تھا۔ جب اپنی ہر چیز وہ اُمید حسن کے کمرے میں منتقل کر رہی تھی تو فضلہ نے کسی قدر خفگی سے اسے ٹوکا۔

”دس از ناٹ فیئر ایمی.....! اگر تم خود اپنی جگہ چھوڑ دو گی تو کسی کو کیا ضرورت ہے اہمیت دینے کی.....؟“

اس کی جھنجلاہٹ پہ ایمان کے چہرے پر زخمی مسکان اُتر آئی۔
”میں ان پر زبردستی مسلط نہیں ہونا چاہتی ہوں فضلہ.....! رشتے چاہ اور خلوص کے ساتھ، محبت سے جڑے رہا کرتے ہیں۔ اگر یہ سب نہ ہو تو مضبوط تعلق بھی کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ چھ سال بھی گزرے ہیں نا.....؟ یہ چند دن جو وہ یہاں رہیں گے، میں انہیں ذہنی اذیت میں مبتلا کیوں کروں.....؟“
”اس طرح کب تک چلے گا.....؟“

فضلہ کے اندر دکھ اُترنے لگا۔ ایمان کی زندگی کی یہ بے کیفی اسے اکثر مضطرب کر دیا کرتی تھی۔
”جب تک خدا کو منظور ہوگا۔“

ایمان کے نرمی سے کہنے پہ فضلہ کو اس کے صبر پہ، برداشت پہ رونا آنے لگا۔ اسے ایئر پورٹ سے ریسیو کرنے کے لئے پورا گھر تیار تھا۔ اشعر کے کہنے پہ ایمان نے اُمید حسن کو بھی تیار کر دیا تھا۔

”آپ نہیں چلیں گی ماما جان.....؟“
اُمید حسن کے سوال پر اس نے نرمی سے اس کا گال سہلایا تھا۔

”نہیں بیٹے.....! ماما کو گھر پہ رُکنا ہے۔“
”آپ کو ساڑھی پہن کر تیار ہونا ہے اس لئے.....؟“

”ساڑھی کیوں.....؟“
ایمان جو اسے جوتے پہنا رہی تھی، چونکی۔

”علی کے پاپا جب ”یو کے“ سے آتے ہیں تو علی کی ماما بھی ساڑھی پہن کر تیار ہوتی ہیں نا.....!“
وہ جواباً بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ایمان کو ایک دم چپ لگی تھی۔

”آپ نے کبھی ساڑھی نہیں پہنی ماما.....! آج ضرور پہننے گا۔ اوکے ماما.....! اللہ حافظ.....!“
وہ جوتے پہن چکا تھا، اُچھل کر صوفے سے اُترا اور اس کے گال پہ بوسہ لے کر باہر بھاگ گیا۔

ایمان اسی طرح ساکن بیٹھی تھی۔

”تم اب گرہاں ہو
میں صحرا کی طرح ہوں
دو بوند جو برسو گے
بے کار میں برسو گے
ہے شک بہت مٹی
ہر سمت بگولے ہیں
صحرا کے بگولوں سے
اُٹھتے ہی تو شعلے ہیں
تم کھل کے اگر برسو
صحرا میں گلستاں ہو
پر تم سے کہیں کیسے
تم اب گرہاں ہو“

اس کے آنے کی تاریخ کا پتا چلا تو وقت نے جیسے ریگنا شروع کر دیا۔ کسی من چاہے، دل پذیر شخص کی چاہت ہو اور انتظار طویل تو لمحے صدیاں بن ہی جایا کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق وقت کی پیمائش کرتا ہے اور وقت کو اپنی کیفیات اور محسوسات کے حوالے سے گزرتا ہوا دیکھتا ہے۔

مثال کے طور پر اپنی کسی بہت پیاری اور محبوب ہستی کے پاس بیٹھے ہوئے وقت جس تیز رفتاری سے گزرتا ہے، اس کا انتظار کرتے ہوئے وہی وقت اتنا ہی ست اور ریگ ریگ کر چلنے والی چیز بن جاتا ہے، یعنی وقت کی پیمائش کا تعلق بھی کیفیت کے پس منظر سے ہے۔ کسی کی ایک رات بھی اتنے وقت میں بتتی ہے جس میں کسی کا ایک سال بسر ہوتا ہو۔

اس کی جانب سے دیئے گئے الٹی میٹم کے باوجود دل تھا کہ ہر آہٹ پہ دھڑک اُٹھتا، آنکھ تھی کہ ہر کھلے پہ چونکتی۔ غرض وہ بل بل اس کا انتظار کسی عبادت کی طرح کرتی رہی اور دل کا درد دل میں چھپائے اس کے آنے کی خوشی میں گھر سجاتی رہی۔ صرف وہی کیا، فضلہ، تائی ماں اور ماما، سب اس کے ساتھ شریک تھیں۔

گھر کمرے سے رنگ و روغن کروایا گیا تھا۔ عاقب نے تو اس کے کمرے کا فرنیچر بھی بدلوادیا۔

”بس ڈھوپ اور ریت ہے اور پیاس کا سفر
کیا دل کے سامنے کسی صحرا کو دیکھتی
اس چشمِ سرد مہر کے سب رنگ دیکھ کر
کیا اشتیاقِ عرضِ تمنا کو دیکھتی
اس شہر بے نیاز میں جب تک رہا قیام
حسرت رہی کہ چشمِ شناسا کو دیکھتی“

اسے آئے ہوئے چوتھا دن تھا اور اس دورانِ ایمان سے اس کا متعدد بار سامنا ہوا تھا اور ہر بار اس کی یکسر غیر اور اچھٹی اجنبی نگاہوں نے ایمان کے دل کے لاتعداد ٹکڑے کئے تھے۔ وہ اس طرح اسے اگنور کئے ہوئے تھا گویا اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو۔

کتنا بدل گیا تھا وہ ہر لحاظ سے۔ پہلے سے ولید کو تو کہیں گم کر آیا تھا۔ سنجیدگی ایسی جامد کہ کسی کو بات کرنے سے قبل الفاظ تولنے پہ اُکسائے، نگاہوں کی مستقل سرخیوں میں بہتی غیریت میں جو سرد مہری تھی، وہ ہر رشتے کو ایک فاصلے پہ ہی نہیں، ایک حد میں رہنے پر از خود مجبور کرتی تھی۔

جب وہ آیا تھا، تو ایمان نے کتنے اشتیاقِ آمیز انداز میں کچن کی کھڑکی سے اسے دیکھا تھا۔ بلیک ٹو پیس میں اس کا ورزشی دراز سراپا بے حد نمایاں تھا۔ وجاہت و غور و دی تو پہلے بھی کیا کم تھی، مگر وہاں کے ماحول نے اس کی شخصیت میں جو نکھار اور بے نیازی پیدا کی تھی، وہ اسے کچھ اور بھی دلکشی سونپ گئی تھی۔ ایمان بھیکتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”تمکنیت سے تجھے رخصت تو کیا ہے لیکن
ہم سے ان آنکھوں کی حسرت نہیں دیکھی جاتی
کون اُترا ہے آفاق کی پنہائی میں
آئینہ خانے کی حیرت نہیں دیکھی جاتی“

اشعر نے اسے دیکھ کر بے ساختہ اشعار پڑھے تھے۔ ہونٹوں پر ستائش سے بھری مسکان تھی، مگر اس کی سنجیدگی کا وہی عالم تھا۔

”ماہِ تمام ابھی چھت پہ کون آیا تھا
کہ جس کے آگے تیری روشنی بھی ماند ہوئی“

اشعر واقعی مرعوب تھا یا پھر اتنا خوش کہ اس خوشی کے الفاظ کا پیرا بہن پہنا کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ولید نے ساٹ نظریں اٹھائیں۔

”تمہاری شادی کب ہے اشعر.....؟“

”ابھی تو ایک ماہ ہے۔ میری شادی کی تیاریوں پر تو آپ جناب کی آمد کی مبارک خوشیاں چھا گئیں

ہیں۔ سبھی کچھ اُدھورہ ہے جناب.....!“

وہ جواباً مصنوعی آہ بھر کے بولا۔

”فکر کیوں کرتے ہو.....؟ ولید کے آجانے سے جہاں گھر کی خوشیاں مکمل ہوتی ہیں، وہاں اُدھورے کام بھی جلد سمٹ جائیں گے۔ انشاء اللہ.....!“

عاقب نے مسکراتے ہوئے گویا اسے تسلی دی۔ اشعر فرشی سلام جھانڈنے لگا۔

”بابا.....! بڑے چاچو تو چھوٹے چاچو سے بھی زیادہ گند لگتے ہیں۔“

عاقب کی گود میں چڑھی بیٹھی فاطمہ جوتب سے مسلسل ولید کو دیکھ رہی تھی۔ معصومانہ جوش سے بولی۔ ایک مشترکہ قبضہ پڑا جبکہ اشعر کا منہ اُتر گیا۔

”فاطمہ کی بچی.....! تجھے کاندھوں پر بٹھا کر سیریں کراتے کاندھے میرے گھسے تھے، چاکلیٹس اور آئس کریم کھلاتے میری جیبیں خالی ہو گئیں اور تعریفیں بڑے چاچو کی ہو رہی ہیں.....؟ بے وفا بھتیجی.....!“

وہ مصنوعی غصے سے دانت کچکپکانے لگا تو ایک لمحے کو سہی، ولید کے ننگی چہرے پر بھی ایک نرم سی روشن مسکان اُتری تھی۔ آف وائٹ، خوب پھولی ہوئی فراک میں ملبوس، ریشمی بالوں کو خوب صورت انداز میں سمیٹ کر سلور پنوں سے جکڑا گیا تھا۔ خوب صورت، معصوم سا بیضوی چہرہ اور ستاروں کی مانند دکتی سیاہ گھور آنکھیں، وہ بے حد کیوت تھی۔ ولید نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تو اگلے ہی لمحے باپ کی گود سے اُچھل کر وہ اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

”نو پاپا.....! آپ اس سے پیار نہیں کریں گے۔ آپ صرف میرے پاپا ہیں، مجھ سے ہی پیار کریں گے۔“

ولید نے اسے اپنے قریب کیا ہی تھا کہ امید حسن نے شدید غصے میں آتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے فاطمہ کو زور سے دھکا دیا تھا، وہ گرتے گرتے بچی۔ وہاں موجود تمام لوگوں کو ایک دم جیسے سکتہ ہو گیا۔

”بری بات امید بیٹا.....! فاطمہ آپ کی بہن ہے اور آپ کے پاپا اس کے چاچو ہیں۔ اشعر چاچو کی طرح اشعر چاچو بھی آپ سے پیار کرتے ہیں ناں.....! جیسے عاقب پاپا کرتے ہیں آپ سے۔ اس طرح آپ کے پاپا بھی فاطمہ سے پیار کر سکتے ہیں۔“

ایمان جو کھانے کے لئے انہیں بلانے آئی تھی، اس کو نرمی و حلاوت سے سمجھا رہی تھی۔

”لیکن اشعر چاچا، عاقب پاپا، فاطمہ سے بھی تو پیار کرتے ہیں ناں.....! لیکن میرے پاپا میرے پاس نہیں تھے، یونو.....! میں بہت مس کرتا تھا انہیں۔“

وہ ایک دم بھبک کر رو پڑا۔ ایمان کو یک بارگی اس کی محرومی کی شدت کا اندازہ ہوا تھا۔ ولید جوتب سے ہونٹ بھینپنے لاقط اور خاموش بیٹھا رہا تھا، کسی طرح بھی خود کو امید حسن کو کھینچ کر گلے لگانے سے نہ روک سکا۔

”آپ مجھے چھوڑ کر تو نہیں جائیں گے ناں پاپا.....؟“

وہ بچکیوں کے درمیان بولا۔ ولید کی آنکھوں کی سرخیاں مزید گہری ہو گئیں۔ ہر کوئی اپنی جگہ پہ ساکن تھا۔ اس جذباتی منظر نے تائی ماں کی آنکھیں بھگو ڈالیں۔

”پر اس کریں ناں پاپا.....! آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ ویسے ہی جیسے عاقب پاپا،

فاطمہ اور خالہ جانی کے ہر وقت ساتھ رہتے ہیں۔“

اونچی آواز میں روتا ہوا اُمید حسن سسکیاں بھر بھر کے سوال کر رہا تھا اور ولید خاموش تھا۔ ایمان سے مزید نہیں ٹھہرا گیا تو تیزی سے پلٹ کر چلی گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ ولید کی سلگتی آنکھوں نے دروازے تک اس کا پیچھا کیا ہے۔

☆☆☆

”تجھ کو بھی نہ مل سکی مکمل
میں اتنے دکھوں میں بٹ گئی تھی
رستہ تھا وہی پر بن تمہارے
میں گرد میں کیسے اُٹ گئی تھی“

اس نے آج واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ ہفتے بھر کے کپڑے دھونے والے جمع تھے۔ کل اتوار تھا اور کل ہی تائی ماں کا ارادہ اشعر کے سسرال تاریخ طے کرنے جانے کا بھی تھا۔ وہ بچوں کے اسکول آنے سے قبل یہ کام سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ دُھلے ہوئے کپڑوں کی باسکٹ اٹھائے وہ چھت پر جانے کے ارادے سے بیرونی حصے کی سیڑھیوں کی سمت آئی تو اسی پل ولید بھی اپنے دھیان میں نیچے اُترتا آیا تھا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ ایک وقت میں ایک کو اپنی جگہ چھوڑنا ضروری تھا کہ سیڑھی کی چوڑائی بہت محدود تھی۔ اس سامنے پر جہاں ایمان کنفیوز ہوئی تھی، وہاں ولید کے چہرے پر موجود سنجیدگی کچھ اور بھی گہری ہو گئی۔ اسے اپنی جگہ پہ جامد دیکھ کر ایمان کو ہی پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ مگر اگلا لمحہ اس کے لئے تیرد حیرانگی لے کر آیا تھا، جب اس کی کلائی پہ ولید حسن کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔

”یہ ضروری تو نہیں تھا کہ اپنی نفرت اور انتقام کے دائرے میں میری ذات کے ساتھ ساتھ میرے بیٹے کو بھی گھسیٹنا، اور کچھ نہیں تو صرف یہ ہی سوچا ہوتا کہ وہ میرا ہی نہیں تمہارا بھی کچھ تھا۔“

اس کے بھاری بھیچے ہوئے حقارت زدہ لہجے میں اتنی تلخی تھی کہ ایمان گنگ رہ گئی۔

”کیوں کیا تھا اس نے ایسا.....؟“

وہ سراپا احتجاج بن گئی تھی۔

”مطلب کیا ہے آپ کا اس بات سے.....؟ جو بھی کہنا چاہتے ہیں کھل کر کہیں.....!“

آنکھوں میں اُترے آنسوؤں کو بہتے ہوئے وہ کسی قدر ترشی سے بولی تو ولید کے چہرے پر زہر خند

پھیلنے لگا۔

”احساسِ محرومی کا شکار کر دیا ہے تمہاری تربیت نے اسے۔ تم نے اسے قدم قدم پہ احساس دلا دیا کہ

اس کے پاس باپ کی محبت نہیں ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں کتنا بڑا کمپلیکس ہے اس کا، اندازہ ہے تمہیں.....؟“

وہ بے طرح بھڑک کر بولا۔ اس کے لہجے میں بے گانگی، تلخی، رکھائی اور جھنجلاہٹ کے ساتھ ساتھ

نفرت کا رنگ بھی شامل تھا۔ ایمان کو اس کی سلگتی نگاہوں سے اپنا تن، من، دھن راکھ ہوتا محسوس ہوا۔

”آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے.....“

آنسوؤں کی شدت نے اس کی بات بھی مکمل نہیں ہونے دی۔ شدید غم اس کے حلق میں کانٹے ڈال گیا۔ بدگمانی کی انتہاء تھی۔ اسے لگا اس کا آبلہ پائی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

”پھر اور کس نے کیا یہ سب.....؟ وہ تمہارے ہی پاس تھا ناں.....؟ زندگی میں قدم قدم پہ تم نے اسے اس محرومی کا احساس بخشا، نہ کہ میں نے.....؟“

وہ زور سے دھاڑا۔ ایمان ایک دم پلٹی تھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی اندرونی حصہ میں غائب ہو گئی۔ ولید حسن نے شدید طیش میں آکر کپڑوں کی باسکٹ کو ٹھوکر سے اُڑایا اور خود تلملاتا ہوا چلا گیا۔ دُھلے ہوئے کپڑے گرد آلود ہو کر وہیں پڑے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

”تیری ہجر کا ملال تھا مگر اب نہیں
مجھے صرف تیرا خیال تھا مگر اب نہیں
میری بے مثال محبتوں کے نصیب میں
تو زمانے عمر میں مثال تھا مگر اب نہیں
جسے تو نے داد عطا کیا وہی آدمی
تیری قربتوں میں نہال تھا مگر اب نہیں
میں تیری تلاش میں ریزہ ریزہ بکھر گیا
وہی جنونِ شوقِ وصال تھا مگر اب نہیں
تیرے در پہ آخری بار آکے پلٹ گیا
میری زندگی کا سوال تھا مگر اب نہیں“

بال سنوارنے کے بعد اس نے برش ڈائننگ ٹیبل پہ اُچھالا اور پرفیوم کی بوتل اٹھالی۔ خود پہ اسپرے کرتے ہوئے وہ آئینے میں اُبھرتے ہوئے اپنے شاندار سراپے کو سرسری نگاہ سے دیکھ رہا تھا، جب دروازہ کھول کر اُمید حسن اندر آیا۔ لائٹ گرے کھدر کا گرٹا شلوار پہنے وہ اتنا بیزار لگ رہا تھا کہ ولید حسن بے ساختہ مسکرا دیا۔

”آپ ریڈی ہیں پاپا.....؟“

”لیس مائی سن.....! اب چلیں.....؟“

ولید حسن نے پرفیوم کی بوتل واپس رکھتے ہوئے اپنا کوٹ اٹھالیا۔

”ماما جان کو ساتھ لے چلیں پاپا.....!“

اُمید حسن کے کہنے پہ کوٹ پہننے ولید حسن کے اعصاب ایک دم کشیدگی کا شکار ہو گئے۔

”آپ فاطمہ کو بلا لیں بیٹا.....! آپ کی ماما کو گھر پہ کام ہوتے ہیں۔“

اس نے کسی قدر نرمی سے ٹوکا تھا، مگر اُمید حسن کا ماننے کا ارادہ نہیں لگتا تھا۔

”کام ماما واپس آ کے کر لیں گی پاپا.....! وہ کہیں بھی نہیں جاتی ہیں ناں.....؟“

امید حسن نے کہا اور باہر بھاگ گیا۔ ولید حسن گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

”ماما جان.....! ماما جان.....!“

ایمان، فضلہ کے ساتھ کچن میں مصروف تھی، جب امید حسن نے ایک دم آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”چلیں ماما.....! پاپا کے ساتھ آؤ تنگ پر چلیں.....!“

”تو آپ جاؤ ناں بیٹا.....!“

وہ ایک دم شپٹا گئی تھی۔ فضلہ نے البتہ خوش گواریت میں گھر کر دونوں کو دیکھا۔

”آپ سے پپا نے کہا ہے ماما کو لانے کا؟“

فضلہ نے فی الفور پوچھا تو امید حسن نے سادگی و معصومیت سے سرکونفی میں ہلا دیا اور بولا۔

”نہیں.....! میں لینے آیا ہوں۔ چلئے ناں ماما.....!“

ایمان نے مضطرب سے انداز میں ایک دم اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”فضلہ.....! اسے کسی طرح منع کر دے پلیز.....!“

اس کے چہرے پر اذیت رقم ہونے لگی۔ اسے ولید حسن کی نگاہوں کی نفرت یاد آئی تو گویا تمام حوصلے

سمار ہونے لگے۔

”اسے اس معصوم خوشی سے محروم مت کرو ایسی.....!“

”چاہے خود کو ڈلتوں کی اتھاہ میں گرانا پڑے.....؟“

اس کا بھیگا بھیگا لہجہ آج دے اٹھا۔ فضلہ کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

”کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔“

فضلہ نے جیسے ڈھارس بندھائی تھی، مگر اس کے اندر غضب کی ٹوٹ پھوٹ مچی تھی۔

”مجھے نہیں لگتا میں کبھی پانے والوں سے ہوسکوں۔“

”ماپوسی کفر ہے ایسی.....! پلیز، چلی جاؤ ناں.....! پلیز.....!“

فضلہ نے اتنی نرمی، لبا جت سے کہا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہونے کو چلی گئی تھی۔ مگر جب

ولید حسن نے امید حسن کو تنہا آتے دیکھا تو ایک توہین آمیز سا احساس اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے

کرھلے گیا تھا۔

”میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ وہ نہیں جائیں گی۔“

امید حسن کے نزدیک آنے پر وہ کسی قدر تلخی سے بولا تھا۔ امید حسن نے اس تلخی کو اپنی نادانی کے

باعث محسوس نہیں کیا، البتہ اس کی غلط فہمی کو ضرور دُور کر دیا تھا۔

”مما تیار ہونے لگی ہیں پپا.....! ابھی آتی ہیں۔“

اور ولید حسن ہونٹ بھیچنے خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی تک آ گیا تھا۔

”کسی قسم کی خوش فہمی کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری اس عارضی رفاقت کو

ناگواریت کو جبر تنہا پہ میں اپنے بیٹے کی وجہ سے مجبور ہوا ہوں۔“

جس وقت وہ پیازی کمر کے سادہ مگر نفیس سوٹ میں آکر گاڑی میں بیٹھی، ولید حسن نے ونڈ اسکرین پر

اپنی نگاہوں کو مرکوز رکھے اسے جتنا ضروری خیال کیا تھا۔ ایمان کا چہرہ تمام تر ضبط کے باوجود پھیکا پڑ گیا۔

”پپا.....! آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں پپا اور ماما دونوں کے ساتھ ہوں ناں.....! جیسے فاطمہ

جیسے علی اور جیسے سرد اپنے پاپا ماما کے ساتھ آؤ تنگ پر جاتا ہے۔ ہم واپسی پر آؤں کریم بھی کھائیں گے ناں

پپا.....؟ ماما.....! آپ پیچھے کیوں بیٹھ گئیں ہیں.....؟ یہاں آگے آئیے ناں.....! اور مجھے اپنی گود میں بٹھا

لیں۔“

امید حسن نے چپک کر کہتے ہوئے ایک نئی فرمائش کر دی۔ اس کے معصوم چہرے پر ایسی طمانیت اور

آسودگی تھی کہ ولید حسن چاہنے کے باوجود اسے کسی بات پر ٹوک نہ پایا۔

”سردی بہت ہے سویت ہارٹ.....! آؤں کریم کھانے سے گلا خراب ہو جاتا ہے۔ ہم آپ کو ڈھیر

ساری چاکلیٹ دلائیں گے، ٹھیک ہے.....؟“

ولید حسن نے اس کی اہم فرمائش سے دھیان ہٹانے کی غرض سے بات پلٹ دی، مگر وہ بھی اسی کا بیٹا

تھا، جو اس کی اگلی بات پر ثابت ہو گیا۔

”فائن پپا.....! میں آؤں کریم نہیں کھاتا، مگر گاڑی تو روکیں ناں، تاکہ ماما یہاں آ کے بیٹھ سکیں۔“

ولید حسن دل ہی دل میں بل کھا کر رہ گیا، مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا تھا، اور گاڑی روک

دی۔

”چلیں ناں ماما.....! یہاں آئیں.....!“

امید حسن کی فرمائش پر ایمان نے ہونٹ بھیچ کر اسے دیکھا، پھر سرکونفی میں جنبش دے کر بولی تھی۔

”امید بیٹا.....! ماما یہاں ریلیکس ہیں، آپ خدمت کرو۔“

”مگر ماما.....! مجھے اچھا لگے گا، اگر آپ ہمارے ساتھ بیٹھو گی۔“

امید حسن نے ضد کی تھی، مگر ایمان کا اس کی اتنی ماننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، وہ تو اس لمحے کو بچھتا رہی

تھی جب امید حسن کے کہنے پر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”میں آپ کے ساتھ ہی ہوں، ڈونٹ وری.....!“

”لیکن وہاں نہیں، یہاں.....!“

امید حسن کے انداز میں ہٹ دھرمی تھی۔ ولید حسن جو تب سے دونوں کی جرح سن رہا تھا، سخت متنفرد

ہو گیا۔

”کون سی انا کا پرچم بلند کرنے کی کوشش میں ہلکان ہیں محترمہ.....! اتنی ہی ناک عزیز تھی تو ساتھ نہ

آئی ہوتیں.....؟ اگر بچے کی خاطر یہ قدم اٹھا ہی لیا ہے تو فضول کی ضد کیا معنی رکھتی ہے.....؟“

اس کے پٹیلے انداز پر بھڑک کر وہ قہر سامان تاثرات سمیت گہرے طنز سے پھنکارا تھا۔ اس درجہ توہین

پہ ایمان کا چہرہ جھلس کر بھاپ چھوڑنے لگا۔ آنکھیں یوں جل اٹھیں جیسے کسی نے مٹی بھر مچیں جھونک دی ہوں۔

”آپ کو اس طرح سے میری انسٹ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، سمجھے آپ.....؟“

بھیجے ہوئے لہجے میں وہ تنگ کر بولی تھی۔ ولید کے چہرے پر زہر سے بھی مسکان پھیل گئی۔
”میں جانتا ہوں آپ نے اس قسم کے کیا، کسی قسم کے بھی حقوق مجھے نہیں دیئے۔“

اس کے اندر کی کھولن بہت سرعت سے باہر آئی تھی اور اسی حساب سے ایمان کی اذیت میں اضافہ ہوا تھا۔

”اس کے باوجود آپ ہر قسم کے حق استعمال کرتے رہے.....؟ وائے.....؟“

وہ غم و غصے سے جیسے پاگل ہو گئی تھی۔

”میں کب کا لعنت بھیج چکا ہوں تم پر.....!“

کھولتے اعصاب پر قابو پا کر اب وہ بہت تضحیک آمیز انداز میں گویا ہوا تھا اور گویا ایمان کو سرتاپا سلگا

دیا۔

”تو پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے.....؟ کیوں اپنے ساتھ لٹکا رکھا ہے.....؟ اگر اتنی ہی نفرت ہے

مجھ سے تو.....؟“

وہ جیسے بس سے باہر ہونے لگی۔

”چھوڑ دوں.....؟ تاکہ تم اپنی مرضی سے گھڑے اڑا سکو.....؟ میں تمہاری اس مکروہ خواہش کو کبھی

پورا نہیں ہونے دوں گا۔“

ولید کا اشتعال عروج پر جا پہنچا۔ ایمان کو لگا تھا کسی نے ایک لخت اس کے وجود کو کسی تیز دھار آلے سے دو ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا وہ۔ چھ سال بعد بھی اس پر وہی الزام بدستور تھا۔

وہ مرکبوں نہیں جانتی.....؟ اس ذلت سے کیا موت بہتر نہیں تھی.....؟

اس نے شدید ذہنی ہیجان کے ساتھ سوچا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر مجنونانہ کیفیت میں سمت کا تعین مکے بغیر دوڑ پڑی۔ ولید حسن جو خود شدید طیش کی کیفیت میں تھا، اس کی اس حرکت پہ فوری طور پر اس لئے بھی متوجہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی ساری توجہ اُمید حسن کی طرف ہو گئی تھی جو انہیں جھگڑتے ہوئے دیکھ کر پہلے تو سہی ہوئی نظروں سے دونوں کو ٹکڑے دیکھتا رہا تھا، پھر ولید حسن کے بازو سے چٹ کر گھٹ گھٹ کر رونے لگا۔

ولید حسن اسے چپ کرانے میں مصروف ہو چکا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز پہ چونکا۔ گاڑی اس وقت سی سائیڈ کے نزدیک تھی اور ایمان کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ وہ اندھا دھند، دیوانہ وار سمندر کی طرف لپکی جا رہی تھی۔

”پاپا.....! ماما.....! ماما.....!“

اُمید حسن کے چیخنے کی آواز پہ اس کے ایک دم جامد ہو جانے والے اعصاب خفیف سے جھٹکے سے بیدار ہوئے۔ اُمید حسن کو چھوڑے وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ایمان کے ارادے کی خطرناکی کا احساس ہوتے ہی اس کے وجود میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔ اگلے ہی چند لمحوں میں اس نے ایمان کو جالیا تھا۔ اس کا بازو پکڑتے ہی ایک زنائے کا تھپڑ اس کے چہرے پر دے مارا۔

”اتنا شوق تھا خود کشی کا تو چھ سال کا عرصے تھا تمہارے پاس، یا پھر میرے ساتھ ہی یہ دشمنی بھی

نکالنی تھی.....؟“

اسے وحشت بھرے انداز میں اپنے ہاتھوں میں بھینچے وہ غرا غرا کر بولا تھا۔ تیز چلتی ہوا سے پھڑ پھڑاتے ایمان کے دوپٹے نے کچھ ہواؤں کی شوریدہ سری نے ولید کے الفاظ فضاؤں میں گم کر دیئے تھے، مگر ان کی بازگشت ایمان کی سماعتوں میں گویا ہمیشہ کے لئے ٹھہر گئی تھی۔

تضحیک اور اہانت کے احساس نے اس کے پھرے وجود کو کچھ اور بھی وحشت عطا کر ڈالی۔ وہ اس کے حصار میں ماہی بے آب کی طرح مچلی۔

”چھوڑ دیں مجھے..... مجھے زندہ نہیں رہنا۔“

وہ تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔

”واپس چلو.....! اپنے اس شوق کو گھر جا کے پورا کر لینا۔ ڈونٹ دری.....! بہت سے طریقے ایجاد

ہو چکے ہیں خود کشی کے۔“

وہ اس کا بازو پکڑے پھنکار کر بولا اور گھسینا ہوا اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایمان ایک دم گم سم ہو گئی

تھی۔

☆☆☆

”ہو نہ دُنیا میں کوئی ہم سا بھی پیاسا لوگو
جی میں آتی ہے پی جائیں یہ دریا لوگو
کتنی اس شہر کے سخیوں کی سنی تھی باتیں
ہم جو آئے تو کسی نے بھی نہ پوچھا لوگو
اتفاقا ہی سہی پر کوئی در تو کھلتا
جھللاتا یہیں چلن کوئی سایہ لوگو
سب کے سب مست اپنے اپنے نہاں خانوں میں
کوئی کچھ بات مسافر کی بھی سنتا لوگو
کسی دامن کسی آنچل کی ہوا تو ملتی
جب سرِ راہ یہ درماندہ گرا تھا لوگو
اک تصویر تھی کیا جانے کسی کی تصویر
نقشِ موبہوم سے اور رنگ اڑا سا لوگو
اک آواز تھی کیا جانے کس کی آواز
اس نے آواز کا رشتہ بھی نہ رکھا لوگو
پھر وہی دشت ہے دشت کی تنہائی ہے
وحشت دل نے کہیں کا بھی نہ رکھا لوگو
اس میں ہمت ہے تو آئے اٹھا دے یہ حصار

اپنے گنبد میں تو در ہے نہ دریچہ لوگو
جی کی جی میں ہی رہیں حسرتیں طوفانوں کی سی
یہ سفینہ تو کنارے پہ ہی ڈوبا لوگو
بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں پیاریں پاؤں
نیند سی نیند ہے اب ہمیں نہ اٹھانا لوگو
آج کی ڈاک سے کیا کوئی لفافہ آیا
کسی سرگوشیاں کرتے ہوا دے گیا لوگو
کوئی پیغام زبانی بھی نہیں کچھ بھی نہیں
ہم نے اپنے کو بہت دیر سنبھالا لوگو
ایک ہی شب ہے طویل اتنی طویل اتنی طویل
اپنے ایام میں امروز نہ فردا لوگو
اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جاتا لوگو
راہ نکلتے ہوئے پتھرا سی گئی تھیں آنکھیں
آہ بھرتے ہوئے چھلنی ہوا سینہ لوگو
ہونٹ جلتے تھے جو لیتا تھا کبھی آپ کا نام
اس طرح کسی اور کو نہ ستانا لوگو

وہ خاموش ہوئی تو اسما (اشعر کی بیوی) نے سب سے زیادہ فراخ دلی سے اسے داد دی تھی۔ جبکہ
چائے کی طلب میں اٹھ کر اس سمت آنے والے ولید حسن کے چہرے پر کاٹ دار تسخیر پھیل گیا تھا۔
ماضی کی یاد کو دہراتے ہوئے اشعر نے اپنے ویسے کی رات سخن کی اس محفل کو سجایا تھا اور سب سے
خاص دعوت ولید حسن کو دی تھی، جسے اس نے بڑی رکھائی کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔ لہجہ و انداز ایسا ہرگز نہیں تھا کہ
اشعر اصرار کا حوصلہ کرتا، جیسی مایوس لوٹ گیا۔

”ابن انشاء نے جتنا کمال لکھا بھابی.....! آپ کے لہجے نے اسی قدر سجایا ہے اس کلام کو۔ رینیلی.....!
بہت دل خوش ہوا۔ ویسے اتنی مایوسی کی باتیں آپ کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ وہ بھی اس صورت کہ ولید بھائی
دیار غیر سے تشریف لا چکے ہیں.....؟“

اسما کی کھٹک دار ہنسی میں اس کے درد سے بے خبری کا عنصر نمایاں تھا، مگر وہاں موجود چہرے پر جو
خاموشی اور اذیت تھی، وہ ایمان کی آنکھوں میں سے درد کو پہچان جانے کی عکاسی تھی۔

اس روز ولید حسن کے ساتھ جب وہ واپس آئی تھی تو اپنے حواسوں میں نہیں تھی، ایک سکتے کی کیفیت
تھی، جس نے سب کو ہراساں کر دیا تھا۔

”کیا ہوا ہے ایمان کو.....؟ تم بولتے کیوں نہیں ہو کچھ.....؟“

تائی ماں نے ولید حسن کو جھنجھوڑ ڈالا تھا، جس سے اس کی آنکھوں سے نکلتی آگ کی لپینوں میں اضافہ
ہو گیا تھا۔

”مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں.....؟ یہ بیٹھی ہے ناں آپ کے سامنے، ویسے بھی مجھ سے زیادہ آپ کو
اس کا یقین ہے ناں.....؟“

کسی قدر تنگی سے کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ سب کے پوچھ پوچھ ہارنے پر بھی ایمان کے منہ
سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔ بس اُمید حسن سے ہی اتنی بات کا پتا چل سکا تھا کہ ماما پاپا کی لڑائی ہوئی ہے۔

”دادو.....! پاپا اور ماما کی لڑائی کیوں ہوئی ہے.....؟“

اُمید حسن کے سوال پر تائی ماں نے سرد آہ بھری تھی۔

”پتا نہیں پتر.....! کس کی نظر کھا گئی میرے بچوں کو.....؟“

انہوں نے اسے گلے لگا کر رقت آمیز آواز میں کہا اور اپنے آنسو پونچھتی اٹھ گئیں۔

کتنی بار وحشت کی انتہا پہ پہنچ کر اس نے سوچا تھا۔

وہ مر جائے، کسی بھی طریقے سے، بچکے سے لٹک کر، خود کو آگ لگا لے یا پھر تیز دھار آلے سے اپنی

کلائی کی شہ رگ کاٹ ڈالے۔ ایک کبھی نہ ختم ہونے والے پچھتاوے میں مبتلا کر جائے ولید حسن کو۔

مگر ہر بار..... ہر بار حرام موت پہ خدا کا خوف اس کی راہ میں بلند و بالا دیواریں کھڑی کر گیا تھا۔ وہ
خود کشی تو نہیں کر سکتی تھی مگر پھر بھی جیسے مر گئی تھی۔ شادی کی ہر تقریب میں اپنا ہر فرض، ہر حق ادا کرنے کے
باوجود جیسے زندگی کا احساس اس کے اندر سے ڈھونڈے سے بھی نہ ملا تھا اور تائی ماں کو تو اس کے مشینی انداز پہ
ہول اُٹھنے لگے تھے۔

بار بار انہوں نے ولید کو حقیقت بتلانا چاہی، مگر ہر بار وہ اس کی بات سننے بغیر اٹھ کر وہاں سے چلا
گیا۔ سب اسے اس کے حال پر چھوڑ چکے تھے، مگر تائی ماں اور ماما کے دل کسی طور بھی مطمئن نہیں تھے، مگر وہ کچھ
بھی کرنے سے قاصر رہی تھیں۔

☆☆☆

”ہاں سنو دوستو

جو بھی دُنیا کہے

اس کو پرکھے بنا مان لینا نہیں

ساری دُنیا یہ کہتی ہے

پر بت پہ چڑھنے کی نسبت

اُترنا بہت سہل ہے

کسی طرح مان لیں

تم نے دیکھا نہیں

سرفرازی کی دُھن میں کوئی آدمی

جب بلندی کے رستے پہ چلتا ہے تو
سانس تک ٹھیک کرنے کوڑکتا نہیں
اور اس شخص کا

عمر کی میڑھیاں اُترتے ہوئے
پاؤں اٹھتا نہیں

اس لئے دوستو جو بھی دنیا کہے
اس کو پرکھے بنامان لینا نہیں

ہم کھلی آنکھ سے جو بھی کچھ دیکھتے ہیں
اکثر وہ ہوتا نہیں

راستے کے لئے آدمی اپنے خوابوں کو بھی
کاٹ دیتے ہیں لیکن

سلگتا ہوا راستہ پھر بھی کتنا نہیں
اس لئے دوستو

جو بھی دنیا کہے
اس کو پرکھے بنامان لینا نہیں

ولید حسن کے چہرے کی رنگت متغیر تھی۔ پیشانی پہ عرقِ ندامت جھللائی تھی۔ اس کی ساکن آنکھیں،
اس کھلے ہوئے خط سے لپٹی تھیں جو کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی تھا، مگر اس کی نگاہوں کے سامنے تے پردے کھینچ لے گیا
تھا۔ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ ذرا سی سوجھ بوجھ، ذرا سی سمجھ داری سے کام لیا تو گتھی سے گتھیاں
سلجھتی چلی گئی تھیں۔

وہ جو سب کچھ اسے بتانا چاہا گیا تھا، مگر وہ سننے سے انکاری ہو گیا تھا۔ کتنا شدت پسند تھا وہ، کتنا
بدگمان اور فیصلہ میں جلدی برتنے والا۔ شرمندگی کا کوئی انت تھا نہ ہی بچھتاؤے کا۔ اس کا جی چاہا، اس شرمندگی
کے ہمراہ کہیں جا چھپے۔

کیسے سامنا کرے گا وہ سب کا.....؟ اور خاص طور پر ایمان کا.....؟ وہ جو اس کی اولین چاہت تھی،
سب سے شدید خواہش، جس کے قرب کی چاہ میں وہ کچھ بھی کر گزرنے پر آمادہ تھا، مگر جب وہ ملی تھی تو اپنی اسی
انتہاء پسندی کے باعث کیسے توڑ پھوڑ ڈالا تھا اسے۔

بچھتاؤے کا احساس اس کے اعصاب پر مضرب بن کر برسے لگا۔ اس نے ہونٹ بھیج کر سر جھکایا تو
نگاہ ایک بار پھر اس کاغذ کے پڑے سے اُلجھ گئی جسے آج کی ڈاک سے اس کے نام بھیجا گیا تھا۔

”صاحب.....! یہ آپ کا لیٹر ہے۔“

وہ صبح لیٹ اٹھا تھا، اس حساب سے ناشتہ کیا اور کمرے میں آکر کہیں جانے کو تیار ہو رہا تھا، جب واچ
میں یہ لفافہ اس کا دروازہ ناک کر کے اسے دے کر گیا تھا۔ اس نے کچھ تجسس، کچھ تحیر کے ساتھ لفافہ الٹ پلٹ

کر بیچنے والے کا نام دیکھنا چاہا، مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سفید منہ بند لفافے پہ سیاہ موٹے مارکر سے اس کا
نام درج تھا جو اس کی آنکھوں کو بڑھا گیا۔ اسی آنکھوں کو رفع کرنے کی غرض سے اس نے اسی وقت لفافہ چاک کر
لیا۔

”السلام علیکم ولید بھائی.....!“

گو کہ میں خود کو اس قابل ہرگز نہیں پاتا کہ آپ سے یہ معتبر رشتہ استوار کر سکوں مگر.....
خیر.....! میں موسیٰ کا دوانی ہوں۔ پتا نہیں آپ کی یادداشت کے کسی کونے میں میرا نام
محفوظ بھی ہے کہ نہیں.....؟ مگر یہ بھی سچ ہے کہ انسان ایسے دوانوں کو کبھی نہیں بھولتا،
ایک وہ جس سے اس نے شدید محبت کی ہو اور دوسرا وہ جس سے اتنی ہی شدید نفرت۔
میرا شمار دوسری کیٹگری میں ہوتا ہے، جیسی بہت شرمندگی کے ساتھ مخاطب ہوں۔ پتا نہیں
وہ کیسے لوگ ہیں جو ظلم در ظلم کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں.....؟

میں نے بھی ایک جرم کیا تھا، جسے کبھی جرم سمجھا ہی نہیں تھا یا شاید محبت میں انتہاء پسندی
انسان کو جنون خیز بنا دیتی ہے۔ مجھے بھی اپنے لالہ (اپنے بھائی) سے بہت محبت تھی۔ وہ
لالہ جنہیں میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اُداس اور زندگی کے سب حسین رنگوں
سے ہمیشہ دُور پایا تھا۔ مگر جب وہ ایمان سے ملے تو مجھے لگا وہ پھر سے زندگی کی طرف
لوٹ آئے ہیں۔ لالہ سمیت میں اور ماما بھی خوش تھے۔

مگر ہماری یہ خوشی اس وقت بری طرح غارت ہو گئی، جب آپ لوگوں کی طرف سے
صاف ایمان کے رشتے سے انکار کر دیا گیا۔ لالہ نے جیسے بھی ضبط کیا، مگر میں بھڑک اٹھا
تھا۔ شاید وہ عمری ایسی ہوتی ہے، جوانی کا نیا نیا اُبال دُنیا کی تسخیر کو بہت آسان بنا کر
دکھاتا ہے۔ لالہ کی آنکھوں کی پھر سے بھی روشنیوں نے میرے اندر انتقام کو ہوا دی تھی،
مگر کیسے.....؟

اس بات پر غور کرتے مجھے بہت دن لگے تھے۔ مگر جب ایمان کو اپنی ہی جامعہ میں
دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں دیکھا تو مجھے یہ کام آسان ہوتا محسوس ہوا تھا۔ پہلے پہل میں
نے محض انہیں دھمکایا، مگر جب میں نے ان کی آنکھوں میں اپنا خوف اُترتا ہوا محسوس کیا
تو گویا نہ صرف میری جرأت بڑھی، بلکہ مجھے اور بھی شمل گئی۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعی دُشواری نہیں ہوئی تھی کہ ایمان کی سب سے بڑی کمزوری
آپ ہیں۔ میں گو کہ آپ کے نکاح کی بابت جان گیا تھا، اس کے باوجود شکست تسلیم
کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے ایمان کی کمزوری کو پایا اور اس کی دُکھتی رگ کو بے دردی
سے جکڑ لیا۔ تھوڑی سی معلومات سے میرے لئے یہ جاننا قطعی دُشواری نہیں تھا کہ آپ ملک
سے باہر ہیں اور کس ملک میں ہیں.....؟

مگر میں نے ایمان پہ نفسیاتی دباؤ ڈالا اور انہیں کہا، میں آپ کے ٹھکانے سے آگاہ ہوں

اور اتنی سوس رکھتا ہوں کہ یہاں بیٹھے بیٹھے ولید حسن کو وہاں شوٹ کروا سکتا ہوں۔ میری توقع کے عین مطابق ایمان میرے لئے وہ کٹھ پتلی ثابت ہوئیں جس کی ڈوری میرے ہاتھ میں تھی۔ مجھے پتا بھی نہ چلا اور میں شیطانی فعل میں ملوث ہوتا چلا گیا۔

آپ کو پتا ہے، شیطان کے نزدیک سب سے پسندیدہ انسانی عمل کون سا ہے.....؟
دو میاں بیوی کے درمیان رخنے اور جدائی ڈالنے کا عمل.....!

اور میں یہی عمل کرتا چلا گیا۔ اس میں ایمان کا قصور کہیں بھی نہیں نکلتا ولی بھائی.....! وہ آپ کی محبت میں بے بس تھیں۔ آپ کو کھونے کے نقصان سے بچنے کی خاطر ہی انہوں نے خاردار راستوں کا انتخاب کر لیا۔ اسے لالہ کی قسمت کہہ لیں کہ ایمان کی طرف سے بھرپور کوشش کے باوجود آپ نے انہیں طلاق نہیں دی۔

پھر جس روز آپ ایمان کو زخمت کروا کے گھر لے کر گئے، مجھے لگا تھا، اپنی پسند کی بساط پہ میں بری طرح سے ہارا ہوں۔ اپنی اس ہار کا انتقام میں نے ایمان کو ٹینس کر کے لینا شروع کر دیا۔ مجھے نہیں پتا، آپ تک وہ بات کس طرح اور کس انداز میں پہنچی کہ آپ ایمان سے متفر ہو کر انہیں چھوڑ کر چلے گئے.....؟ مگر جب مجھے پتا چلا تو مجھے لگا تھا جیسے میں نے اپنے لالہ کی زندگی سے چھین جانے والی خوشی کا انتقام پورا کر لیا۔

یہ محض میرا خیال تھا، آپ انجان تھے اور ایمان صبر کرنے والوں میں شامل تھی۔ مگر میرا رب تو وہ محتسب ہے جو نہ صرف سارے حساب رکھتا ہے بلکہ زمین پر اکڑ کر چلنے والوں کو منہ کے بل گرانے پہ بھی قادر۔

میری فتح کا شمار ابھی اُتر نہیں تھا کہ ایک ایکسڈنٹ نے میرا غرور ہی نہیں، مجھ سے میری دونوں ٹانگیں بھی چھین لیں۔ وہ بات جو میں شاید کبھی نہ سمجھ سکتا، خدا نے لحوں میں ہی سمجھا دی، جتنا ڈالی، اور میں نے اشک ندامت بہا کر اپنی خطا کی معافی مانگی، تب مجھ پہ کھلا، خدا بھی اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک وہ انسان نہ معاف کرے جس سے ہم زیادتی کے مرتکب ہو چکے ہوں۔

میرے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں لالہ پہ ساری بات واضح کرتا اور یوں ایمان سے معافی مانگنے کی سبیل ہوتی، مگر اس مشکل گھڑی میں ایک بار پھر وہی رب میرے کام آیا جو ندامت محسوس کرنے والے اپنے بندے کو بلا توقف قبول کرتا ہے۔

آپ کے برادر کے ذریعہ لالہ تک یہ بات پہنچی اور میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کر کے ایمان سے روبرو معافی مانگنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ مگر جب انہوں نے اتنی اعلیٰ ظرفی سے مجھے معاف کیا تو ان کے ظرف کے سامنے مجھے اپنا آپ بہت حقیر سا لگا تھا۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کے بعد مجھے سکون میسر آ جاتا، مگر ایسا نہیں ہوا تھا، تو وجہ ڈھکی چھپی تو نہ تھی۔ زمین میں فساد پھیلانا جتنا سہل، اس بربادی کے آثار منا کر پھر سے ویسی

خوش حالی کو قائم کرنا اتنا ہی مشکل ہوا کرتا ہے۔

میں نے چھ سال سولی پر گزارے ہیں ولی بھائی.....! مجھے اس بات پر اللہ کو منانے میں چھ سال لگ گئے، تب مجھے آپ کی یہاں آمد کی اطلاع ملی۔

آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ مجھے معاف کر دیں.....! اس لئے نہیں کہ میں پُر سکون ہونا چاہتا ہوں، اس لئے کہ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اور ہاں.....! ایمان کی طرف سے ہر بدگمانی کو جھٹک دیں کہ آپ کا شمار ان خوش بختوں میں ہوتا ہے، جنہیں اچھی اور نیکو کار، فرمانبردار عورت آسانی تھنے کی طرح ملی ہے۔

آپ کا گنہگار و شرمسار
موسیٰ کا دوانی.....!

اب کیا کرنا ہے.....؟ کیسے ایمان کو منانا ہے کہ زیادتیوں کی ایک طویل فہرست تھی، الزامات کی ایک بوچھاڑ تھی.....؟

اور ابھی یہ تازہ زخم جو ابھی رستا تھا، کیسے ایک دم گئی تھی وہ
اس کا دل اس کی کیفیت کو یاد کر کے رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔

☆☆☆

وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا تو ہال کمرے میں ہی وہ سب جمع تھے۔ اشعر، اسماء، عاقب، فضہ، تینوں بچے بھی وہیں تھے۔ البتہ وہ نظر نہیں آئی، جس کی تلاش میں وہ آیا تھا۔ جیسی دوسرے ہی لمحے قدموں کو موڑ لیا، مگر اشعر کی آواز پہ تھمنا پڑا تھا۔

”کہاں جا رہے ہیں.....؟ رُکیں ناں.....! ہمیں جوائن کریں کہ

رات بھی خوب ہے، پاس محبوب ہے.....!“

وہ شوخی سے گنگنا نے لگا۔ ولید حسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا اسے شائبہ ہی ہوا تھا۔

”بے شک.....! مگر ان کا تو نہیں ہے ناں جن کو آپ دعوت دے رہے ہیں.....؟“

اسما نے اس کی شوخی و شرارت کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا۔

”نہیں ہے تو کیا ہوا.....؟ ان کا محبوب بلکہ محبوبہ بھی ابھی تشریف لائیں گی، کچے دھاگوں سے بندھی۔“
اشعر نے ہنوز اسی شوخی سے کہا، مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہی جب ولید حسن آکر ان کے بیچ بیٹھ گیا۔

”کچھ سنائیں گے.....؟“

اشعر اس کی سمت جھکا، جس پر اس نے کاندھے اُچکا کر گویا آمادگی ظاہر کر دی۔ دل خوش تھا تو خوشی کو ظاہر کرنے میں کیا حرج تھا بھلا.....؟ مگر اب کے اشعر کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”بدلے بدلے سے میرے سرکار نظر آتے ہیں

دل کی بربادی کے آثار نظر آتے ہیں“

اشعر کی گنگناہٹ پر ولید حسن نے بے نیازی کا تاثر دیا تھا۔ عاقب کی نگاہوں میں بھی خوش گوار حسرت کا عکس تھا۔ مگر کچھ کہنے سے احتراز برتا کہ بہر حال وہ اس کے مزاج کے موسموں سے آشنا نہیں رہا تھا۔
”چلیں.....! آغاز آپ ہی کریں۔“

اشعر نے مونگ پھلی کا لفافہ بیچ میں رکھتے ہوئے اسے دعوت دی۔ ولید کی نگاہیں دروازے پہ بھٹک رہی تھیں۔ ایمان کو چائے کی ٹرائی گھسیٹے دیکھا تو گلا کھٹکار کر سیدھا ہوا۔

”اُداس لوگوں کی بستیوں میں

وہ تلیوں کو تلاش کرتی

وہ ایک لڑکی

جس کی صاف رنگت خیالی آنکھیں

جو کرتی ربتیں ہزار باتیں

مزاج سادہ وہ دل کی بچی

وہ ایک لڑکی!“

ایمان اسے وہاں دیکھ کر ہنسی تھی، وہ نہ صرف موجود تھا، بلکہ اپنا انتخاب بھی پیش کر رہا تھا۔ ناقابل یقین منظر تو تھا، مگر اب وہ اس کے حوالے سے ہر احساس سے بے نیاز ہو جانا چاہتی تھی، جسبی ٹرائی درمیان میں لا کر چھوڑ دی۔ چائے اس لئے نہیں بنائی کہ اسے دینا بھی پڑتی اور وہ اب کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”وہ محبتوں کے نصاب جانے

وہ جانتی ہے عہد نبھانے

وہ اچھی دوست

وہ اچھی ساتھی

وہ ایک لڑکی

وہ جھوٹے لوگوں کو سچا سمجھ

وہ ساری دنیا کو اچھا سمجھ

وہ کتنی سادہ

وہ کتنی پگلی

وہ ایک لڑکی!“

ایمان خاموشی سے جا کر امید حسن کے پاس بیٹھ گئی جسے اب نیند آنا شروع ہو چکی تھی۔ ایمان نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ لیا اور آہستگی دُری سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ ولید کی بے تاب مچلتی نگاہیں اس کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں جسے اس کے سوا باقی سب نے نوٹ کیا اور حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی کے احساس میں گھرنے لگے۔

”بھابی.....! آپ کچھ سنائیے ناں.....! مجھے آپ کا دھیمہ اور نرم لہجہ بہت اچھا لگتا ہے۔ پلیز.....!“

اسا کی فرمائش پہ وہ پہلے چونکی، پھر گڑبڑا گئی۔

”مم..... میں.....؟ یہ..... امید حسن کو نیند آرہی ہے، میں تو اسے سلانے کے لئے بیڈ روم میں جا رہی ہوں، پھر کبھی سہی.....!“

اس نے گویا جان چھڑانا چاہی تھی، مگر..... مگر اسما کے ساتھ ساتھ اشعر اور فضلہ کا اصرار بھی بڑھا تو اسے الجھن ہونے لگی۔

”مجھے اس وقت کچھ بھی ڈھنگ کا یاد نہیں آرہا ہے۔“

اس نے ایک اور بہانہ بنانا چاہا۔ ولید حسن کی موجودگی میں وہ ہرگز کچھ سنانے پہ آمادہ نہیں تھی۔

”جو بھی سنائیں گی، جیسا بھی ہوگا، ہمیں دل و جان سے قبول ہوگا، سو پلیز.....!“

اسما کے اس قدر اصرار پر مزید انکار اس سے دو بھر ہو گیا۔

”کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ، کچھ نہ کہو خاموش رہو

اے لوگو! خاموش رہو، ہاں اے لوگو! خاموش رہو

سچ اچھا پر اس کے جلو میں زہر کا ہے اک پیالہ بھی

پاگل ہو، کیوں ناحق کو سقراط بنوں، خاموش رہو“

ولید حسن کے چہرے پر متمناہٹ اُتر گئی اور اسے لگا وہ اس سے تمام تر بے نیازی برتنے کے باوجود بھی گویا در پردہ اسی پر طنز کر رہی ہے۔

”حق اچھا پر اس کے لئے کوئی اور مرے تو اور اچھا

تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی پہ چڑھ

ان کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے

سر آنکھوں پر سورج ہی کو گھومنے دو خاموش رہو

مجلس میں کچھ جس ہے اور زنجیر کا آہن چھتا ہے

پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں من میں کیا کیا موسم ہیں

اس بگیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو خاموش رہو

آنکھیں موندھ کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ

انشاء جی لو دھاگہ لو لب سی لو خاموش رہو“

”دیری دیری ویل ڈن.....! اینڈ بنڈل آف ٹھینکس.....! سو سویت.....! بھابی جی.....! ریلی.....!“

آپ نے تو مجھے انشاء جی کا عاشق بنا دیا ہے۔ آپ کے پاس ان کی کوئی بک ہے تو مجھے ضرور دیجئے گا۔“

اسا اتنی خوش ہوئی تھی کہ فرط جذبات میں آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑا دوا لہانہ قسم کا بوسہ ثبت کیا۔ جہاں ایمان جھپٹی تھی، وہاں اشعر بدک گیا تھا۔

”انف..... انف بیگم صاحبہ.....! کنٹرول یور سیلف.....! کہ آپ کی ان چھٹیوں و دچمیوں یہ میں

ہی نہیں، ولی بھائی بھی ماسٹڈ کر سکتے ہیں کہ آپ ہمارے حقوق کو پامال کر رہی ہیں۔“
اسماء زور سے ہنس پڑی۔ بڑی شوخ کھٹکتی ہنسی تھی، فضا اور عاقب بھائی بھی مسکرا رہے تھے۔ ولید حسن کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکان اُتری تھی۔ ایمان کا چہرہ نہ جانے کس جذبے کے تحت بے تحاشہ سرخ پڑ گیا۔

”ارے رے.....! آپ کدھر بھاگ رہی ہیں.....؟“
ایمان کو سوتے ہوئے اُمید حسن کو اپنی گود میں اٹھا کر کھڑے ہوئے دیکھ کر اشعر بری طرح بدحواس ہوا۔

”اُمید کو سلانا ہے اشعر.....! نیند خراب ہو رہی ہے اس کی۔“
خود کو سنبھال کر وہ کسی قدر رسائیت سے بولی تو اشعر نے ہاتھ بڑھا کر اُمید حسن کو اس سے لے لیا۔
”میں سمجھ گیا، آپ سے اٹھایا نہیں جا رہا ناں.....! یہ لیں، اب بیٹھیں آرام سے، خبردار جو کسی نے بھی اٹھنے کا نام لیا۔“

ایمان جزبزی ہو گئی کہ بہر حال گفتار میں وہ اس سے نہیں جیت سکتی تھی۔
”ولی بھائی.....! آپ کی آواز اب بھی اچھی ہے، گانے میں.....؟“
اشعر کے سوال پر ولید جو ایمان کے بے زاری پکاتے چہرے کو کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا، چونک سا پڑا۔

”یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔“
اس نے سنبھل کر جواب دیا تو اشعر نے اسے گھورا تھا، پھر مزے سے بولا۔
”چلیں پھر کوئی گانا سنائیں.....! تاکہ ہمیں پتا چلے، آپ کی آواز کو زنگ تو نہیں لگ گیا.....؟“
ایمان کو ہرگز یقین نہیں تھا کہ اب وہ اس کی بات رکھے گا، مگر اس وقت اسے دھچکا لگا جب ولید گلا کھنکارتا گانے کی پوزیشن میں آیا۔

”تاکتے رہتے تھے کو سانج سویرے
نیوں میں بسیاں جیسے نین یہ تیرے
تیرے مست مست دو نین
میرے دل کا لے گئے چین
تیرے مست مست دو نین
میرے دل کا لے گئے چین“

اس کی آواز نے ایک دلکش سماں باندھ دیا۔ اسماء اور اشعر تو باقاعدہ جھوم رے تھے، جبکہ ایمان کا اضطراب یہ جان یک بارگی بڑھ گیا تھا کہ ولید حسن کی نگاہوں کا مرکز اسی کا چہرہ ہے۔

”ماہی بے آب سا دل ہے بے تاب سا
ترپا جائے ترپا، ترپا جائے

ماہی بے آب سا دل بے تاب سا
ترپا جائے ترپا، ترپا جائے
نیوں کی جھیل میں اُترا تھا یوں ہی دل
ڈوبا جائے ڈوبا، ڈوبا جائے
ہوش و حواس اب تو کھونے لگے ہیں
ہم بھی دیوانے تیرے ہونے لگے ہیں
تیرے مست مست دو نین
میرے دل کا لے گئے چین
تیرے مست مست دو نین
میرے دل کا لے گئے چین“

اس کے لہجے اور آواز کے ساتھ اس کی نظریں بھی بہکنے لگیں۔ پیغام دیتیں، شوخ افسانے سناتی ہوئیں
نگاہیں، یہ اس کی نگاہ کا فریب ہی ہو سکتا تھا ناں.....! ای اسے کیا ہو رہا تھا.....؟ دل برباد اسے کیسے سہانے
سننے جاگتی آنکھوں سے دکھانے لگا تھا.....؟

وہ اتنا گھبرائی کہ اشعر کی گود میں سوئے اُمید حسن کو اٹھا کر تیز قدموں سے وہاں سے باہر نکل آئی۔
اپنے کمرے میں جانے کی غرض سے سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ اسے لگا پیچھے سے کسی نے پکارا ہے۔ اس
نے گردن موڑی تو ولید حسن ہی تھا، اس کے سمت دیکھتا ہوا۔

ایمان چاہنے کے باوجود ایک قدم آگے نہ بڑھا سکی کہ کچھ لہجے، کچھ آوازیں اپنے اندر طلسماتی کشش
رکھتی ہیں، جکڑ لیتی ہیں، بے بس کرنا جانتی ہیں۔

”اُمید حسن کو میں اپنے ساتھ سلا لوں، اگر تمہیں برا نہ لگے تو.....؟“
اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ اور تذبذب تھا۔ ایمان نے کچھ کہے بغیر وہیں کھڑے کھڑے اُمید کو
ہاتھوں میں اٹھا کر آگے کر دیا۔ ولید مضبوط قدم اٹھاتا ہوا بڑھا تھا اور اس سے اُمید حسن کو لے لیا تھا۔ ایمان پلٹی
اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلی گئی۔ ولید حسن گہرا سانس کھینچ کر رہ گیا کہ آیا تو اس سے بات کرنے تھا، مگر
جب منہ سے بات نکلی تو کچھ اور ہی نکلی۔

”پتا نہیں میں اسے کیسے منا پاؤں گا.....؟“
اس کے اپنے کمرے کی سمت اٹھتے ہوئے قدموں سے یاسیت لپٹی تھی۔

☆☆☆

”تم میرے پاس رہو
میرے قاتل میرے دلدار میرے پاس رہو
جس گھڑی سیاہ رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیاہ رات چلے

بین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی گاتی نکلے
درد کی کاسنی پازیب بجاتی نکلے
پھر نا آسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی ماتمی سنسان سیاہ رات چلے
تم میرے پاس رہو

میرے قاتل میرے دلدار میرے پاس رہو

اپنے کمرے سے وہ شور کی کچھ مبہم سی آواز سن کر باہر آیا تو فضا اور اسما ہر اسماں کی گھڑی تھیں، جبکہ
تائی ماں روتے بلکتے اُمید حسن کو بہلاتے ہوئے صاف مضطرب نظر آئی تھیں۔
”کیا ہوا.....؟ خیریت.....؟“

وہ آہستگی سے آگے بڑھ آیا اور سوالیہ نگاہیں تینوں خواتین پر نکالیں۔ تائی ماں نے دیکھا اور برہم سے
انداز میں منہ پھیر لیا۔ وہ کچھ کھسیا تو تھا، مگر اس سوال کے ہمراہ فضا کو دیکھا۔ ہر اس جس کی آنکھوں سے ہی
نہیں، چہرے پر بھی گویا شبست ہو گیا تھا۔ آنکھیں یوں نم تھیں گویا ابھی رو کے فارغ ہوئی ہو۔
”کچھ نہیں بھائی.....! ایمان کو چوٹ لگ گئی ہے، ہاسپٹل لے کر گئے ہیں عاقب اور تاؤ جی۔“
”واٹ.....؟“

وہ کس قدر وحشت سے بولا۔

”کب.....؟ کیسے.....؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے.....! اُسید گرنے لگا تھا سیڑھیوں سے، اسے بچانے کی کوشش میں خود سب سے
اوپر کی سیڑھی سے نیچے آگری، بے ہوش ہو گئی تھی۔ دیکھیں کتنا خون بہا ہے اس کا۔“
بادامی کارپٹ پر سرخ دھبے کی سمت اشارہ کر کے تفصیل بتاتے ہوئے فضا کی آنکھیں پھر لبالب
پانیوں سے بھر گئیں، جبکہ ولید کے اندر اسی سرعت سے وحشت اور غیض اُترا تھا۔
”اتنا کچھ ہو گیا اور آپ میں سے کسی نے مجھے بتانا بھی گوارہ نہیں کیا.....؟ گھر میں ہی تھا ناں
میں.....؟“

وہ ضبط کھو کر چیخ پڑا تھا۔ اس کا یہ اشتعال تائی ماں کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا، جیسا روتے ہوئے اُمید
حسن کو کاندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے ہاتھ نچا کر طنز کے انداز میں بولی تھیں۔
”تجھے کیوں بتاتے بھی.....؟ وہ لگتی ہی کیا ہے تیری.....؟ نام بھی سننا تجھے تو گوارہ نہیں ہے اس کا،
پھر تجھ سے اس کی مرہم پٹی کی توقع کیوں رکھتے ہم.....؟ بتاؤ.....؟“
ان کی ناراضگی اور خفگی کا پیمانہ عروج پر تھا۔ ولید حسن کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ مگر پھر خود کو سنبھال کر
فضا سے مخاطب ہو کر بولا تو لہجہ ہنوز مضطرب اور متوحش سا تھا۔

”کون سے ہاسپٹل لے کر گئے ہیں.....؟ مجھے نام بتائیں.....!“
”مجھے تو کچھ پتا نہیں ہے ولی بھائی.....! پلیز آپ عاقب کو فون کر کے پوچھ لیں۔“
فضا کے جواب پہ وہ اپنی جیبیں ٹٹول کر سیل فون برآمد کرنے کے بعد عاقب کا نمبر ملائے لگا۔ حالانکہ
یہ سامنے کی بات تھی، مگر اس کے حواس ہی کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ عاقب کا نمبر ملا کر ہار گیا، مگر عاقب کال
ریسیو نہیں کر رہا تھا، جس سے اس کا اضطراب وحشت کا روپ دھارنے لگا۔
اور جب وہ پورے ایک گھنٹے تک ٹٹل ٹٹل کر اور عاقب کا نمبر ملا کر تھک گیا، تب عاقب کی گاڑی
گیٹ سے اندر آتی نظر آئی تھی۔ وہ سب سے پہلے لپک کر تقریباً دوڑتے قدموں سے پورا ٹیکو میں آیا تھا۔
”کہاں تھے تم.....؟ بندہ کم از کم کال تو ریسیو کرتا ہے.....؟ پیچھے رہ جانے والے بھلے دوسو سو کا شکار
ہو کر ہارٹ فیل کرا بیٹھیں۔“

بچھلی سیٹ پر ماما اور پاپا کے درمیان ماتھے پر پٹی باندھے مذہال سی بیٹھی ایمان کو صحیح سالم دیکھ لینے
کے باوجود وہ بے دریغ عاقب پر برس پڑا تھا۔ عاقب کے ساتھ ساتھ باقی کے حاضرین نے بھی اس کی پریشانی
اور کھسیاہٹ اور خفگی کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔
”سوری یار.....! تمہیں زحمت ہوئی۔ اکیچو کی میرا سیل فون سائیلنٹ پر تھا، جیسی تمہاری کال کا اندازہ
ہی نہیں ہو سکا۔“

عاقب اپنی حیرت چھپا کر رسانیت سے وضاحت پیش کر رہا تھا۔

”مگر پتر.....! آپ یہ زحمت کر کس سلسلے میں رہے تھے بھلا.....؟ بتائیں گے.....؟“

تاؤ جی کا لہجہ بھی کسی قدر ٹھنڈا ٹھنڈا طنز سموئے ہوئے تھا۔ ولید حسن نے کھسیا کر انہیں دیکھا تو نگاہ
ان کے کاندھے کے پار ماما کے سہارے حیران، بھونچکی سی اپنی طرف کھتی ایمان سے جا ملی، جس نے نظریں چار
ہوتے ہی بغیر کسی تاثر کے نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا تھا۔
ولید کو اپنی ہچکچاہٹ اور گریز پہ تاؤ آیا۔ اب وہ مزید دیر نہیں کرنا چاہتا تھا، جیسا وہاں موجود لوگوں کی
پردہ کئے بغیر آگے بڑھا اور ایمان کے نزدیک آکر بہت استحقاق بھرے انداز میں اپنا ہاتھ اس کی کمر کے گرد
حماں کرتے ہوئے خود اسے سہارا دیتے ہوئے بولا تھا۔
”چلو.....! میں تمہیں اندر لے کر چلتا ہوں۔“

ایمان کے اعصاب کو گویا ہزار روٹیج کا کرٹ لگا تھا۔ کچھ کہے بغیر بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس
نے بہت درشتگی سے اس کا بازو جھکا اور ماما کا ہاتھ پکڑ کر اندرونی حصے کی جانب چلی گئی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ
کسی نے یہ سارا کھیل دیکھا نہ ہو، البتہ الگ بات کہ کسی نے دیکھ کر نظر انداز کر دیا تو کوئی اگلے ہی لمحے وہاں
سے رفو چکر ہو گیا، جیسے عاقب۔

”کیوں پتر جی.....! ہو گئی آپ کی تشفی.....! چلو چلو.....! اب کر لو جو کرنا ہے۔“

تاؤ جی کے الفاظ نے ولید حسن کو جتنی کھسیاہٹ میں مبتلا کیا، وہ الگ تھا، جو تاؤ دلایا، اس کی تو بات
ہی کیا.....؟

اسے ہمیشہ سے یہ احساس تھا کہ تاؤ جی اس کے باپ ہو کر بھی ایمان کو سر پر چڑھائے ہوتے ہیں۔ اس تمسخر اڑاتے فقرے پہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، جیسی پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

”بھائی صاحب.....! وہ برا بھی مان سکتا ہے، آپ کو اس طرح نہیں کہنا چاہئے تھا۔“

پاپا نے بڑے بھائی کو ٹوکا تو انہوں نے یوں ہاتھ ہلایا گویا کبھی اڑائی ہو۔

☆☆☆

”مسلل روکتی ہوں اس کو ہمدل میں آنے سے مگر وہ کوہ کن زکوتا نہیں دیوار ڈھانے سے بھلا کیا ڈکھ کے آنگن میں سلکتی لڑکیاں جاتیں کہاں چھپتے ہیں آنسو آنچلوں میں منہ چھپانے سے۔ تجھے تنہا محبت کا یہ دریا پار کرنا ہے ندامت ہوگی اس کے حوصلوں کو آزمانے سے ابھی تو عشق میں آنکھیں بھی ہیں دل سلامت ہے زمین بانجھ ہوتی ہے کبھی فصلیں جلانے سے تجھے بھی ضبط غم کے شوق نے پھر بنا ڈالا تجھے اے دل بہت روکا تھا رسم و راہ نبھانے سے“

وہ بیڈ پر لیٹی تھی، پہلو سے ذرا سہا امید حسن چٹا ہوا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں اس وقت تقریباً گھر کے سبھی افراد سائے ہوئے تھے۔ پریشانی ختم ہو گئی تھی۔ اب سب ہی تقریباً ایک دوسرے سے مچو گفتگو تھے۔ مگر اس کا دل و دماغ جیسے غیر حاضر سا تھا۔

ولید حسن کا بدلا بدلا سایہ روپ، چہرے کی پریشانی، آنکھوں کی ندامت اس کا وہم نہیں تھی۔ عاقب سے اس کا الجھنا، پھر اس کی سمت بڑھ کر اپنا استحقاق جتنا بہت معانی رکھتا تھا۔ اس کی کمر کے گرد جیسے اس کا لمس ابھی تک اپنا احساس بخش رہا تھا۔ وہ جیسے بیٹھے بیٹھے گم ہونے لگی۔

”کیوں کر رہے ہیں وہ ایسا.....؟ کیا کوئی نیاز غم لگانے کے لئے.....؟“

اس کا دل نئے سرے سے بھرانے لگا۔ اس کا کسی بات پر زور سے ہنسی تھی، وہ جیسے چونک کر متوجہ ہوئی اور خالی خالی نظروں سے سب کو تکتے لگی۔

”چلو بھئی.....! اٹھو سب، بچی کو آرام کرنے دو، دوا لی ہے اس نے۔“

تائی ماں نے اٹھ کر سب کو ایک ساتھ مخاطب کیا تو پاپا نے بھی ان کی تائید کی تھی۔ پاپا اور تاؤ جی نے ایمان کا سر تھکا اور اپنا خیال رکھنے کی تاکید کے ساتھ باہر نکل گئے۔ ماما کی نماز بھی قضا ہو چکی تھی۔ وہ بھی چلی گئیں۔ البتہ تائی ماں نے پہلے فضلہ کو تاکید کی تھی کہ یاد سے ایمان کو دودھ کا گلاس دے دے، پھر ان سب کو ایک بار پھر وہاں سے جانے کا کہتیں خود بھی کمرے سے نکل گئیں تو ایمان نے اپنی پشت پہ لگے تکیے کو ہٹایا اور نیم دراز ہو گئی۔ امید کو نرمی و محبت سے سر کا کر خود سے کچھ اور نزدیک کر لیا۔

”ایمی.....! دودھ میں اوٹھیں ڈال کر لاؤں یا مالکو.....؟ بتا دو.....!“

فضلہ کے استفسار پر اس سے پہلے اشعر نے شریر سے انداز میں لقمہ دیا تھا۔

”نہ اوٹھیں نہ مالکو، انہیں دیسی گھی ڈال کر گرم دودھ پلا دیں۔“

ایمان کا فوری منہ بن گیا۔ فضلہ ہنسنے لگی۔

”بے فکر رہو.....! میں دودھ میں گھی نہیں ڈالوں گی۔“

اس کی تسلی پر ایمان قدرے مطمئن ہوئی، مگر یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا کہ اسی پل دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے والے ولید حسن کو دیکھ کر اس کے چہرے پر تاریک سا سایہ لرز اٹھا تھا۔ دھڑکنوں میں غیر معمولی ہلچل مچی اٹھی۔

”آہا.....! آئیے جناب.....! کہئے.....! کیسے تشریف لائے.....؟“

اشعر اسے دیکھتے ہی چپک اٹھا۔ ولید حسن جو ایمان کی سمت متوجہ تھا، ہمنوؤں کو اچکا کر دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ ایمان نے فی الفور نگاہ پھیر لی۔ کسی انجان سی بے چینی کا اضطراب رگ و پے میں بکھرنے لگا۔

”اسی سلسلے میں جس سلسلے میں آپ تشریف فرما ہیں۔“

”مگر ہم تو ان کے اپنے ہیں۔“

اشعر نے معنی خیز مسکراہٹ سمیت اپنے تئیں اسے لا جواب کرنا چاہا، مگر وہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا، ترقی بہ ترقی بولا۔

”اور ہم آپ سے بھی زیادہ اپنے ہیں، نہیں یقین تو پوچھوان سے.....؟“

اس نے گمبیر، ذومعنی جواب دیتے ہوئے باقاعدہ ایمان کی سمت اشارہ کیا جو حق دق بیٹھی تھی۔ وہ اشعر کے شوخ قہقہے اور ولید کی نگاہوں کی حرارت پر ایک دم نرم ہو گئی۔

”جی میم.....! اب آپ ہی فیصلہ کیجئے.....!“

اس نے ولید حسن کے براہ راست مخاطب کر لینے پر شپٹا کر نظریں جھکا لیں۔

”یہ کیا مذاق ہے اشعر.....؟“

اس نے کسی قدر ناراضگی سے اشعر کو مخاطب کیا جو سر کھجا رہا تھا۔

”اور کہیں چوٹ تو نہیں لگی.....؟ میں آپ کے سر کا زخم دیکھ سکتا ہوں.....؟“

ولید حسن کرسی بیڈ کے نزدیک کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تو اس سے پہلے کہ ایمان کوئی جواب دیتی، اشعر گلا کھکا کر بولا تھا۔

”میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہئے۔“

لہجے و انداز سے شوخ قسم کی شرارت کے ساتھ بے پایاں اطمینان ٹپک رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی حالت اور کیفیت عاقب، فضلہ اور اسما کی بھی تھی۔ ایمان اس دھاندلی پر بے طرح گھبرائی۔

”ہرگز نہیں.....! آپ لوگ کہیں نہیں جاؤ گے، بلکہ ان سے کہیں، تشریف لے جائیں، مجھے ان سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔“

بنا کسی مروت و لحاظ کے اس نے کسی قدر کڑوے انداز میں کہا تو ولید حسن اٹھ کھڑا ہوا، آگے بڑھا، دروازہ کھولا اور ان سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

”انہیں میں بخوشی سنبھال لوں گا، بہت بہت شکریہ.....!“

”خیال سے، دھیان سے، پیار سے.....!“

اشعر نے ہانک لگائی اور دانت نکالتے ہوئے بھاگ گیا۔ ان کے جانے کے بعد ولید حسن اس کی جانب دروازہ بند کر کے پلٹا تو اسے ہراساں و متوحش دیکھ کر دل آویزی سے مسکرایا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے.....؟ کیا بہت خوف ناک لگ رہا ہوں.....؟“

”آپ یہاں سے فی الفور چلے جائیں ورنہ میں تاؤ جی کو بلالوں گی۔“

ایمان نے تنک کر کہا تو ولید نے کاندھے اچکا دیئے۔

”ہاں تو بلالو.....! میں ڈرتا تھوڑی ہوں ان سے.....؟“

”آپ اس طرح آخر گھسے کیوں ہیں میرے کمرے میں.....؟ مقصد کیا ہے آپ کا.....؟“

وہ چیخ کر بولی تو جواباً ولید حسن کی آنکھیں شرارت سے لودینے لگیں۔

”جب کوئی جوان لڑکا اس طرح رات کے وقت کسی جوان، خوب صورت لڑکی کے کمرے میں زبردستی

گھس آئے تو اس کے ارادے بہت خطرناک ہوا کرتے ہیں، یونو.....!“

وہ بھاری گھبیر لہجے میں کہتا آہستہ آہستہ چلتا اس کے بالکل نزدیک آگیا۔ ایمان کی دھڑکنوں میں

سرکش سے بھنور اٹھنے لگے۔ وہ کسی قدر برہمی سے چیخ پڑی تھی۔

”مجھے آپ کا یہ مذاق بالکل پسند نہیں آیا، سمجھے آپ.....؟“

”اوکے.....! نیور مائنڈ.....! سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔“

اس نے اپنے لہکتے لہجے پر تو قابو پا لیا، مگر نگاہوں کا بہکا پن ہنوز تھا۔ ایمان نے ہونٹ بھیج لئے۔

ولید نے گہرا سانس کھینچا اور خود کو کمپوز کر کے بولا تو واقعی سنجیدہ ہو چکا تھا۔

”چوٹ کیسے لگی تھی تمہیں.....؟“

”گر گئی تھی، پتا چل تو گیا ہے آپ کو.....؟“

وہ جھنجھلا گئی۔

”خود گری تھی ناں.....؟“

ایمان نے اب کی مرتبہ ٹھٹھک کر اسے دیکھا، جس میں ناگواری و ناپسندیدگی کا عنصر تھا۔

”مطلب کیا ہے آپ کا.....؟“

ترچھا، کاٹ دار انداز۔ ولید حسن نے اس کا ہاتھ آہستگی و نرمی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

”میں خوف زدہ ہو گیا تھا، یہ سوچ کر کہ تم نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔“

”میں ایسی حماقت کیوں کرنی لوگوں کی فضول باتوں کے وجہ سے.....؟“

اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔ ولید حسن کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا۔

”مجھے پتا تھا، ہمارے بیچ یہ فاصلے در آئے ہوں گے۔“

وہ ایک دم لول ہونے لگا۔ ایمان نے چونک کر اسے دیکھا۔ ولید حسن نے جھک کر اس کے ہاتھ کو

چوم لیا تھا۔ ایمان بے ساختہ کسمائی اور اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا، مگر گرفت بہت مضبوط تھی۔

”مجھے معاف کرو گی ایی.....؟“

ایمان کے اعصاب کو دھچکا لگا تھا۔ اس نے خیر و استعجاب میں گھر کر اسے دیکھا۔

”حیران ہونا.....! اس کا پلٹ پیہ.....؟ مجھے سوئی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

وہ چونکی، پھر اس کی آنکھوں میں نمی بھر گئی۔

”اگر وہ نہ بتاتا تو آپ ساری زندگی مجھے یہ سزا دیتے.....؟“

وہ سب کچھ بھول کر شاکی ہو گئی۔ ولید نے اس کی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو دیکھا اور بے چین و

بے قرار ہو کر اس کے نزدیک آیا اور اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

”آخری بار معاف کر دو ایی.....! پلیز.....! پھر کبھی تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا، نہ کبھی بدگمانی

آئے گی ہمارے بیچ اور نہ ہی کبھی آنا۔ بلیوی.....!“

پھر ذرا توقف کیا اور کسی قدر شاکی ہو کر بولا تھا۔

”ویسے اگر تم نے مجھ پہ اعتماد کیا ہوتا تو ہمارے بیچ یہ نارسائی اور ہجر و فراق کے موسم نہ آئے

ہوتے۔“

”میں ڈر گئی تھی، بہت ڈر گئی تھی ولید.....! مجھے لگا تھا وہ.....“

”کچھ نہیں کر سکتا تھا وہ گھٹیا آدمی.....!“

ولید حسن جھک کر اس کی پلکوں سے گالوں پر بکھرتے آنسوؤں پر ہونٹ رکھ چکا تھا اور ایمان کو لگا تھا،

تمام ڈکھوں کا مداوا اسی ایک گھڑی میں ہو گیا تھا۔

”ایی.....! تم نے مجھے معاف کر دیا ناں.....؟“

وہ اس کی جانب منتظر نگاہوں سے تکتے لگا۔

”کیا کہوں سوائے اس کے کہ

بہت دیر کر دی مہرباں آتے آتے.....!“

وہ بہت ضبط، حوصلے سمیت بھیگی آنکھوں سے مسکرائی تو ولید حسن اس ضبط و حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کے

مظاہرے پر دل کو کچھ اور بھی گداز ہوتا محسوس کرنے لگا تھا۔

”میں تمہارا مجرم ہوں ایمان.....! مجھے اعتراف میں عار نہیں ہے کہ یہ میرے مزاج کی شدت اور انتہا

پسندی ہی تھی جس نے تم سے وحشت اور ڈکھ کے اتنے صحرا پار کرائے ہیں۔ تم نے محبت میں ایثار اور قربانی دے

کر ثابت کیا کہ محبت کو کیسے نبھایا جاتا ہے۔

مجھے معاف کر دو ایمان.....! اس عہد کے ساتھ کہ میں آئندہ کبھی انشاء اللہ تمہیں دانستہ نہیں ستاؤں گا،

بلکہ اگر میں کبھی غلطی پر ہوں تو میری غلطی بتانا، اور اصلاح کرنا بھی تمہارا فرض ہے۔“

آخر میں اس کا لہجہ کچھ شرارتی ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔ اس مسکان میں فتح مندی تھی، سرشاری تھی۔ وہ اپنے رب کی مشکور تھی جس نے اسے یہ سرخ روئی عطا فرمائی تھی۔

اسے پتا تھا صبح فطرہ نے اس سے تفصیلات پوچھنی ہیں، تو اس کے اتنی آسانی سے مان جانے پر اسے گھورنا ہے۔ مگر اسے جواب پتا ہے کہ کیا دینا ہے.....؟

”محبت میں انا نہیں ہوتی اور جہاں انا ہو، وہاں محبت نہیں ہوتی۔“

پھر ایمان کی خالص اور شدید محبت میں تو انا کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ پھر بھلا وہ جان سے پیارے محبوب کی پذیرائی کرنے کی بجائے کیسے جھٹک دیتی.....؟

ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔